اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات و تحریرات)

جلد نمبر ۹

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن و سنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین و دنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

جلد ۹

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین و دنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۹

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

مرتب

مولانا محمد اویس سرور صاحب

اِدارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۹۰ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
فون [illegible] فیکس [illegible] فون [illegible] فون [illegible]

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد ۹

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات

پبلشرز ۔ بک سیلرز ۔ ایکسپورٹرز

۱۹۰۔ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۲۸۵+

۱۹۰ - انارکلی، لاہور - پاکستان ___ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی - پاکستان ___ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

توبہ: گناہوں کا تریاق ۵۴

عہد اور وعدہ کی اہمیت ۱۷۲

"قناعت" اختیار کرو ۲۶۸

چار عظیم صفات ۲۸۰

اچھے اخلاق اور ان کا مفہوم ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴾(۱)

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! سورۃ المومنون کی ان ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فلاح یافتہ ہیں، ان صفات میں سے جس صفت کا بیان چل رہا ہے وہ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾

جیسے پہلے عرض کیا تھا کہ اس آیت کی دو تفسیریں ہیں، پہلی تفسیر کے مطابق اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں، جو زکوۃ ادا کرنے والے ہیں اور دوسری تفسیر کے مطابق اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں، اپنے آپ کو پاک صاف

☆　اصلاحی خطبات (۱۵/۸۲تا۹۸)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱)　المؤمنون: ۱۔۶، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ’’ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔ جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو زکوۃ پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابل ملامت نہیں ہیں‘‘

کرنے والے ہیں، اپنے اخلاق کو گندگیوں اور ناپاکیوں سے محفوظ رکھنے والے ہیں اور اچھے اخلاق کو اختیار کرنے والے ہیں۔

''دِل'' کی کیفیات کا نام ''اخلاق'' ہے

اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ آج کل عرفِ عام میں ''اخلاق'' کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی دوسرے سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے، مسکرا کر اس سے مل لے اور نرمی سے بات کر لے، ہمدردی کے الفاظ اس سے کہے، بس اسی کو ''اخلاق'' سمجھا جاتا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ شریعت کی نظر میں ''اخلاق'' کا مفہوم بہت وسیع اور عام ہے، اس مفہوم میں بیشک یہ باتیں بھی داخل ہیں کہ جب انسان دوسرے سے ملے تو خندہ پیشانی سے ملے، اظہارِ محبت کرے اور اس کے چہرے پر ملاقات کے وقت بشاشت ہو، نرمی کے ساتھ گفتگو کرے، لیکن ''اخلاق'' صرف اس طرزِ عمل میں منحصر نہیں بلکہ ''اخلاق'' درحقیقت دل کی کیفیات کا نام ہے، دل میں جو جذبات اُٹھتے ہیں اور جو خواہشات دل میں پیدا ہوتی ہیں، ان کا نام ''اخلاق'' ہے۔ پھر اچھے اخلاق کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے جذبات میں اچھی اور خوشگوار باتیں پیدا ہوتی ہوں اور برے اخلاق کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں خراب جذبات اور غلط خواہشات پیدا ہوتی ہوں۔ لہٰذا شریعت کا ایک بہت اہم حصہ یہ ہے کہ انسان اپنے اخلاق کی اصلاح کرے اور دل میں پرورش پانے والے جذبات کو اعتدال پر لائے۔

فطری جذبات کو اعتدال پر رکھیں

اس کی تھوڑی سی تشریح یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں کچھ فطری جذبے رکھے ہیں، وہ اس کی فطرت کا حصہ ہیں، کوئی انسان ان سے خالی نہیں، مثلاً ''غصہ'' ہے جو ہر انسان کے اندر ہوتا ہے، کسی میں کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ، لیکن ہوتا ضرور ہے، یا مثلاً شہوت اور جنسی خواہش ہے جو ہر انسان کے اندر ہوتی ہے، کسی میں کم کسی میں زیادہ، یا مثلاً اپنی عزتِ نفس کا خیال کہ میں ذلیل نہ ہو جاؤں، بلکہ مجھے عزت حاصل ہو جائے، یہ جذبہ ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے، یہ سب فطری جذبات ہیں جو انسان کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں، لیکن ان جذبات کو اعتدال پر رکھنا ضروری ہے اور ان کو اعتدال پر رکھنے کا نام ہی ''حسنِ اخلاق'' ہے۔ اگر یہ اعتدال کے اندر ہیں تو بڑی اچھی بات ہے اور آدمی کے اخلاق پاکیزہ ہیں اور درست ہیں اور قابلِ تعریف ہیں، لیکن اگر اخلاق اعتدال سے گھٹے ہوئے ہیں یا اعتدال سے بڑھے ہوئے ہیں تو دونوں صورتوں میں انسان کے اخلاق خراب ہیں اور ان کے اصلاح کی ضرورت ہے۔

''غصہ'' فطری جذبہ ہے

مثلاً ''غصہ'' ایک فطری جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں پیدا فرمایا ہے، یہ غصہ ضروری بھی ہے، کیونکہ اگر انسان کے اندر ''غصہ'' بالکل نہ ہو تو انسان اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا، مثلاً ایک شخص پر دوسرا شخص حملہ آور ہے اور اس کے اُوپر ناجائز حملہ کررہا ہے مگر وہ شخص خاموش بیٹھا ہے، اس کو غصہ ہی نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ''غصہ'' اعتدال پر نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اس کے باپ پر یا اس کے بھائی پر یا اس کی بیوی پر حمہ کررہا ہے اور یہ شخص خاموش بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے اور اس کو غصہ ہی نہیں آرہا ہے تو یہ بے غیرتی ہے، بے حمیتی ہے، اور شریعت میں اس بے غیرتی اور بے حمیتی کا کوئی جواز نہیں۔

یہ بے غیرتی کی بات ہے

آج عراق میں ہمارے بھائیوں پر وحشت اور بربریت والا حملہ ہو رہا ہے اور کتنے مسلمان ایسے ہیں جو نہ صرف یہ کہ خاموش ہیں اور ان کو غصہ نہیں آرہا ہے، بلکہ ان کے ساتھ تعاون بھی کررہے ہیں، ان کو اپنی فضائی حدود اور زمینی حدود فراہم کررہے ہیں اور غیر مسلموں کے ہیڈ کوارٹر ان کے ملک میں قائم ہیں، یہ بے غیرتی اور بے حمیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غصے کا جو جذبہ اللہ تعالیٰ نے رکھا تھا، وہ صحیح جگہ پر استعمال نہیں ہو رہا ہے، کیونکہ یہ غصہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے رکھا ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اپنا دفاع کرے، اپنے عزیز و اقارب اور گھر والوں کا دفاع کرے، اپنے دین کا دفاع کرے، اپنے ہم مذہب لوگوں کا دفاع کرے اور پوری انسانیت پر ہونے والے ظلم کا دفاع کرے، اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ غصہ رکھا ہے۔

غصہ کو صحیح جگہ پر استعمال کریں

چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾(۱)

یعنی جو کفار تمہارے قریب ہیں، ان سے لڑائی کرو اور ان کفار کو یہ محسوس ہونا چاہئے کہ ان کے خلاف تمہارے دلوں میں غصہ ہے اور سختی ہے۔ لہٰذا اگر یہ غصہ صحیح جگہ پر ہے تو یہ غصہ قابل تعریف

---

(۱) التوبۃ: ۱۲۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ان کافروں سے لڑو جو تم سے قریب ہیں اور ہونا یہ چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں''

ہے اور اچھے اخلاق کی نشانی ہے، مثلاً اگر گھر پر ڈاکو حملہ آور ہو گئے اور میرے پاس اتنی طاقت بھی ہے کہ میں ان پر حملہ کر سکوں لیکن میں خاموش بیٹھا ہوں اور ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا اور مجھے غصہ ہی نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بے غیرت ہوں، شریعت کو یہ مطلوب نہیں، لہٰذا اگر انسان غصہ کو صحیح حدود میں استعمال کرے اور صحیح جگہ پر استعمال کرے تو یہ غصہ اچھے اخلاق کی نشانی ہے۔

''غصہ'' حد کے اندر رہنا چاہئے

میں نے دو لفظ استعمال کیے، ایک یہ کہ غصہ کو صحیح جگہ پر استعمال کرے اور غلط جگہ پر استعمال نہ کرے، یعنی جہاں غصہ کرنا چاہئے وہیں پر غصہ کرے۔ دوسرے یہ کہ غصہ کو حدود میں استعمال کرے، یعنی جتنا غصہ کرنا چاہئے اتنا ہی کرے، اس سے زیادہ نہ کرے، مثلاً آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی اولاد غلط راستے پر جا رہی ہے، گناہوں کا ارتکاب کر رہی ہے، اس کے اعمال خراب ہو رہے ہیں، آپ نے اس کو دو تین بار سمجھایا اور نصیحت کی، اس نے آپ کی نصیحت نہیں مانی تو اس موقع پر غصہ کا آنا صحیح محل صحیح جگہ پر ہے، غلط جگہ پر نہیں ہے، کیونکہ واقعۃً وہ غصہ کی بات تھی، لیکن جب اپنی اولاد پر غصہ کا اظہار کرنے پر آئے تو غصہ کا اتنا اظہار کیا کہ بچے کی چمڑی اُدھیڑ دی، اس صورت میں غصے کا محل تو صحیح تھا لیکن وہ غصہ حد کے اندر نہیں تھا بلکہ حد سے تجاوز کر کے آگے بڑھ گیا اور اعتدال سے نکل گیا تو یہ غصہ قابلِ تعریف نہیں، یہ اچھے اخلاق میں داخل نہیں۔

''غصہ'' کی حدود

لہٰذا غصہ کے اندر دو باتیں ہونی چاہئیں، ایک یہ کہ غصہ صحیح جگہ پر آئے اور غلط جگہ پر نہ آئے اور دوسرے یہ کہ جب غصہ کا اظہار ہو تو وہ غصہ حد کے اندر ہو، نہ حد سے کم ہو اور نہ حد سے بڑھا ہوا ہو۔ اس غصے کی حدود بھی شریعت نے متعین کر دی ہیں، ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کی تعلیم دو تا کہ بچپن سے اس کو نماز کی عادت پڑ جائے، سات سال کی عمر میں مارنے کا حکم نہیں ہے، اور جب بچہ دس سال کا ہو جائے اور اس وقت تک اس کو نماز پڑھنے کی عادت نہ پڑی ہو تو اب اس کو نماز پڑھانے کے لئے مارنے کی بھی اجازت ہے،[1] یہ حد مقرر کر دی، لیکن یہ فرما دیا کہ چہرے پر مت مارو، چہرے پر مارنا جائز نہیں اور ایسی مار نہ مارو جس سے جسم پر نشان پڑ جائے۔ یہ حدود حضورِ اقدس ﷺ نے احادیث میں بیان فرما دیں، آپ ﷺ نے ایک ایک چیز کھول کھول کر سمجھا کر واضح کر دی، یہ تو ایک مثال ہے۔

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، متى يؤمر الغلام بالصلاة، رقم: ٤١٨

''عزتِ نفس'' کا جذبہ فطری ہے

ایک اور مثال لے لیجئے۔ مثلاً دل میں عزتِ نفس کا داعیہ پیدا ہونا کہ میں لوگوں کے سامنے ذلیل نہ ہوں اور بحیثیت انسان اور بحیثیت مسلمان کے میری عزت ہونی چاہئے۔ اس حد تک یہ جذبہ قابلِ تعریف ہے، یہ جذبہ برا نہیں ہے، کیونکہ شریعت نے ہمیں اپنے آپ کو ذلیل کرنے سے منع فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں عزتِ نفس کا جذبہ بالکل نہ ہو تو وہ انسان دوسروں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جائے، جو چاہے وہ اس کو ذلیل کر جائے۔ لیکن اگر ''عزتِ نفس'' کا جذبہ حد سے بڑھ جائے اور دل میں یہ خیال آئے کہ میں سب سے بڑا ہوں، میں عزت والا ہوں اور باقی سب لوگ ذلیل ہیں اور حقیر ہیں تو اب یہ دل میں ''تکبر'' آ گیا، اس لئے کہ ''تکبر'' کے معنی ہیں ''اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنا''

''عزتِ نفس'' یا ''تکبر''

آپ کو بیشک یہ حق حاصل ہے کہ آپ یہ چاہیں کہ میں دوسروں کی نظر میں بے عزت نہ ہوں، لیکن کسی بھی دوسرے شخص سے اپنے آپ کو افضل سمجھنا کہ میں اس سے اعلیٰ ہوں اور یہ مجھ سے کمتر ہے، یہ خیال لانا جائز نہیں، مثلاً آپ امیر ہیں، آپ کے پاس کوٹھی بنگلے ہیں، آپ کے پاس بینک بیلنس ہے، آپ کے پاس دولت ہے اور دوسرا شخص غریب ہے، ٹھیلے پر سامان بیچ کر اپنا پیٹ پالتا ہے، اپنے گھر والوں کے لئے روزی کماتا ہے، اگر آپ کے دل میں یہ خیال آ گیا کہ میں بڑا ہوں اور یہ چھوٹا ہے، میری عزت اس کی عزت سے زیادہ ہے، میں اس سے افضل ہوں اور یہ مجھ سے کمتر ہے، اس کا نام ''تکبر'' ہے، یہ ''عزتِ نفس'' کا جذبہ اپنی حد سے آگے بڑھ گیا۔

''تکبر'' مبغوض ترین جذبہ ہے

اب یہ ''جذبہ'' اتنا خبیث بن گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ''تکبر'' سے زیادہ کسی جذبے سے نفرت نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین جذبہ انسان کے اندر ''تکبر'' ہے، حالانکہ ''عزتِ نفس'' قابلِ تعریف چیز تھی لیکن جب وہ حد سے بڑھ گئی تو اس کے نتیجے میں وہ ''تکبر'' بن گئی اور تکبر بننے کے نتیجے میں وہ مبغوض بن گئی۔ اللہ تعالیٰ حدیث قدسی میں ارشاد فرماتے ہیں:

((اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ)) ''بڑائی تو تنہا میرا حق ہے''(۱)

(۱) سنن أبي داؤد، کتاب اللباس، باب ما جاء في الکبر، رقم: ۳۵۶۷، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب البراءة من الکبر والتواضع، رقم: ٤١٦٤، مسند أحمد، رقم: ۷۰۷۸

''اللہ اکبر'' کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے:

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾(۱)

''اسی کے لئے ہے بڑائی آسمانوں میں بھی اور زمینوں میں بھی''

لہٰذا جو بندہ یہ کہتا ہے کہ میں دوسروں سے بڑا ہوں، میرا درجہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور میں افضل ہوں اور دوسرے سب لوگ مجھ سے چھوٹے ہیں اور حقیر ہیں تو یہ ''تکبر'' کی حد ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے، اس کا انجام دنیا میں بھی برا ہے اور آخرت میں بھی برا ہے۔

''متکبر'' کو سب لوگ حقیر سمجھتے ہیں

دنیا کے اندر تو یہ صورت ہوتی ہے کہ ''متکبر'' اپنے آپ کو بڑا سمجھتا رہتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھتا رہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ساری مخلوق اس کو برا سمجھتی ہے، اس لئے کہ جو شخص متکبر ہو اور لوگوں کو معلوم بھی ہو کہ یہ شخص متکبر ہے اور اس کے اندر تکبر ہے تو کوئی بھی شخص اس سے محبت نہیں کرے گا بلکہ ہر شخص اس کو برا سمجھے گا۔ ایک عربی کہاوت ہے جو بڑی خوبصورت ہے، اس کہاوت میں ''متکبر'' کی مثال دی ہے، فرمایا کہ ''متکبر'' کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو، وہ جب اُوپر سے لوگوں کو دیکھتا ہے تو سب لوگ اس کو چھوٹے نظر آتے ہیں، اس لئے وہ ان سب کو چھوٹا سمجھتا ہے، اور ساری مخلوق جب اس کو دیکھتی ہے تو وہ چھوٹا نظر آتا ہے، اس لئے وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ بہر حال! دنیا کے اندر صورت یہ ہوتی ہے کہ ساری مخلوق ''متکبر'' کو برا سمجھتی ہے، اور چھوٹا سمجھتی ہے چاہے اس کے دبدبہ اور اس کی طاقت کی وجہ سے مخلوق اس کے سامنے بات نہ کر سکے، لیکن کسی کے دل میں اس کی عزت اور محبت نہیں ہوتی۔

''امریکہ'' انتہائی تکبر کا مظاہرہ کر رہا ہے

آج ''امریکہ'' تکبر میں نمرود اور فرعون کے درجے تک بلکہ اس سے بھی آگے پہنچ چکا ہے، لوگوں کی زبانیں تو بعض اوقات اس کے سامنے اس کے ڈر کی وجہ سے نہیں کھلتیں لیکن اس کی نفرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، مسلمان اور غیر مسلم اور خود اس کے وطن کے رہنے والے اس سے نفرت کر رہے ہیں۔ اس لئے دنیا کے اندر ''متکبر'' کو نفرت ملتی ہے، عزت نہیں ملتی اور آخرت میں متکبر کے لئے بڑا سخت عذاب ہے۔

---

(۱) الجاثیۃ: ۳۷

''تکبر'' دوسری بیماریوں کی جڑ ہے

اور یہ ''تکبر'' ایسی بیماری ہے جس سے بیشمار بیماریاں جنم لیتی ہیں، اسی ''تکبر'' کے نتیجے میں ''حسد'' پیدا ہوتا ہے، اسی سے ''بغض'' پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ فلاح ان کو نصیب ہوتی ہے جو اپنے اخلاق کو ان تمام بیماریوں سے پاک کریں، ان کو جب غصہ آئے تو صحیح جگہ پر آئے اور جب غصہ کو استعمال کریں تو حدود کے اندر استعمال کریں، وہ اگر اپنی عزت کا تحفظ کریں تو حدود کے اندر کریں، تکبر نہ کریں اور جو کام کریں اخلاص کے ساتھ کریں، کسی کام میں دکھاوا اور نام و نمود نہ ہو، اسی کا نام ''اخلاق کی صفائی'' اور ''اخلاق کا تزکیہ'' ہے، جس کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾(۱)

جس کے بارے میں فرمایا کہ حضورِ اقدس ﷺ اس دنیا میں اس لئے تشریف لائے کہ لوگوں کے اخلاق کو پاک صاف کریں۔

''اخلاق'' کو پاک کرنے کا طریقہ ''نیک صحبت''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اخلاق کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ خوب سمجھ لیجئے کہ ان اخلاق کو پاک کرنے کا طریقہ وہی ہے جو جناب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اختیار فرمایا، وہ ہے ''نیک صحبت''، اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کی صحبت کے نتیجے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق کو معتدل بنا دیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے آپ کو حضورِ اقدس ﷺ کے حوالے کر دیا، اس طرح کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنے آپ کو اصلاح کے لئے پیش کیا اور یہ تہیہ کر لیا کہ جو کچھ آپ ﷺ سے سنیں گے اور جو کچھ آپ ﷺ کو کرتا ہوا دیکھیں گے، اپنی زندگی میں اس کی اتباع کریں گے اور آپ ﷺ کی ہر بات مانیں گے۔ اب حضورِ اقدس ﷺ ایک ایک صحابی کو دیکھ رہے ہیں، تمام صحابہ آپ ﷺ کے سامنے ہیں، ان کے حالات آپ ﷺ کے سامنے ہیں، بعض اوقات خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے حالات آپ کے سامنے آکر بیان کرتے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے دل میں اس کام کا خیال پیدا ہوا، میرے دل میں اس کام کا جذبہ پیدا ہوا، اس کے جواب میں آپ ﷺ فرماتے کہ تم فلاں کام اس حد تک کر سکتے ہو، اس سے آگے نہیں کر سکتے، چنانچہ رفتہ رفتہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی تعلیم اور تربیت کے نتیجے میں یہ ہوا کہ وہ اخلاق جو سرکارِ دو عالم جناب رسول اللہ ﷺ لے کر تشریف لائے تھے، وہ اخلاق ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں منتقل ہو گئے۔

---

(۱) المؤمنون: ٤، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جو زکوۃ پر عمل کرنے والے ہیں''

زمانۂ جاہلیت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا غصہ

زمانۂ جاہلیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قوم ایسی قوم تھی جس کا غصہ حد سے گزرا ہوا تھا، ذرا سی بات سے آپس میں جنگ چھڑ جاتی اور بعض اوقات چالیس چالیس سال تک وہ جنگ جاری رہتی، لیکن جب وہ لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ایسے موم بن گئے کہ پھر جب ان کو غصہ آتا تو صحیح جگہ پر آتا اور حد کے اندر رہتا، جتنا غصہ آنا چاہئے اتنا ہی غصہ آتا، اس سے آگے نہیں آتا۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نام سن کر کانپ جاتے تھے کہ اگر ان کو غصہ آگیا تو ہماری خیر نہیں، اسی غصے کے عالم میں ایک مرتبہ اپنے گھر سے نکلے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور نیا دین لے کر آئے ہیں اور پرانے دین کو غلط قرار دیتے ہیں، لہٰذا میں ان کا سر قلم کروں گا۔ لمبا قصہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کے کان میں قرآن کریم کی آیات ڈال دیں اور ان آیاتِ قرآنی کو انقلاب کا ذریعہ بنادیا اور دل میں اسلام گھر کر گیا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی پوری جان نچھاور کردی۔[۱]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور غصہ میں اعتدال

پھر جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لے آئے اور آپ کی صحبت اُٹھالی تو وہ غصہ جو انتہاء سے گزرا ہوا تھا، اس غصے کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تربیت سے اور اپنے فیضِ صحبت سے ایسا معتدل کردیا کہ جب آپ خلیفہ اور امیر المؤمنین بن گئے تو ایک دن جب آپ جمعہ کے دن مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے، اس وقت آپ کے سامنے رعایا کا بہت بڑا مجمع تھا، اس مجمع میں آپ نے ایک سوال کیا تو جواب دینے کے لئے ایک دیہاتی کھڑا ہوگیا اور اس نے کہا کہ اے عمر! اگر تم ٹیڑھے چلو گے تو ہم اپنی تلوار سے تمہیں سیدھا کریں گے۔ یہ بات اس شخص سے کہی جارہی ہے جس کی آدھی دنیا پر حکومت ہے، کیونکہ زمین کا جتنا حصہ ان کے زیرِ حکومت تھا، آج اس زمین پر پچیس حکومتیں قائم ہیں، لیکن اس دیہاتی کے الفاظ پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو غصہ نہیں آیا بلکہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس وقت یہ فرمایا:

> ''اے اللہ! میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس اُمت میں ایسے لوگ پیدا کیے ہیں کہ اگر میں غلطی کروں تو مجھے سیدھا کردیں''[۲]

---

(۱) سیرة ابن هشام (۱/ ۳۴۳-۳۴۴)، أسد الغابة، تذكرة عمر بن الخطاب رضي الله عنه،

(۲) الرياض النضرة في مناقب العشرة (۱/ ۱۸۰)

بہر حال! حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا وہ غصہ جو زمانۂ جاہلیت میں ضرب المثل تھا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تربیت کے اثر سے وہ غصہ معتدل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کی حدود پر ٹھہر جانے والے

اور جب غصہ کا صحیح موقع آجاتا اور ظالم اور جابر حکمرانوں کے خلاف لڑائی اور جہاد کا وقت آتا تو قیصر و کسریٰ بڑی سے بڑی طاقتیں آپ کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتیں اور ان پر کپکپی طاری ہو جاتی، آپ نے ہی قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کو تاخت و تاراج کیا۔ تو جہاں غصہ نہیں آنا تھا وہاں نہیں آیا اور جہاں جس درجے میں غصہ آنا تھا، وہاں اسی درجے میں آیا، اس سے آگے نہ بڑھا۔ آپ ہی کے بارے میں کہا جاتا ہے:

"كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ حُدُوْدِ اللّٰهِ"

یعنی حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدوں کے آگے رک جانے والے تھے۔ یہ بات کہاں سے حاصل ہوئی؟ کیا کتابیں پڑھ کر اور فلسفہ پڑھ کر یہ بات حاصل ہوئی؟ نہیں بلکہ اس کے حصول کا ایک ہی طریقہ تھا، وہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اُٹھائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ کے تمام اخلاق کو مجلّٰی مزکّٰی اور مصفّٰی کر دیا۔

اللہ والوں کی صحبت اختیار کیجئے

پھر یہی طریقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے شاگردوں یعنی تابعین کے ساتھ اور تابعین نے اپنے شاگردوں کے ساتھ برتا، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (۱)

یعنی اگر اپنے اخلاق درست کرنا چاہتے ہو تو ان کی صحبت اختیار کرو جن کے اخلاق درست ہیں۔ لہٰذا اپنی صحبت درست کرو اور ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرو جو اللہ والے ہوں، جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو، آخرت کی فکر ہو، جن کے اخلاق مصفّٰی اور مجلّٰی ہو چکے ہوں۔ اب کیسے ان کی صحبت اختیار کی جائے؟ اس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ جمعہ کو عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) التوبة: ۱۱۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔"

تواضع
رفعت اور بلندی کا ذریعہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ))(۱)

اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تواضع کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ کا ایک ارشاد پڑھا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی سے نوازتے ہیں۔''

اس وقت اسی ارشاد کی تھوڑی سی تشریح کرنی ہے، جس میں تواضع کی اہمیت، اس کی حقیقت، اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ بیان کرنا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے صحیح بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تواضع کی اہمیت

جہاں تک تواضع کی ''اہمیت'' کا تعلق ہے، تو یہ تواضع اتنی اہم چیز ہے کہ اگر انسان کے اندر تواضع نہ ہو، تو یہی انسان فرعون اور نمرود بن جاتا ہے، اس لئے کہ جب دل میں تواضع کی صفت نہیں ہوگی، تو پھر تکبر ہوگا، دل میں اپنی بڑائی ہوگی، اور یہ تکبر اور بڑائی، تمام امراضِ باطنہ کی جڑ ہے۔

دیکھئے اس کائنات میں سب سے پہلی نافرمانی ابلیس نے کی، اس نے نافرمانی کا بیج بویا، اس سے پہلے نافرمانی کا کوئی تصور نہیں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور تمام فرشتوں کو ان کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، اور کہا:

☆ اصلاحی خطبات (۵/۲۶ تا ۴۰)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في التواضع، رقم: ۱۹۵۲، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب البرائة من الكبر والتواضع، رقم: ٤١٦٦، مسند أحمد، رقم: ۱۱۲۹۹

﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾(۱)

یعنی میں اس آدم سے اچھا ہوں، اس لئے کہ مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا ہے، اور اس کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا ہے، اور آگ مٹی سے افضل ہے، اس لئے میں اس سے افضل ہوں، میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟ یہ سب سے پہلی نافرمانی تھی، جو اس کائنات میں سرزد ہوئی، اس نافرمانی کی بنیاد تکبر اور بڑائی تھی کہ میں اس آدم سے افضل ہوں، یا اچھا ہوں، میں اس سے بہتر ہوں بس اس تکبر کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو راندۂ درگاہ کر دیا اس سے معلوم ہوا کہ ساری نافرمانیوں اور برائیوں کی جڑ "تکبر" ہے۔ جب دل میں تکبر ہوگا تو دوسری برائیاں بھی اس میں جمع ہوں گی۔

تکبر کی حقیقت

اس تکبر کی وجہ یہ ہوئی کہ شیطان نے اپنی عقل پر ناز کیا۔ اس نے سوچا کہ میں ایک ایسی عقلی دلیل پیش کر رہا ہوں، جس کا توڑ مشکل ہو، وہ یہ کہ اگر آگ اور مٹی کا تقابل کیا جائے تو آگ مٹی سے افضل ہے، اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے اپنی عقل چلائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارگاہِ خداوندی سے مطرود اور مردود ہوا اقبال مرحوم شعر میں بڑی حکیمانہ باتیں کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر میں انہوں نے اسی واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ کیا کہ۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول

اس لئے کہ جو عقل کا غلام بن گیا، اس نے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا تو انکار کر دیا، اور اس شیطان نے یہ نہیں سوچا کہ جب معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، اسی نے تجھے پیدا کیا، اور اس نے آدم کو پیدا کیا، وہ خالق کائنات بھی ہے، وہ یہ کہہ رہا ہے کہ تو آدم کو سجدہ کر، تو اب تیرا کام یہ تھا کہ تو اس کے حکم کے آگے سر جھکا دیتا، مگر تو نے اس کے حکم کی نافرمانی کی، اس لئے مردود ہوا۔

تمام گناہوں کی جڑ "تکبر"

بہرحال، تکبر سارے گناہوں کی جڑ ہے، تکبر سے غصہ پیدا ہوتا ہے، تکبر سے حسد پیدا ہوتا ہے، تکبر سے بغض پیدا ہوتا ہے، تکبر کی بنیاد پر دوسروں کی دل آزاری ہوتی ہے، تکبر سے دوسروں کی غیبت ہوتی ہے۔ جب تک دل میں تواضع نہ ہوگی، اس وقت تک ان برائیوں سے نجات نہ ہوگی۔ اس لئے ایک مؤمن کے لئے تواضع کو حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

(۱) ص: ۷۶

''تواضع'' کی حقیقت

''تواضع'' عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کے معنی ہیں ''اپنے آپ کو کم درجہ سمجھنا''، اپنے آپ کو کم درجہ والا کہنا تواضع نہیں، جیسا کہ آج کل لوگ تواضع اس کو سمجھتے ہیں کہ اپنے لئے تواضع اور انکساری کے الفاظ استعمال کرلیے، مثلاً اپنے آپ کو ''احقر'' کہہ دیا، ''ناچیز''، ''ناکارہ'' کہہ دیا۔یا ''خطاکار'' ''گناہ گار'' کہہ دیا، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کے استعمال کے ذریعہ تواضع حاصل ہوگئی، حالانکہ اپنے آپ کو کمتر کہنا تواضع نہیں، بلکہ کمتر سمجھنا تواضع ہے، مثلاً یہ سمجھے کہ میری کوئی حیثیت، کوئی حقیقت نہیں، اگر میں کوئی اچھا کام کررہا ہوں تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے، اس کی عنایت اور مہربانی ہے، اس میں میرا کوئی کمال نہیں یہ ہے تواضع کی حقیقت۔ جب یہ حقیقت حاصل ہوجائے تو اس کے بعد زبان سے چاہے اپنے آپ کو ''حقیر'' اور ''ناچیز''، ''ناکارہ'' کہو یا نہ کہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جو شخص تواضع کی اس حقیقت کو حاصل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلند مقام عطا فرماتے ہیں۔

بزرگوں کی تواضع کا عالم

جن بزرگوں کی باتیں سن اور پڑھ کر ہم لوگ دین سیکھتے ہیں، ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ لوگ اپنے آپ کو اتنا بے حقیقت سمجھتے ہیں جس کی حدوحساب نہیں، چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد میں نے اپنے بیشمار بزرگوں سے سنا، وہ فرماتے تھے:

> ''میری حالت یہ ہے کہ میں ہر مسلمان کو اپنے آپ سے فی الحال، اور ہر کافر کو احتمالاً اپنے آپ سے افضل سمجھتا ہوں، مسلمان کو تو اس لئے افضل سمجھتا ہوں کہ وہ مسلمان اور صاحب ایمان ہے، اور کافر کو اس وجہ سے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کبھی ایمان کی توفیق دیدے، اور یہ مجھ سے آگے بڑھ جائے''

ایک مرتبہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کے خلیفۂ خاص حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ جب میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جتنے لوگ مجلس میں بیٹھے ہیں، سب مجھ سے افضل ہیں، میں ہی سب سے زیادہ نکما اور ناکارہ ہوں۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سن کر فرمایا کہ میری بھی یہی حالت ہوتی ہے، پھر دونوں نے مشورہ کیا کہ ہم حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اپنی یہ حالت ذکر کرتے ہیں، معلوم نہیں کہ یہ حالت اچھی ہے یا بری ہے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنی حالت بیان کی کہ حضرت آپ کی مجلس میں ہم دونوں کی یہ حالت

ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ کچھ فکر کی بات نہیں۔ اس لئے کہ تم دونوں اپنی یہ حالت بیان کر رہے ہو۔ حالانکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب میں بھی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو میری بھی یہی حالت ہوتی ہے کہ اس مجلس میں سب سے زیادہ نکما اور ناکارہ میں ہی ہوں۔ یہ سب مجھ سے افضل ہیں۔

یہ ہے تواضع کی حقیقت، ارے جب تواضع کی یہ حقیقت غالب ہوتی ہے تو پھر انسان تو انسان، آدمی اپنے آپ کو جانوروں سے بھی کمتر سمجھنے لگتا ہے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع

ایک حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرتا تو آپ اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے، جب تک دوسرا شخص اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے، اور آپ اپنا چہرہ اس وقت تک نہیں پھیرتے تھے، جب تک ملاقات کرنے والا شخص خود اپنا چہرہ نہ پھیر لے۔ جب آپ مسلسل مجلس میں بیٹھتے تو اپنا گھٹنا بھی دوسروں سے آگے نہیں کرتے تھے۔ یعنی امتیازی شان سے نہیں بیٹھتے تھے۔(۱)

بعض روایات میں آتا ہے کہ شروع شروع میں جس طرح اور لوگ مجلس میں آکر بیٹھ جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ مل جل کر بیٹھ جاتے، نہ تو بیٹھنے میں کوئی امتیازی شان ہوتی تھی، اور نہ ہی چلنے میں، لیکن بعد میں یہ ہوا کہ جب کوئی اجنبی شخص مجلس میں آتا تو اس کو آپ کے پہچاننے میں تکلیف ہوتی، اس کو پتہ نہ چلتا کہ ان میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں؟ اور بعض اوقات جب مجمع زیادہ ہو جاتا، تو پیچھے والوں کو آپ کی زیارت کرنی مشکل ہوتی۔ اور سب لوگوں کی یہ خواہش ہوتی کہ ہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں۔ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! آپ اپنے لئے کوئی اُونچی جگہ بنوالیں اور اس پر بیٹھ کر بات کرلیا کریں، تاکہ آنے والوں کو پتہ بھی چل جائے، اور سب لوگ آپ کی زیارت بھی کرلیا کریں اور بات سننے میں بھی سہولت اور آسانی ہو۔ اس وقت آپ نے اجازت دے دی، اور آپ کے لئے ایک چوکی سی بنادی گئی، جس پر آپ تشریف فرما کر باتیں کیا کرتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عاجزانہ چال

اس سے معلوم ہوا کہ اصل یہ ہے کہ انسان اپنی کوئی امتیازی شان اور امتیازی مقام نہ بنائے،

(۱) شعب الإیمان للبیهقی، فصل فی لین الجانب وسلامة الصدر، رقم: ۸۱۳۲ (۲۷۳/۶)

بلکہ عام آدمیوں کی طرح رہے۔ عام لوگوں کی طرح چلے۔ البتہ جہاں ضرورت ہو وہاں اس ضرورت کے مطابق عمل کرنے کی گنجائش ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ کے چلنے کی یہ صفت بیان فرمائی گئی:

"مَا رُئِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْكُلُ مُتَّكِئًا قَطُّ، وَلَا يَطَأُ عَقِبَهُ رَجُلَانِ"(۱)

"کبھی حضورِ اقدس ﷺ کو ٹیک لگا کر کھاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا اور نہ کبھی یہ دیکھا گیا کہ آپ کے پیچھے پیچھے لوگ چل رہے ہوں"

لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ انسان خود آگے آگے چلے اور اس کے معتقدین اس کے پیچھے اس کی ایڑیوں کے ساتھ ساتھ چلیں۔ اس لئے کہ اس وقت انسان کا نفس اور شیطان اس کو بہکاتا ہے کہ دیکھ تیرے اندر کوئی خوبی اور بھلائی ہے۔ تب ہی تو اتنا بڑا مجمع تیرے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اس لئے حتی الامکان اس سے پرہیز کرنا چاہئے کہ لوگ اس کے پیچھے چلیں۔ جب آدمی چلے تو یا تو اکیلا چلے، یا لوگوں کے ساتھ مل کر چلے۔ آگے آگے نہ چلے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اعلان

چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے معمولات میں یہ بات لکھی ہے کہ آپ نے یہ عام اعلان کر رکھا تھا کہ کوئی شخص میرے پیچھے نہ چلے، میرے ساتھ نہ چلے، جب میں تنہا کہیں جا رہا ہوں تو مجھے تنہا جانے دیا کرو۔ حضرت فرماتے کہ یہ مقتدا کی شان بنانا کہ جب آدمی چلے تو دو آدمی اس کے دائیں طرف اور دو آدمی اس کے بائیں طرف چلیں، میں اس کو بالکل پسند نہیں کرتا، جس طرح ایک عام انسان چلتا ہے، اسی طرح چلنا چاہئے ایک مرتبہ آپ نے یہ اعلان فرمایا کہ اگر میں اپنے ہاتھ میں کوئی سامان اُٹھا کر جا رہا ہوں تو کوئی شخص آ کر میرے ہاتھ سے سامان نہ لے۔ مجھے اسی طرح جانے دے تاکہ آدمی کی اپنی کوئی امتیازی شان نہ ہو، اور جس طرح ایک عام آدمی رہتا ہے، اس طریقے سے رہے۔

شکستگی اور فنائیت پیدا کیجئے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہاں تو معاملہ عبدیت اور فنائیت اور بندگی کا ہے، شکستگی اور عاجزی کا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو جتنا مٹاؤ گے اور جتنا اپنی بندگی کا

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأطعمة، باب ما جاء في الأكل متكئا، رقم: ۳۲۷۸، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب من كره أن يوطأ عقباه، رقم: ۲۴۰، مسند أحمد، رقم: ۶۲۶۲

مظاہرہ کرو گے، اتنا ہی انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوں گے اور یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

فہم خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا یہ راستہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو زیادہ عقلمند اور ہوشیار جتائے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل تو اسی شخص پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے شکستگی اور بندگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ارے کہاں کی شان اور کہاں کی بڑائی جتاتے ہو۔ شان اور بڑائی اور خوشی کا موقع تو وہ ہے جب اللہ تعالیٰ ہماری روح نکل رہی ہو، اس وقت اللہ تعالیٰ یہ فرمادیں:

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ارۡجِعِىۡۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً ۝ فَادۡخُلِىۡ فِىۡ عِبٰدِىۡ ۝ وَادۡخُلِىۡ جَنَّتِىۡ ۝﴾(۱)

دیکھئے، اس آیت میں اس بندہ کی روح سے کہا جائے گا کہ میرے بندوں میں داخل ہو جاؤ، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا سب سے اعلیٰ مقام "بندگی" ہے۔

حضور ﷺ کا اظہارِ عاجزی

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ ہر معاملے میں وہ طریقہ پسند فرماتے، جس میں عبدیت ہو، بندگی ہو، شکستگی کا اظہار ہو، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورِ اقدس ﷺ سے یہ پوچھا گیا کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کے لئے یہ اُحد پہاڑ سونے کا بنا دیا جائے، تاکہ آپ کی معاش کی تکلیف دور ہو جائے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ مجھے تو یہ پسند ہے:

((اَشۡبَعُ يَوۡمًا وَ اَجُوۡعُ يَوۡمًا))

ایک دن کھاؤں، اور ایک دن بھوکا رہوں۔ جس دن کھاؤں تو آپ کا شکر ادا کروں۔ اور جس دن بھوکا رہوں اس دن صبر کروں۔ اور آپ سے مانگ کر کھاؤں۔(۲)

ایک حدیث میں آتا ہے:

---

(۱) الفجر: ۲۷ تا ۳۰، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "(البتہ نیک لوگوں سے کہا جائے گا کہ:) اے وہ جان جو (اللہ کی اطاعت میں چین پاچکی ہے! اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آجا کہ تو اس سے راضی ہو، اور وہ تجھ سے راضی، اور شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں، اور داخل ہو جا میری جنت میں"

(۲) سنن الترمذی، كتاب الزهد، ماجاء فی الكفاف والصبر، رقم: ۲۲۷۰، سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الاقتصاد فی الأكل وكراهة الشبع، رقم: ۳۳۴۱، مسند أحمد، رقم: ۲۱۱۶۶

"مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ اَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا أَخَذَ اَيْسَرَهُمَا" (۱)

یعنی جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی معاملے میں دو راستوں کا اختیار دیا جاتا ہے، یا تو یہ راستہ اختیار کرلیں یا یہ راستہ اختیار کرلیں، تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان میں سے آسان راستے کو اختیار فرماتے، اس لئے کہ مشکل راستہ اختیار کرنے میں اپنی بہادری کا دعویٰ ہے کہ میں بڑا بہادر ہوں کہ یہ مشکل کام انجام دے لوں گا اور آسان راستہ اختیار کرنے میں عاجزی شکستگی اور بندگی کا اظہار ہے کہ میں تو بہت کمزور ہوں اور اس کمزوری کی وجہ سے آسان راستہ اختیار کرتا ہوں لہٰذا جو کچھ کسی کو حاصل ہوا وہ بندگی اور فنائیت ہی میں حاصل ہوا، اور فنا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی مرضی اور ان کی مشیت کے آگے اپنے وجود کو انسان فنا کردے، اور جب فنا کردیا تو سمجھو کہ سب کچھ اس فنائیت میں حاصل ہوگیا۔

"ابھی یہ چاول کچے ہیں"

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ کی زبان پر اللہ تعالیٰ بڑے عجیب غریب معارف جاری فرمایا کرتے تھے، ایک دن فرمانے لگے جب پلاؤ پکایا جاتا ہے، تو شروع شروع میں ان چاولوں کے اندر جوش ہوتا ہے، ان میں سے آواز آتی رہتی ہے اور وہ حرکت کرتے رہتے ہیں، اور ان چاولوں کا جوش مارنا، حرکت کرنا اس بات کی علامت ہے کہ چاول ابھی کچے ہیں، پکے نہیں ہیں۔ وہ ابھی کھانے کے لائق نہیں۔ اور نہ ان میں ذائقہ ہے اور نہ خوشبو، لیکن جب چاول پکنے کے بالکل قریب ہوجاتے ہیں، اس وقت اس کا دم نکالا جاتا ہے۔ اور دم نکالتے وقت نہ تو ان چاولوں میں جوش ہوتا ہے، نہ حرکت اور آواز ہوتی ہے۔ اس وقت وہ چاول بالکل خاموش پڑے رہتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی اس کا دم نکالا، ان چاولوں میں سے خوشبو پھوٹ پڑی۔ اور اب اس میں ذائقہ بھی پیدا ہوگیا اور کھانے کے قابل ہوگئے۔

صبا جو ملنا تو کہنا یہ میرے یوسف سے
کہ پھوٹ نکلی ترے پیرہن سے بو تیری

اسی طرح جب تک انسان کے اندر یہ دعوے ہوتے ہیں کہ میں ایسا ہوں، میں بڑا علامہ ہوں، میں بڑا متقی ہوں، بڑا نمازی ہوں، چاہے دعوے زبان پر ہوں، چاہے دل میں ہوں، اس وقت

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی، رقم: ۳۲۹۶، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب مباعدته للآثام واختیاره من المباح أسهله وانتقامه، رقم: ۴۲۹۴، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی التجاوز فی الأمر، رقم: ۴۱۵۳، مسند أحمد، رقم: ۲۳۴۱۰

تک اس انسان میں نہ خوشبو ہے، اور نہ اس کے اندر ذائقہ ہے۔ وہ تو کچا چاول ہے۔ اور جس دن اس نے اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے ان دعووں کو فنا کر کے یہ کہہ دیا کہ میری تو کوئی حقیقت نہیں، میں کچھ نہیں۔ اس دن اس کی خوشبو پھوٹ پڑتی ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ اس کا فیض پھیلاتے ہیں۔

ایسے موقع پر ہمارے ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیا خوبصورت شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

میں عارفی، آوارہ صحراء فنا ہوں
ایک عالم بے نام و نشاں میرے لئے ہے

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے فنائیت کے صحراء میں آوارگی عطا فرمائی ہے اور مجھے فنائیت کا درس عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں بھی عطا فرمادے۔

سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، جن کے علم و فضل کا طوطی بول رہا تھا، اور ڈنکا بج رہا تھا، وہ خود اپنا واقعہ سناتے ہیں کہ جب میں نے ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' چھ جلدوں میں مکمل کرلی، تو بار بار دل میں یہ خلش ہوتی تھی کہ جس ذاتِ گرامی کی یہ سیرت لکھی ہے ان کی سیرت کا کوئی عکس یا کوئی جھلک میری زندگی میں بھی آئی یا نہیں؟ اگر نہیں آئی تو کس طرح آئے؟ اس مقصد کے لئے کسی اللہ والے کی تلاش ہوئی، اور یہ سن رکھا تھا کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون کی خانقاہ میں مقیم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کا فیض پھیلایا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ تھانہ بھون جانے کا ارادہ کرلیا، سفر کر کے تھانہ بھون پہنچ گئے اور حضرت والا سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور کئی روز وہاں مقیم رہے، جب واپس رخصت ہونے لگے تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! کوئی نصیحت فرمادیجئے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں اتنے بڑے علامہ کو کیا نصیحت کروں؟ علم و فضل کے اعتبار سے پوری دنیا میں ان کی شہرت ہے، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: یا اللہ! میرے دل میں ایسی بات ڈال دیجئے جو ان کے حق میں بھی فائدہ مند ہو اور میرے حق میں بھی فائدہ مند ہو اس کے بعد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''بھائی ہمارے طریق میں تو اول و آخر اپنے آپ کو مٹا دینا ہے''

حضرت سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ الفاظ کہتے وقت اپنا ہاتھ سینے کی طرف لے جاکر نیچے کی طرف ایسا جھٹکا دیا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے دل پر جھٹکا لگ گیا۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضرت سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ایک دن دیکھا کہ خانقاہ کے باہر حضرت سلیمان ندوی مجلس میں آنے والوں کے جوتے سیدھے کررہے ہیں۔ یہ تواضع اور فنائیت اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں پیدا کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد وہ خوشبو پھوٹی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔

''انا'' کا بت دل سے نکال دیجئے

بہر حال، جب تک ''انا'' (میں) کا بت دل میں موجود ہے، اس وقت تک یہ چاول کچا ہے، ابھی جوش ماررہا ہے اور اس وقت یہ خوشبودار بنے گا جب اس ''انا'' کو مٹادیا جائے گا فنائیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے، ''فنائیت'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنے طور طریقے اور انداز ادا میں انسان تکبر سے پرہیز کرے، اور عاجزی کو اختیار کرے، اور جس دن عاجزی کو اختیار کرے گا انشاء اللہ اس دن راستہ کھل جائے گا، کیونکہ حق تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ''تکبر'' ہوتی ہے اور ''تکبر'' والا اپنے آپ کو کتنا ہی بڑا سمجھتا رہے۔ اور دنیا والوں کو کتنا ہی ذلیل سمجھتا رہے۔ لیکن انجام کار اللہ تعالیٰ تواضع والے کو ہی عزت عطا فرماتے ہیں اور تکبر والے کو ذلیل کرتے ہیں۔

عربی ادب میں متکبر کی مثال

عربی زبان میں کسی نے بڑی حکیمانہ بات کہی ہے، وہ یہ کہ متکبر کی مثال اس شخص جیسی ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو۔ اب وہ پہاڑ کے اُوپر سے نیچے چلنے پھرنے والوں کو چھوٹا سمجھتا ہے، اس لئے کہ اُوپر سے اس کو وہ لوگ چھوٹے نظر آرہے ہیں، اور جو لوگ نیچے سے اس کو پہاڑ پر دیکھنے والے ہیں وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، بالکل اسی طرح ساری دنیا متکبر کو حقیر سمجھتی ہے، اور وہ دنیا والوں کو حقیر سمجھتا ہے لیکن جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے آپ کو فنا کردیا، اللہ تعالیٰ اس کو عزت عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ چیز ہمارے اندر بھی پیدا فرمادے۔

ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے کہ میں اپنے گھر میں کبھی کبھی ننگے پیر بھی چلتا ہوں، اس لئے کہ کسی روایت میں پڑھ لیا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی موقع پر ننگے پاؤں بھی چلے تھے، میں بھی اس لئے چل رہا ہوں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر بھی عمل ہوجائے اور فرمایا کرتے کہ میں ننگے پاؤں چلتے وقت اپنے آپ سے مخاطب ہوکر کہتا ہوں کہ دیکھ، تیری اصل

حقیقت تو یہ ہے کہ نہ پاؤں میں جوتا نہ سر پر ٹوپی اور نہ جسم پر لباس اور تو انجام کار مٹی میں مل جانے والا ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ رابسن روڈ کے مطب میں میں بیٹھا ہوا تھا، اس وقت حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ مطب کے سامنے سے اس حالت میں گزرے کہ ان کے دائیں طرف کوئی آدمی تھا اور نہ بائیں طرف، بس اکیلے جا رہے تھے اور ہاتھ میں کوئی برتن اُٹھایا ہوا تھا، حضرت ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس وقت کچھ لوگ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے پوچھا: یہ صاحب جو جا رہے ہیں، آپ ان کو جانتے ہیں کہ یہ کون صاحب ہیں؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ کیا تم یہ باور کر سکتے ہو کہ یہ پاکستان کا ''مفتی اعظم'' ہے، جو ہاتھ میں پتیلی لیے جا رہا ہے۔ اور ان کے لباس و پوشاک سے، انداز و ادا سے، چال ڈھال سے کوئی پتہ بھی نہیں لگا سکتا کہ یہ اتنے بڑے علامہ ہیں۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میرے والد ماجد کے استاذ اور دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھے، ان کا واقعہ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ آپ کے گھر کے آس پاس کچھ بیواؤں کے مکانات تھے، آپ کا روز کا معمول تھا کہ جب آپ اپنے گھر سے دارالعلوم دیوبند جانے کے لئے نکلتے تو پہلے ان بیواؤں کے مکانات پر جاتے، اور ان سے پوچھتے کہ بی بی، بازار سے کچھ سودا سلف منگانا ہے تو بتا دو، میں لا دوں گا۔ اب وہ بیوہ ان سے کہتی کہ ہاں بھائی، بازار سے اتنا دھنیہ، اتنی پیاز، اتنے آلو وغیرہ لا دو۔ اس طرح دوسری کے پاس، پھر تیسری کے پاس جا کر معلوم کرتے، اور پھر بازار جا کر سودا لا کر ان کو پہنچا دیتے، بعض اوقات یہ ہوتا کہ جب سودا لا کر دیتے تو کوئی بی بی کہتی، مولوی صاحب! آپ غلط سودا لے آئے، میں نے تو فلاں چیز کہی تھی، آپ فلاں چیز لے آئے۔ میں نے اتنی منگائی تھی، آپ اتنی لے آئے۔ آپ فرماتے: بی بی، کوئی بات نہیں، میں دوبارہ بازار سے لا دیتا ہوں۔ چنانچہ دوبارہ بازار جا کر سودا لا کر ان کو دیتے۔ اس کے بعد فتاویٰ لکھنے کے لئے دارالعلوم دیوبند تشریف لے جاتے۔ میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ شخص جو بیواؤں کا سودا سلف لینے کے لئے بازار میں پھر رہا ہے، یہ ''مفتی اعظم ہند'' ہے۔ کوئی شخص دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ علم و فضل کا پہاڑ ہے۔ لیکن اس تواضع کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ان کے فتاویٰ پر مشتمل بارہ جلدیں چھپ

چکی ہیں اور ابھی تک اس پر کام جاری ہے۔ اور ساری دنیا ان سے فیض اُٹھا رہی ہے وہی بات ہے کہ

کہ پھوٹ نکلی ترے پیرہن سے بو تیری

وہ خوشبو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادی آپ کا انتقال بھی اس حالت میں ہوا کہ آپ کے ہاتھ میں ایک فتویٰ تھا، اور فتویٰ لکھتے لکھتے آپ کی روح قبض ہوگئی

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیوبند کے بانی ہیں، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ہر وقت ایک تہبند پہنے رہتے تھے اور معمولی سا کرتہ ہوتا تھا۔ کوئی شخص دیکھ کر یہ پہچان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ اتنا بڑا علامہ ہے۔ جب مناظرہ کرنے پر آجائیں تو بڑوں بڑوں کے دانت کھٹے کردیں۔ لیکن سادگی اور تواضع کا یہ حال تھا کہ تہبند پہنے ہوئے مسجد میں جھاڑو دے رہے ہیں۔

چونکہ آپ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا، تو انگریزوں کی طرف سے آپ کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوگیا۔ چنانچہ ایک آدمی ان کو گرفتار کرنے کے لئے آیا۔ کسی نے بتادیا کہ وہ چھتے کی مسجد میں رہتے ہیں۔ جب وہ شخص مسجد میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی بنیان اور لنگی پہنے ہوئے مسجد میں جھاڑو دے رہا ہے۔ اب چونکہ وارنٹ کے اندر یہ لکھا تھا کہ ''مولانا محمد قاسم نانوتوی کو گرفتار کیا جائے'' اس لئے جو شخص گرفتار کرنے آیا تھا وہ یہ سمجھا کہ یہ تو جبے قبے کے اندر ملبوس بڑے علامہ ہوں گے جنہوں نے اتنی بڑی تحریک کی قیادت کی ہے، اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ یہ صاحب جو مسجد میں جھاڑو دے رہے ہیں، یہی مولانا قاسم صاحب ہیں، بلکہ وہ سمجھا کہ یہ شخص مسجد کا خادم ہے۔ چنانچہ اس شخص نے انہیں سے پوچھا کہ مولانا محمد قسم صاحب کہاں ہیں؟ حضرت مولانا کو معلوم ہو چکا تھا کہ میرے خلاف وارنٹ نکلا ہوا ہے اس لئے چھپانا بھی ضروری ہے، اور جھوٹ بھی نہیں بولنا ہے، اس لئے آپ جس جگہ کھڑے تھے وہاں سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے، پھر جواب دیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہاں تھے، چنانچہ وہ شخص یہی سمجھا کہ تھوڑی دیر پہلے تو مسجد میں تھے، لیکن اب موجود نہیں ہیں، چنانچہ وہ شخص تلاش کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر دو حرف علم کی تہمت محمد قاسم کے نام پر نہ ہوتی تو دنیا کو پتہ بھی نہ چلتا کہ قاسم کہاں پیدا ہوا تھا اور کہاں مر گیا۔ اس طرح فنائیت کے ساتھ زندگی گزاری۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد مغیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے لئے ایسی تحریک چلائی جس نے پورے ہندوستان، افغانستان اور ترکی سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آپ کی شہرت پورے ہندوستان میں تھی۔ چنانچہ اجمیر میں ایک عالم تھے مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، ان کو خیال آیا کہ دیوبند جا کر حضرت شیخ الہند سے ملاقات اور ان کی زیارت کرنی چاہئے۔ چنانچہ ریل گاڑی کے ذریعہ دیوبند پہنچے اور وہاں ایک تانگے والے سے کہا کہ مجھے مولانا شیخ الہند سے ملاقات کے لئے جانا ہے اب ساری دنیا میں تو وہ شیخ الہند کے نام سے مشہور تھے، مگر دیوبند میں ''بڑے مولوی صاحب'' کے نام سے مشہور تھے تانگے والے نے پوچھا کہ کیا بڑے مولوی صاحب کے پاس جانا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں، بڑے مولوی صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ تانگے والے نے حضرت شیخ الہند کے گھر کے دروازے پر اُتار دیا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ جب انہوں نے دروازے پر دستک دی تو ایک آدمی بنیان اور لنگی پہنے ہوئے نکلا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب سے ملنے کے لئے اجمیر سے آیا ہوں۔ میرا نام معین الدین ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت تشریف لائیں، اندر بیٹھیں۔ چنانچہ جب بیٹھ گئے تو پھر انہوں نے کہا کہ آپ حضرت مولانا کو اطلاع کر دیں کہ معین الدین اجمیری آپ سے ملنے آیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت آپ گرمی میں آئے ہیں تشریف رکھیں اور پھر پنکھا جھلنا شروع کر دیا جب کچھ دیر گزر گئی تو مولانا اجمیری صاحب نے پھر کہا کہ میں نے تم سے کہا کہ جا کر مولانا کو اطلاع کر دو کہ اجمیر سے کوئی ملنے کے لئے آیا ہے۔ انہوں نے کہا: اچھا ابھی اطلاع کرتا ہوں۔ پھر اندر تشریف لے گئے اور کھانا لے آئے۔ مولانا نے پھر کہا کہ بھائی میں یہاں کھانا کھانے نہیں آیا، میں تو مولانا محمود الحسن صاحب سے ملنے آیا ہوں، مجھے ان سے ملاؤ۔ انہوں نے فرمایا: حضرت، آپ کھانا تناول فرمائیں، ابھی ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کھانا کھایا، پانی پلایا یہاں تک کہ مولانا معین الدین صاحب ناراض ہونے لگے کہ میں تم سے بار بار کہہ رہا ہوں مگر تم جا کر ان کو اطلاع نہیں کرتے، پھر فرمایا کہ حضرت بات یہ ہے کہ یہاں شیخ الہند تو کوئی نہیں رہتا۔ البتہ بندہ محمود اسی عاجز کا ہی نام ہے تب جا کر مولانا معین الدین صاحب کو پتا چلا کہ شیخ الہند کہلانے والے محمود الحسن صاحب یہ ہیں جن سے میں اب تک ناراض ہو کر گفتگو کرتا رہا۔ یہ تھا ہمارے بزرگوں کا البیلا رنگ، اللہ تعالیٰ اس کا کچھ رنگ ہمیں بھی عطا فرمادے آمین۔

مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کسی جگہ سے واپس کاندھلہ تشریف لا رہے تھے، جب ریل گاڑی سے کاندھلے کے اسٹیشن پر اُترے تو وہاں دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی سر پر سامان کا بوجھ اُٹھائے جا رہا ہے، اور بوجھ کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جا رہا ہے۔ آپ کو خیال آیا کہ یہ شخص بیچارہ تکلیف میں ہے، چنانچہ آپ نے اس بوڑھے سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کا تھوڑا سا بوجھ اُٹھالوں۔ اس بوڑھے نے کہا: آپ کا بہت شکریہ اگر آپ تھوڑا سا اُٹھالیں۔ چنانچہ مولانا صاحب اس کا سامان سر پر اُٹھا کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب چلتے چلتے راستے میں باتیں شروع ہوگئیں۔ حضرت مولانا نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ میں کاندھلے جا رہا ہوں۔ مولانا نے پوچھا کہ کیوں جا رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ سنا ہے کہ وہاں ایک بڑے مولوی صاحب رہتے ہیں، ان سے ملنے جا رہا ہوں۔ مولانا نے پوچھا کہ وہ بڑے مولوی صاحب کون ہیں؟ اس نے کہا: مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی، میں نے سنا ہے کہ وہ بہت بڑے مولانا ہیں، بڑے عالم ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ ہاں وہ عربی تو پڑھ لیتے ہیں یہاں تک کہ کاندھلہ قریب آگیا۔ کاندھلہ میں سب لوگ مولانا کو جانتے تھے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ مولانا مظفر حسین صاحب سامان اُٹھائے جا رہے ہیں تو لوگ ان سے سامان لینے کے لئے اور ان کی تعظیم و تکریم کے لئے ان کی طرف دوڑے اب ان بڑے میاں کی جان نکلنے لگی اور پریشان ہوگئے کہ میں نے اتنا بڑا بوجھ حضرت مولانا پر لاد دیا چنانچہ مولانا نے ان سے کہا کہ بھائی اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، میں نے دیکھا کہ تم تکلیف میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس خدمت کی توفیق دے دی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں رمضان المبارک میں یہ معمول تھا کہ آپ کے یہاں عشاء کے بعد تراویح شروع ہوتی تو فجر تک ساری رات تراویح ہوتی تھی، ہر تیسرے یا چوتھے روز قرآن شریف ختم ہوتا تھا، ایک حافظ صاحب تراویح پڑھایا کرتے تھے، اور حضرت والا پیچھے کھڑے ہوکر سنتے تھے، خود حافظ نہیں تھے۔ تراویح سے فرغ ہونے کے بعد حافظ صاحب وہیں حضرت والا کے قریب تھوڑی دیر کے لئے سو جاتے تھے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ کوئی آدمی میرے پاؤں دبا رہا ہے۔ میں سمجھا کہ کوئی شاگرد یا کوئی طالب علم ہوگا، چنانچہ میں نے دیکھا نہیں کہ کون دبا رہا ہے۔ کافی دیر گزرنے کے بعد میں نے جو

مڑ کر دیکھا تو حضرت شیخ الہند محمود الحسن صاحب میرے پاؤں دبا رہے تھے۔ میں ایک دم سے اُٹھ گیا اور کہا کہ حضرت! یہ آپ نے کیا غضب کر دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ غضب کیا کرتا، تم ساری رات تراویح میں کھڑے رہتے ہو، میں نے سوچا کہ دبانے سے تمہارے پیروں کو آرام ملے گا، اس لئے دبانے کے لئے آگیا۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے۔ بڑے اُونچے درجے کے عالم تھے، ان کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ میں بیان فرمایا کہ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ان کے سامنے ان کی تعریف کرتا تو بالکل خاموش رہتے تھے، کچھ بولتے نہیں تھے جیسے آج کل بناوٹی تواضع اختیار کرتے ہیں کہ اگر کوئی ہمارے سامنے ہماری تعریف کرتا ہے تو جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ تو آپ کا حسن ظن ہے، ورنہ ہم تو اس قابل نہیں ہیں وغیرہ حالانکہ دل میں بہت خوش ہوتے ہیں کہ یہ شخص ہماری اور تعریف کرے، اور ساتھ ساتھ دل میں بھی اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، لیکن ساتھ میں یہ الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ حقیقت میں بناوٹی تواضع ہوتی ہے، حقیقی تواضع نہیں ہوتی لیکن حضرت مولانا یعقوب صاحب خاموش رہتے۔ اب دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ حضرت مولانا اپنی تعریف پر خوش ہوتے ہیں، اپنی تعریف کرانا چاہتے ہیں، اس لئے تعریف کرنے سے نہ تو روکتے ہیں نہ ٹوکتے ہیں اور نہ ہی اس کی تردید کرتے ہیں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اب دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ ان کے اندر تواضع نہیں ہے۔ حالانکہ ان باتوں کا نام تواضع نہیں بلکہ تواضع تو دل کے اندر ہوتی ہے۔ اور اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ آدمی کبھی کسی کام کو اپنے سے فروتر نہیں سمجھتا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے آپ کو کھانے کی دعوت دی، آپ نے قبول فرمالی۔ اس شخص کا گاؤں فاصلے پر تھا۔ لیکن اس نے سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو آپ پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ان صاحب نے سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا، سواری کا انتظام کرنا چاہئے تھا۔ بہر حال، اس کے گھر پہنچے، کھانا کھایا، کچھ آم بھی کھائے، اس کے بعد جب واپس چلنے لگے تو اس وقت بھی اس نے سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ بلکہ اُلٹا یہ غضب کیا کہ بہت سارے آموں کی گٹھڑی بنا کر حضرت کے حوالے کر دی کہ حضرت یہ کچھ آم گھر کے لئے لیتے جائیں۔ اس اللہ کے بندے نے یہ نہ سوچا کہ اتنی دور جانا ہے۔ اور سواری کا کوئی انتظام بھی نہیں ہے، کیسے اتنی بڑی گٹھڑی لے کر جائیں گے۔ مگر اس نے وہ گٹھڑی مولانا کو دے دی اور مولانا نے قبول فرمالی، اور اُٹھا کر چل دیئے۔ اب ساری عمر مولانا

نے کبھی اتنا بوجھ اُٹھایا نہیں، شہزادوں جیسی زندگی گزاری، اب اس گٹھڑی کو کبھی ایک ہاتھ میں اُٹھاتے، کبھی دوسرے ہاتھ میں اُٹھاتے، چلے جارہے ہیں، یہاں تک کہ جب دیو بند قریب آنے لگا تو اب دونوں ہاتھ تھک کر چور ہوگئے، نہ اس ہاتھ میں چین، نہ اس ہاتھ میں چین، آخر کار اس گٹھڑی کو اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ جب سر پر رکھا تو ہاتھوں کو کچھ آرام ملا تو فرمانے لگے: ہم بھی عجیب آدمی ہیں۔ پہلے خیال نہیں آیا کہ اس گٹھڑی کو سر پر رکھ دیں، ورنہ اتنی تکلیف اُٹھانی نہ پڑتی۔ اب مولانا اس حالت میں دیو بند میں داخل ہو رہے ہیں کہ سر پر آموں کی گٹھڑی ہے۔ اب راستے میں جو لوگ ملتے وہ آپ کو سلام کر رہے ہیں، آپ سے مصافحہ کر رہے ہیں۔ اور آپ نے ایک ہاتھ سے گٹھڑی سنبھالی ہوئی ہے اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کر رہے ہیں، اسی حالت میں آپ اپنے گھر پہنچ گئے اور آپ کو ذرہ برابر بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ کام میرے مرتبے کے خلاف ہے اور میرے مرتبے سے فروتر ہے بہر حال، انسان کسی بھی کام کو اپنے مرتبے سے فروتر نہ سمجھے یہ ہے تواضع کی علامت۔

سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اعزاز

حضرت سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا نام آپ نے سنا ہوگا، بڑے اُونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے گزرے ہیں۔ جن کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا کہ دنیا میں کسی اور کے ساتھ ایسا واقعہ پیش نہیں آیا وہ یہ کہ ساری عمر ان کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری کی تمنا اور آرزو رہتی تھی۔ بہت آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت عطا فرمائی۔ حج کے لئے تشریف لے گئے، حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری ہوئی تو اس وقت بے ساختہ عربی کے یہ دو اشعار پڑھے:

فِیْ حَالَةِ الْبُعْدِ رُوْحِیْ كُنْتُ اُرْسِلُهَا
تُقَبِّلُ الْاَرْضَ عَنِّیْ وَ هِیَ نَائِبَتِیْ
وَهٰذِهٖ دَوْلَةُ الْاَشْبَاحِ قَدْ حَضَرَتْ
فَامْدُدْ يَمِيْنَكَ كَیْ تحظی بِهَا شَفَتِیْ

”یا رسول اللہ! جب میں آپ سے دور تھا تو دوری کی حالت میں روضۂ اقدس پر اپنی روح کو بھیجا کرتا تھا، وہ آکر میری نائب اور قائم مقام بن کر زمین کا بوسہ لیا کرتی تھی۔ آج جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے جسمانی طور پر حاضری نصیب ہوگئی ہے تو آپ اپنا دستِ مبارک بڑھائیں تاکہ میرے ہونٹ اس سے سیراب اور فیض یاب ہوسکیں۔ یعنی میں اس کا بوسہ لوں“

بس شعر کا پڑھنا تھا کہ فوراً روضۂ اقدس سے دستِ مبارک برآمد ہوا، اور جتنے لوگ وہاں حاضر تھے، سب نے دستِ مبارک کی زیارت کی، اور حضرت سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے دستِ مبارک کا بوسہ لیا، اور اس کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ اب حقیقت کیا تھی، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر تاریخ میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے۔(۱)

اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں خیال آیا کہ آج اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا بڑا اعزاز عطا فرمایا اور اتنا بڑا اکرام فرمایا کہ جو آج تک کسی کو نصیب نہ ہوا، کہیں اس کے نتیجے میں میرے دل کے اندر عُجب اور تکبر اور بڑائی کا شائبہ پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ مسجد نبوی کے دروازے پر لیٹ گئے اور حاضرین سے فرمایا کہ میں سب کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے اُوپر سے پھلانگ پھلانگ کر باہر نکلیں تاکہ بڑائی کا یہ شائبہ بھی دل سے نکل جائے اس طرح آپ نے تکبر اور عجب کا علاج کیا۔

انہیں یہ مقام کیوں ملا؟

یہ واقعہ تو درمیان میں بطور تعارف کے عرض کر دیا، ورنہ اصل واقعہ یہ بیان کرنا تھا کہ ایک مرتبہ سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ بازار تشریف لے جا رہے تھے، سڑک پر ایک خارشی کتا دیکھا، خارش اور بیماری کی وجہ سے اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔

جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں، ان کو اللہ کی مخلوق سے بھی بے پناہ شفقت اور محبت ہوتی ہے، اور یہ محبت وشفقت اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ سے خصوصی تعلق ہے، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ز تسبیح و سجادہ و دلق نیست
طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

یعنی تسبیح، مصلی اور گدڑی کا نام طریقت نہیں، بلکہ خدمتِ خلق کا نام طریقت ہے میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی اس سے محبت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں مخلوق کی محبت ڈال دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اللہ والوں کو انسانوں، بلکہ جانوروں تک سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ ہم اور آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

بہر حال، جب سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتے کو اس حالت میں دیکھا تو آپ کو اس پر

(۱) أسنى المطالب (۱/ ۳۵۷)

ترس اور رحم آیا، اور اس کتے کو اُٹھا کر گھر لائے، پھر ڈاکٹر کو بلا کر اس کا علاج کرایا، اس کی دوا کی، اور روزانہ اس کی مرہم پٹی کرتے رہے، کئی مہینوں تک اس کا علاج کرتے رہے، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو تندرست کر دیا تو آپ نے اپنے کسی ساتھی سے کہا کہ اگر کوئی شخص روزانہ اس کو کھلانے پلانے کا ذمہ لے تو اس کو لے جائے، ورنہ پھر میں ہی اس کو رکھتا ہوں، اور اس کو کھلاؤں گا، اس طرح آپ نے اس کتے کی پرورش کی۔

سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

اس واقعہ کے بعد ایک روز سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، بارش کا موسم تھا، کھیتوں کے درمیان جو پگڈنڈی ہوتی ہے، اس پر سے گزر رہے تھے، دونوں طرف پانی کھڑا تھا، کیچڑ تھی۔ چلتے چلتے سامنے سے اس پگڈنڈی پر ایک کتا آ گیا۔ اب یہ بھی رک گئے اور کتا بھی ان کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ پگڈنڈی اتنی چھوٹی تھی کہ ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا، دو آدمی نہیں گزر سکتے تھے۔ اب یا تو کتا نیچے کیچڑ میں اُتر جائے، اور یہ اُوپر سے گزر جائیں، یا پھر یہ کیچڑ میں اُتر جائیں، اور کتا اُوپر سے گزر جائے۔ دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ کیا کیا جائے؟ کون نیچے اُترے، میں اُتروں، یا کتا اُترے؟

اس وقت سید احمد کبیر رفاعیؒ کا اس کتے کے ساتھ مکالمہ ہوا اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ مکالمہ کس طرح ہوا؟ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور کرامت کے اس کتے کو کچھ دیر کے لئے زبان دیدی ہو۔ اور واقعی مکالمہ ہوا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے دل میں یہ مکالمہ کیا ہو بہر حال، اس مکالمہ میں حضرت سید احمد کبیرؒ نے کتے سے کہا کہ تو نیچے اُتر جا تا کہ میں اُوپر سے گزر جاؤں۔

کتے نے جواب میں کہا "میں نیچے کیوں اُتروں، تم بڑے درویش اور اللہ کے ولی بنے پھرتے ہو، اور اللہ کے ولیوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ وہ ایثار کا پیکر ہوتے ہیں، دوسروں کے لئے قربانی دیتے ہیں، تم کیسے اللہ کے ولی ہو کہ مجھے اُترنے کا حکم دے رہے ہو، خود کیوں نہیں اُتر جاتے؟"

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا "بات دراصل یہ ہے کہ میرے اور تیرے اندر فرق ہے، وہ یہ کہ میں مکلّف ہوں، تو غیر مکلّف ہے، مجھے نماز پڑھنی ہے، تجھے نماز نہیں پڑھنی ہے، اگر نیچے اُترنے کی وجہ سے تیرا جسم گندہ اور ناپاک ہو گیا تو تجھے غسل اور طہارت کی ضرورت نہیں ہوگی اگر میں اُتر گیا تو میرے کپڑے ناپاک ہو جائیں گے اور میری نماز میں خلل واقع ہوگا، اس لئے میں تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ تو نیچے اُتر جا"

کتے نے جواب میں کہا "واہ آپ نے بھی عجیب بات کہی کہ کپڑے گندے ہو جائیں گے۔

ارے، اگر آپ کے کپڑے گندے ہو جائیں گے تو ان کا علاج یہ ہے کہ ان کو اُتار کر دھو لینا، وہ کپڑے پاک ہو جائیں گے، لیکن اگر میں نیچے اُتر گیا تو تمہارا دل گندہ ہو جائے گا اور تمہارے دل میں یہ خیال آجائے گا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں، میں انسان ہوں، اور یہ کتا ہے، اور اس خیال کی وجہ سے تمہارا دل ایسا گندہ ہو جائے گا کہ اس کی پاکی کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ دل کی گندگی کے بجائے کپڑوں کی گندگی کو گوارا کر لو اور نیچے اُتر جاؤ''

بس، کتے کا یہ جواب سن کر حضرت شیخ نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا کہ تم نے صحیح کہا کہ کپڑوں کو دوبارہ دھو سکتا ہوں، لیکن دل نہیں دھو سکتا۔ یہ کہہ کر آپ کیچڑ میں اُتر گئے، اور کتے کو راستہ دے دیا۔

جب یہ مکالمہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کو الہام ہوا، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ اے احمد کبیر! آج ہم نے تم کو ایک ایسے علم کی دولت سے نوازا، کہ سارے علوم ایک طرف اور یہ علم ایک طرف، اور یہ درحقیقت تمہارے اس عمل کا انعام ہے کہ تم نے چند روز پہلے ایک کتے پر ترس کھا کر اس کا علاج اور دیکھ بھال کی تھی اس عمل کی بدولت ہم نے تمہیں ایک کتے کے ذریعہ ایسا علم عطا کیا جس پر سارے علوم قربان ہیں وہ علم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کتے سے بھی افضل نہ سمجھے اور کتے کو اپنے مقابلے میں حقیر خیال نہ کرے۔

بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ جو جلیل القدر بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا واقعہ مشہور ہے کہ انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ حضرت! اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ فرمایا؟ جواب دیا کہ ہمارے ساتھ بڑا عجیب معاملہ ہوا، جب ہم یہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیا عمل لے کر آئے ہو؟ میں نے سوچا کہ کیا جواب دوں، اور اپنا کون سا عمل پیش کروں، اس لئے کہ کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے جس کو پیش کروں، لہٰذا میں نے جواب دیا، یا اللہ! کچھ بھی نہیں لایا، خالی ہاتھ آیا ہوں، آپ کے کرم کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ویسے تو تم نے بڑے بڑے عمل کیے، لیکن تمہارا ایک عمل ہمیں بہت پسند آیا، آج اسی عمل کی بدولت ہم تمہاری مغفرت کر رہے ہیں۔ وہ عمل یہ ہے کہ ایک رات جب تم اُٹھے تو تم نے دیکھا کہ ایک بلی کا بچہ سردی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا ہے، کانپ رہا ہے، تم نے اس پر ترس کھا کر اس کو اپنے لحاف میں جگہ دے دی، اور اس کی سردی دور کر دی، اور اس بلی کے بچے نے آرام کے ساتھ ساری رات گزاری چونکہ تمہارا یہ عمل اخلاص پر مبنی تھا اور ہماری رضا کے علاوہ کوئی غرض شاملِ حال نہیں تھی، بس تمہارا یہ عمل ہمیں اتنا پسند آیا کہ اس عمل کی بدولت ہم نے تمہاری مغفرت کر دی۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں جو بڑے علوم و معارف حاصل کیے تھے، وہ سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہاں تو صرف ایک ہی عمل پسند آیا، وہ تھا ''مخلوق کے ساتھ حسنِ اخلاق''

بہر حال، حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کو اس الہام کے ذریعہ یہ بتایا گیا کہ وہ سارے علوم ایک طرف، اور یہ ایک علم کہ میں بے حقیقت چیز ہوں اور میری اپنی ذات کے اندر کوئی حقیقت نہیں ہے، یہی سارے علوم کی جان ہے جو آج ہم نے تمہیں عطا کر دی۔ اسی کا نام تواضع ہے۔ سارے بڑے بڑے اولیاء اللہ اس بات کی فکر میں لگے رہتے تھے کہ کہیں اپنے اندر تکبر کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہو جائے۔

''تواضع'' اور ''احساسِ کمتری'' میں فرق

آج کل ''علم نفسیات'' کا بڑا زور ہے، اور ''علم نفسیات'' میں سے ایک چیز آج کل لوگوں میں بہت مشہور ہے، وہ ہے ''احساسِ کمتری''، اس کو بہت برا سمجھا جاتا ہے کہ ''احساسِ کمتری'' بہت بری چیز ہے، اگر کسی میں یہ پیدا ہو جائے تو اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ جب آپ لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ ''اپنے آپ کو مٹاؤ'' تو اس کے ذریعے آپ لوگوں کے اندر ''احساسِ کمتری'' پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو کیا یہ بات درست ہے کہ لوگ اپنے اندر احساسِ کمتری پیدا کریں؟

بات دراصل یہ ہے کہ ''تواضع'' اور ''احساس کمتری'' میں فرق ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ ''علم نفسیات'' ایجاد کی، انہیں دین کا علم یا اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں کوئی علم تھا ہی نہیں، انہوں نے ایک ''احساسِ کمتری'' کا لفظ اختیار کر لیا، حالانکہ اس میں بہت سی اچھی باتیں شامل ہو جاتی ہیں۔ ان کو ''احساسِ کمتری'' کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ''تواضع'' اور ''احساسِ کمتری'' میں فرق ہے۔

احساسِ کمتری میں تخلیق پر شکوہ

دونوں میں فرق یہ ہے کہ ''احساسِ کمتری'' میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر شکوہ اور شکایت ہوتی ہے۔ یعنی احساسِ کمتری میں انسان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے محروم اور پیچھے رکھا گیا ہے۔ میں مستحق تو زیادہ کا تھا، لیکن مجھے کم ملا، یا مثلاً یہ احساس کہ مجھے بدصورت پیدا کیا گیا، مجھے بیمار پیدا کیا گیا، مجھے دولت کم دی گئی، میرا رتبہ کم رکھا گیا۔ اس قسم کے شکوے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، اور پھر اس شکوے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت میں جھنجلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر اس احساسِ

کمتری کے نتیجے میں انسان دوسروں سے حسد کرنے لگتا ہے، اور اس کے اندر مایوسی پیدا ہوجاتی ہے کہ اب مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا بہرحال، احساسِ کمتری کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے شکوے پر ہوتی ہے۔

''تواضع'' شکر کا نتیجہ ہے

جہاں تک تواضع کا تعلق ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر شکوے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے انعامات پر شکر کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ تواضع کرنے والا یہ سوچتا ہے کہ میں تو اس قابل نہیں تھا کہ مجھے یہ نعمت ملتی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، یہ ان کا کرم اور ان کی عطا ہے، میں تو اس کا مستحق نہیں تھا۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ ''احساسِ کمتری'' اور ''تواضع'' میں کتنا بڑا فرق ہے۔ اس لئے تواضع محبوب اور پسندیدہ عمل ہے، حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور بلندی عطا فرماتے ہیں ''تکبر'' کی خاصیت یہ ہے کہ ''متکبر'' بالآخر ذلیل ہوتا ہے، اور تواضع کی خاصیت یہ ہے کہ ''متواضع'' شخص کو بالآخر عزت حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ صرف رفعت اور بلندی حاصل کرنے کے لئے جھوٹی اور بناوٹی تواضع نہ ہو، بلکہ وہ حقیقی تواضع ہو۔

تواضع کا دکھاوا بھی ہوتا ہے

بعض اوقات ہم لوگ زبان سے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ہماری حقیقت کیا ہے؟ اور ہم تو ناچیز ہیں، ناکارہ ہیں، احقر ہیں وغیرہ، بسا اوقات یہ تواضع نہیں ہوتی بلکہ تواضع کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہمارے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ اس بات کا اندازہ لگانا کہ وہ یہ الفاظ واقعی تواضع سے کہہ رہا ہے یا دکھاوے سے کہہ رہا ہے اس کا امتحان بہت آسان ہے۔ وہ اس طرح کہ جب کوئی شخص کہے میں تو بڑا ناچیز ہوں، ناکارہ ہوں، خطاکار ہوں اور گناہ گار ہوں آپ اس وقت اگر جواب میں یہ کہہ دیں کہ بیشک آپ نے بالکل صحیح فرمایا، آپ واقعی بڑے ناچیز ہیں، بڑے ناکارہ ہیں، بڑے خطاکار ہیں، اور بڑے گناہ گار ہیں، پھر دیکھو کہ اس جواب کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اگر اس نے سچے دل سے یہ الفاظ کہے تھے تب تو اس جواب کا خیر مقدم کرے گا لیکن اگر اس جواب کی وجہ سے اس کے دل میں ملال پیدا ہوگیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچے دل سے یہ باتیں نہیں کہہ رہا تھا، بلکہ تواضع کے الفاظ اس لئے استعمال کر رہا تھا تاکہ جواب میں یہ کہا جائے کہ نہیں حضرت! آپ تو بڑے نیک ہیں، بڑے متقی ہیں، بڑے پرہیزگار ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصنوعی تواضع میں جو الفاظ کہے جاتے ہیں وہ سچے دل سے نہیں کہے جاتے، بلکہ دوسروں سے اپنی تعریف کروانے کے لئے کہے جاتے ہیں

لہٰذا یہ تواضع نہ ہوئی۔

ناشکری سے بچنا بھی ضروری ہے

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر کچھ اچھے اوصاف ہوتے ہی ہیں، کسی کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، کسی کو صحت دی ہے، کسی کو دولت دی ہے، کسی کو کوئی مرتبہ دیا ہے، کسی کو کوئی منصب دیا ہے، یہ ساری چیزیں موجود ہیں، تو انسان کیسے انکار کردے، اور کہے کہ یہ چیز ہمیں حاصل نہیں، اگر اس کا انکار کردے گا تو ناشکری، اور کفرانِ نعمت ہوگا، اس کے جواب میں بزرگوں نے فرمایا کہ تواضع کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ ناشکری کی حد تک پہنچ جائے، تواضع بھی ہو، لیکن ساتھ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناشکری بھی نہ ہو۔

تواضع کا غلط مفہوم

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک واقعہ بیان فرمایا کہ میں ایک مرتبہ الٰہ آباد سے کانپور کے لئے ریل میں سوار ہوا۔ چند جنٹلمین اس ہی ڈبہ میں سوار تھے اور ایک منصف صاحب بھی سوار تھے۔ یہ منصف صاحب پرانے اور سادی وضع کے آدمی تھے۔ ان جنٹلمینوں نے ان منصف صاحب کو بنانا شروع کیا۔ اگرچہ بے تکلفی کی ابتداء منصف صاحب کی طرف سے ہوئی۔ غرض ان جنٹلمینوں نے کھانے کا دسترخوان کھولا اور ان میں سے ایک نے منصف صاحب سے کہا کہ آیئے آپ بھی کچھ گوموت کھالیجئے۔ دوسرے ساتھی بولے کہ کیا واہیات ہے؟ توبہ کرو، توبہ کرو، کھانے کو گوموت کہتے ہو؟ اس نے جواب میں کہا کہ اپنے کھانے کو کھانا کہنا بھی تکبر ہے اس حیثیت سے کہ وہ اپنا کھانا ہے گوموت ہی کہنا تواضع ہے۔

تکبر اور ناشکری دونوں غلط ہیں

ایک طرف ناشکری سے بھی بچنا ہے دوسری طرف تکبر سے بھی بچنا ہے، اور تواضع اختیار کرنی ہے، دونوں کام جمع کرے، مثلاً نماز پڑھی، روزہ رکھا اور اس عمل کو یہ سمجھنا کہ میں نے بڑا زبردست عمل کرلیا تو یہ بڑا تکبر ہے اور اگر اپنے عمل کے بارے میں یہ کہا کہ یہ تو بیکار ہے، جیسا کہ آج کل بعض لوگ نماز کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم نے ٹکریں مارلیں، تو یہ اس عمل پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناشکری اور ناقدری ہے۔

شکر اور تواضع کیسے جمع ہوں؟

سوال یہ ہے کہ دونوں چیزوں کو کیسے جمع کیا جائے کہ ناشکری بھی نہ ہو، تکبر بھی نہ ہو۔ شکر بھی ادا ہو اور تواضع بھی ہو۔ حقیقت میں یہ کوئی مشکل کام نہیں دونوں کاموں کو جمع کرنا بالکل آسان ہے، وہ اس طرح کہ انسان یہ خیال کرے کہ اپنی ذات میں تو میرے اندر اس عمل کی ذرہ برابر طاقت اور صلاحیت نہیں تھی، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے یہ عمل کرادیا، اس طرح دونوں چیزیں جمع ہوجاتی ہیں کہ اپنی ذات میں اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھا تو تواضع ہوگئی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا کا اقرار کیا تو یہ شکر ہوگیا اب دونوں باتیں جمع ہوگئیں۔ اس لئے جو بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر بجالاتا ہو، اس کے اندر کبھی تکبر نہیں آسکتا، کیونکہ شکر کے معنی یہ ہیں کہ میرے اندر اپنی ذات میں کوئی صلاحیت نہیں تھی، اللہ جل جلالہ نے اپنے فضل وکرم اور اپنی عطا سے مجھے یہ چیز عطا فرمائی ہے۔

دیکھئے! نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے دونوں کو جمع کرکے دکھادیا فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ))(۱)

میں سارے آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں اب اس سے ظاہر ہورہا ہے کہ اپنی بڑائی کا اظہار فرمارہے ہیں لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ "ولا فخر" یعنی کہ میں اپنا سردار ہونا بڑائی کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے اپنے فضل وکرم سے بڑا بنادیا، اور سارے آدم کے بیٹوں کا سردار بنایا، یہ محض ان کی عطا ہے، میری ذات کی بڑائی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ ایک مثال

اس بات کو حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا، فرمایا کہ اس کو ایک مثال سے سمجھو کہ پہلے زمانے میں غلام ہوا کرتے تھے، اور اپنے مالک کے مملوک ہوتے تھے، مالک ان کو بازار میں باقاعدہ بیچ سکتا تھا، آقا ان کی ہر چیز کا مالک ہوتا تھا، مالک جو بھی حکم دے گا غلام کو کرنا ہوگا، اگر وہ کہے کہ میں سفر میں جارہا ہوں میری غیر موجودگی میں اب تم حکمرانی کرو، اب وہ حکمرانی کررہا ہے، گورنر بنا ہوا ہے، لیکن ہے غلام کا غلام، لہٰذا اس غلام کے دماغ میں یہ بات آہی نہیں سکتی کہ یہ جو اقتدار میرے پاس آیا ہے، یہ میری قوتِ بازو کا یا میری صلاحیت کا نتیجہ ہے، کچھ بھی نہیں، اس کو یہ خیال رہتا ہے کہ جب آقا آجائے گا تو کہہ دے گا کہ ہٹو، اب بیت الخلاء صاف کرو، تب وہ

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، باب في فضل النبي، رقم: ۳۵۴۸، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الشفاعة، رقم: ٤٢٩٨، مسند أحمد، رقم: ٢٤١٥

سارا تخت اور ساری حکمرانی دھری رہ جائے گی، معلوم ہوا کہ وہ غلام بیشک حاکم بن کر حکم چلا رہا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اپنی حقیقت کا احساس بھی کر رہا ہے، کہ یہ حکمرانی میرے مالک کی عطا ہے حقیقت میں تو میں غلام ہی ہوں۔

یہ تو ایک غلام کا حال تھا، لیکن ''بندہ'' ہونے کا درجہ اس سے کہیں زیادہ نیچے ہے، لہٰذا جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندہ کو کوئی منصب عطا فرمادیں تو ''بندہ'' کو سمجھنا چاہئے کہ منصب تو مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادیا، اسی وجہ سے یہ کام انجام دے رہا ہوں، لیکن میں ان کا بندہ ہوں، میری حقیقت اس غلام سے بھی فروتر ہے، جس کو مالک نے تخت پر بٹھادیا کتنے غلام گزرے ہیں، جنہوں نے بادشاہت کی ہے، لیکن رہے غلام کے غلام۔

تاریخ کا ایک عبرت ناک قصہ

ایک عبرت ناک قصہ یاد آیا، ایک غلام نے اپنے آقا کے خلاف بغاوت کر کے آقا کو قتل کر دیا، اور باقاعدہ بادشاہ بن گیا، اب مدتوں تک بادشاہ بنا رہا، شہزادے بھی پیدا ہوگئے، لیکن حقیقت میں تو وہ بادشاہ کا غلام تھا۔ ایک مرتبہ اس غلام بادشاہ نے شیخ عزالدین بن عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دربار میں بلایا، جو اولیاء اللہ میں سے تھے یہ اپنی صدی کے مجدد تھے اس غلام بادشاہ نے ان کو بلا کر کہا: میں آپ کو قاضی بنانا چاہتا ہوں۔ شیخ نے جواب میں کہا کہ بات یہ ہے کہ قاضی بنانے کا کام اس شخص کا ہے جو خلیفہ برحق ہو، اور آپ خلیفہ برحق نہیں ہیں، اس لئے کہ آپ تو غلام ہیں، آپ اپنے آقا کو قتل کر کے از خود بادشاہ بن بیٹھے، اپنی ملکیت میں بہت ساری زمینیں آپ نے رکھی ہیں حالانکہ آپ مالک بن ہی نہیں سکتے، کیونکہ غلام کے اندر مالک بننے کی صلاحیت نہیں ہے، لہٰذا جب تک آپ اپنی اس حیثیت کی اصلاح نہیں کریں گے، میں اس وقت تک آپ کا کوئی منصب قبول نہیں کروں گا۔

اس زمانے میں بہرحال کچھ نہ کچھ خیر ہوا کرتی تھی، باوجودیکہ اپنے آقا کو قتل کرنے کا جرم کیا تھا، لیکن پھر بھی دل میں کچھ خدا کا خوف تھا، اور اللہ والوں کے کہنے کے انداز سے بھی دل پر اثر ہوتا ہے، اس بادشاہ نے کہا: بات تو آپ نے صحیح کہی، واقعی میں تو غلام ہوں، آپ مجھے کوئی ایسا راستہ بتادیجئے جس کے ذریعے میں اس غلامی سے نکل جاؤں۔ شیخ نے کہا کہ اس کا راستہ یہ ہوسکتا ہے کہ تم اور تمہارے سارے شہزادوں کو بازار میں کھڑا کر کے فروخت کیا جائے، اور جو قیمت وصول ہو وہ تمہارے مرحوم آقا کے ورثاء میں تقسیم کردیئے جائیں اور جو شخص تمہیں خریدے، وہ آزاد کردے، پھر تمہیں آزادی مل جائے گی اب اندازہ لگایئے بادشاہ کو یہ کہا جارہا ہے کہ تم کو اور بیٹوں کو بازار میں کھڑا کر کے بیچا جائے گا۔ قیمت لگائی جائے گی، نیلام ہوگا، اس کے بعد پھر تمہاری بادشاہت درست ہوگی،

لیکن چونکہ دل میں کچھ خوف خدا اور آخرت کی فکر تھی، اس لئے وہ بادشاہ اس پر راضی ہو گیا۔
چنانچہ تاریخ کا یہ منفرد واقعہ ہے کہ اس بادشاہ کو اور شہزادوں کو بازار میں کھڑا کر کے نیلام کیا گیا، بولی لگائی گئی، چنانچہ ایک شخص نے ان کو خرید کر پھر معاوضہ لے کر ان کو آزاد کیا، تب جا کر بادشاہ کی بادشاہت درست ہوئی۔ ہماری تاریخ کے اندر ایسی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں، جو دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آئیں گی۔ بہر حال جس طرح ایک غلام تخت کے اوپر بیٹھا ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں غلام ہوں، اسی طرح جب تم کسی منصب پر فائز ہو جاؤ تو ساتھ ساتھ دل میں یہ سمجھو کہ تم اللہ کے بندے ہو، اگر یہ حقیقت ذہن نشین رہے گی تو کبھی اس منصب پر بیٹھ کر دوسروں پر ظلم نہیں کر سکو گے۔

عبادت میں بھی تواضع ہونا چاہئے

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمادی اب نہ تو یہ کرو کہ اس نماز کو دوسروں کے سامنے بیان کرتے پھرو کہ میں نے نماز پڑھی تھی، اور نماز پڑھ کر میں تو بڑا بزرگ ہو گیا، جیسا کہ عربی کا محاورہ مشہور ہے:

"صَلَّى الْحَائِكُ رَكْعَتَيْنِ وَانْتَظَرَ الْوَحْيَ"

ایک جولاہے کو ایک مرتبہ دو رکعتیں نفل پڑھنے کا موقع مل گیا تھا، تو اس کے بعد وحی کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا، اس نے یہ سمجھا کہ میں نے جو عمل کیا ہے وہ اتنا بڑا اعلیٰ درجہ کا عمل ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہونی چاہئے لہٰذا نہ تو یہ کرو کہ اپنے عمل کو بہت بڑا سمجھ بیٹھو، اور اپنے لئے بڑے اعزاز تجویز کرنے لگو اور نہ اپنے عمل کو اتنا حقیر سمجھو جس سے ناشکری ہو جائے، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ میری نماز کیا، میں تو اُٹھک بیٹھک کرتا ہوں۔

ایسے الفاظ مت کہو، یہ نماز کی توہین ہے بلکہ یوں کہو کہ میں تو اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، اللہ جل جلالہ کا کرم ہے کہ انہوں نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی۔

اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی کسی عبادت کی توفیق ہو جائے تو دو کام کرو، ایک شکر ادا کرو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے اس عمل کی توفیق دے دی، ورنہ کتنے لوگ ہیں جن کو توفیق نہیں ہوتی، اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے توفیق دی، دوسرے استغفار کرو کہ جو کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں اس عمل میں ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے، ان شاء اللہ ان دو عمل کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسی عبادت کو قبول فرمالیں گے۔

کیفیات ہرگز مقصود نہیں

ہمارے دلوں میں ہر وقت یہ اشکال رہتا ہے کہ اتنے دن سے نماز پڑھ رہے ہیں، تسبیح بھی پڑھ رہے ہیں، ذکر بھی کر رہے ہیں، معمولات بھی ہیں، نفلیں بھی پڑھی ہیں، تہجد اور اشراق بھی پڑھ رہے ہیں، لیکن دل کی حالت میں تبدیلی کیوں نظر نہیں آرہی ہے، کوئی کیفیت کیوں پیدا نہیں ہورہی ہے؟ خوب سمجھ لو کہ یہ کیفیات ہرگز مقصود نہیں، اور جو کچھ عمل کی توفیق ہورہی ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی طرف سے انعام ہے، اور یہ جو فکر ہوتی ہے کہ یہ اعمال پتہ نہیں قبول ہوتے ہیں کہ نہیں، یہ خوف دل میں ہونا چاہئے، اور یہ سوچے کہ اپنی ذات میں تو یہ عمل اس قابل نہیں تھا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے لیکن جب اس نے اس عمل کی توفیق دے دی تو اس کی رحمت سے یہ بھی اُمید ہے کہ یہ عمل قبول ہوگا۔

عبادت کے قبول ہونے کی ایک علامت

حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ان سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت! اتنے دن سے نماز پڑھ رہا ہوں، معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوتی ہے کہ نہیں۔ حضرت نے جواب میں فرمایا: ارے بھئی! اگر یہ نماز قبول نہ ہوتی تو دوسری بار پڑھنے کی توفیق نہ ہوتی، جب تم نے ایک عمل کرلیا، اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہی عمل دوبارہ کرنے کی توفیق دے دی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ پہلا عمل قبول ہے ان شاء اللہ، اس وجہ سے نہیں کہ اس عمل کی کوئی خصوصیت تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے تمہیں توفیق دی، اس لئے اپنی نماز اور عبادتوں کو کبھی حقیر نہ سمجھو۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کردہ ایک واقعہ

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ بہت دنوں تک نمازیں پڑھتے رہے، روزے رکھتے رہے اور تسبیحات واذکار کرتے رہے، ایک دن دل میں یہ خیال آیا کہ میں اتنے عرصے سے یہ سب کچھ کر رہا ہوں، لیکن اللہ میاں کی طرف سے کوئی جواب وغیرہ تو آتا نہیں ہے معلوم نہیں، اللہ تعالیٰ کو یہ اعمال پسند ہیں یا نہیں؟ اس کی بارگاہ میں مقبول ہیں یا نہیں؟ آخر کار اپنے شیخ کے پاس جاکر عرض کیا کہ حضرت! اتنے دن سے عمل کر رہا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آتا۔ یہ سن کر شیخ نے فرمایا: ارے بیوقوف! یہ جو تمہیں اللہ اللہ کرنے کی توفیق ہورہی

ہے، یہ ہی ان کی طرف سے جواب ہے، اس لئے کہ اگر تمہارا عمل قبول نہ ہوتا، تو تمہیں اللہ اللہ کرنے کی توفیق نہ ہوتی، کسی اور جواب کے انتظار میں رہنے کی ضرورت نہیں

کہ گفت آں اللہ تو لبیک ماست
زیں نیاز و درد و سوزک ماست

یعنی یہ جو تو اللہ اللہ کررہا ہے یہ اللہ اللہ کرنا ہی ہماری طرف سے لبیک کہنا ہے، یہ تیرے اللہ اللہ کا جواب ہے کہ ایک مرتبہ کرنے کے بعد دوسری مرتبہ کرنے کی توفیق دے دی۔

ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ ایک مثال

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن کسی آدمی کے پاس جا کر اس کی تعریف کرو، اور اس کے بارے میں اچھے اچھے کلمات کہو، اور تم اگلے دن پھر جا کے اس کی تعریف کرو، اور اس کے بارے میں اچھے اچھے کلمات کہو، تیسرے دن پھر جا کر اس کے تعریفی کلمات کہو، اب اگر تمہارا یہ عمل اس شخص کو پسند ہوگا تو وہ تمہاری بات سنے گا، منع نہیں کرے گا، لیکن اگر تمہارا یہ عمل اس کو پسند نہیں ہوگا تو ایک مرتبہ کرو گے، دو مرتبہ کرو گے لیکن تیسری مرتبہ وہ تمہیں باہر نکال دے گا، اور تمہیں تعریف کرنے نہیں دے گا۔

اسی طرح جب تم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کیا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو جاری رکھا، اور تمہیں دوبارہ توفیق دی، تیسری بار توفیق دی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہارا یہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، یہی ٹوٹا پھوٹا عمل ان کے یہاں پسند ہے انشاء اللہ، لہٰذا اس کی ناقدری مت کرو، بلکہ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

ہمارے حضرت والا قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کرتے رہو، اور ہر عمل پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ! آپ نے اپنے فضل وکرم سے توفیق عطا فرمائی، آپ کا شکر ہے۔ میرے اندر تو کوئی طاقت ہی نہیں تھی۔ اور جب اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا خیال آئے، اس پر توبہ واستغفار کرلو، کہ یا اللہ! مجھ سے کوتاہیاں ہوئی ہیں، مجھے معاف فرمادیجئے۔ ایسا کرنے سے انشاء اللہ تواضع کا بھی حق ادا ہو جائے گا، شکر کا بھی حق ادا ہو جائے گا اور تکبر بھی پاس نہیں آئے گا۔

تواضع حاصل کرنے کا طریقہ

تواضع حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو یہ سمجھو کہ میں تو بندہ ہوں، اللہ تعالیٰ جو کچھ

میرے ذمہ میں لگادیں گے، وہ کام کروں گا۔ اب اگر وہ کہیں منصب پر بٹھادیں تو وہ کام کروں گا، میں ان کا بندہ ہوں، غلام ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عطا فرمایا ہے یہ محض ان کی عطا ہے، اس طرح کرنے سے شکر اور تواضع دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

اس لئے صوفیاء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ عارف جامع اضداد ہوتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ معرفت عطا فرمائیں وہ ایسی چیزوں کو جمع کرتا ہے جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہیں، مثلاً ایک طرف اپنے عمل کی تحقیر بھی نہیں کرنی اور دوسری طرف اس عمل پر عجب بھی نہیں کرنا، اور یہ سوچنا کہ میری نسبت سے یہ عمل حقیر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نسبت سے یہ عمل عظیم ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق کی نسبت سے یہ ان کا انعام ہے، یہ کرنے سے دونوں چیزیں جمع ہو جائیں گی۔

کثرت سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے

ہمارے حضرت بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں، آج تمہیں اس بات کی قدر نہیں ہوگی، جب کبھی اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق دیں گے، تب تمہیں قدر معلوم ہوگی، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر کثرت سے کیا کرو، اس لئے کہ جس قدر شکر کرو گے، امراضِ باطنہ کی جڑ کٹے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت وہ باتیں واقعی اتنی سمجھ میں نہیں آتی تھیں، اب تو کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہیں کہ یہ شکر ایسی دولت ہے جو بہت سے امراضِ باطنہ کا خاتمہ کرنے والی ہے۔ حضرت فرماتے تھے کہ میاں وہ ریاضتیں اور مجاہدے کہاں کرو گے، جو پہلے زمانے میں لوگ اپنے شیوخ کے پاس جا کر کیا کرتے تھے، رگڑے کھایا کرتے تھے، محنتیں کرتے تھے، مشقتیں اُٹھاتے تھے، بھوکے رہتے تھے، تمہارے پاس اتنا وقت کہاں؟ اور تمہارے پاس اتنی فرصت کہاں؟ بس، ایک کام کرلو۔ وہ یہ کہ کثرت سے شکر کرو، جتنا شکر کرو گے، انشاء اللہ تواضع پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تکبر دور ہوگا، امراضِ باطنہ دفع ہوں گے۔

شکر تواضع کا زینہ ہے

اور جب شکر کرو تو ذرا سوچ سمجھ کر شکر کرو کہ شکر کے معنی کیا ہیں؟ شکر کے معنی یہ ہیں کہ میں تو اس چیز کا مستحق نہیں تھا، مگر اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی، اسی کا نام تواضع ہے، اگر اپنے آپ کو مستحق سمجھا تو تواضع کیا ہوئی؟ پھر شکر کیا ہوا؟ اگر ایک آدمی ایک چیز کا مستحق ہو، اور اس کو وہ چیز دی جائے تو یہ شکر کا موقع نہیں ہے، مثلاً ایک آدمی نے کسی سے قرضہ لیا، تو مقروض پر واجب ہے کہ وہ قرض خواہ کو قرض لوٹائے، کیونکہ قرض خواہ اس رقم کا مستحق ہے، اب جب مقروض یہ رقم قرض خواہ کو

لوٹائے گا، اس وقت قرض خواہ پر کوئی شکر ادا کرنا واجب نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ رقم ادا کر کے مقروض نے کوئی احسان نہیں کیا، شکر تو اس وقت ہوتا جب انسان یہ سمجھے کہ میں اس چیز کا مستحق تو تھا نہیں، مجھے استحقاق سے زیادہ کوئی چیز دی گئی لہٰذا جب کسی نعمت پر شکر ادا کرو تو ذرا سوچ لیا کرو کہ یہ نعمت میرے استحقاق میں نہیں تھی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے عطاء فرمائی، بس یہ سوچ لو گے، انشاء اللہ تواضع حاصل ہو جائے گی۔ مثلاً کوئی منصب ملا، تو سوچ لو، یا اللہ! آپ کا کرم ہے، آپ نے دے دیا، میرے بس کا تو تھا نہیں، میرے اندر طاقت نہیں تھی، میرے اندر صلاحیت نہیں تھی، مگر آپ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے عطا فرمایا، بس یہ سوچ لیا، انشاء اللہ تواضع حاصل ہوگئی، اور جب تواضع حاصل ہو جائے گی تو اس پر حضور ﷺ کا وعدہ ہے:

((مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ))

''جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بلندی فرما دیتے ہیں''

خلاصۂ کلام

ایک بات اور سمجھ لیں، وہ یہ کہ تواضع اگرچہ دل کا عمل ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دل میں بے حقیقت سمجھے، لیکن دل میں یہ بات مستحضر رکھنے کے لئے آدمی عملاً یہ کرے کہ کسی بھی کام سے اپنے آپ کو بلند نہ سمجھے اور کسی بھی کام میں عار نہ ہو، یہ نہ سوچے کہ یہ کام میرے مرتبے کا نہیں بلکہ ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کے لئے بھی تیار رہے، دوسرے یہ کہ آدمی اپنی نشست و برخاست میں، اور انداز و ادا میں، چلنے پھرنے میں ایسا طریقہ اختیار کرے، جس میں تکبر نہ ہو، بلکہ عاجزی اور انکساری ہو، اگرچہ ساری تواضع اس پر منحصر نہیں، لیکن یہ بھی تواضع کے حصول کا ایک طریقہ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ظاہری افعال کے اندر بھی آدمی عاجزی اور انکساری اختیار کرے، اس لئے کہ اگر یہ کر لیا تو پھر انشاء اللہ دل میں بھی تواضع پیدا ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارے اندر بھی تواضع پیدا فرما دے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

توبہ
گناہوں کا تریاق ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

وَعَنِ الْاَغَرِّ الْمُزَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ((اِنَّهُ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ وَ اِنِّيْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ)) (۱)

''حضرت اغر مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا'' کبھی کبھی میرے دل پر بھی بادل سا آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اللہ جل جلالہ سے روزانہ سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی استغفار فرماتے ہیں

یہ کون فرما رہے ہیں؟ وہ ذات جن کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے پاک اور معصوم پیدا فرمایا، آپ سے کسی گناہ کا صادر ہونا ممکن ہی نہیں، اور اگر کبھی آپ سے کوئی بھول چوک ہوئی بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان فرمادیا گیا کہ آپ کی اگلی پچھلی سب بھول چوک ہماری طرف سے معاف ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ (۲)

''تاکہ اللہ آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کردے''

☆ اصلاحی خطبات (۶/۲۲ تا ۲۷)، ۳۱ دسمبر ۱۹۹۳ء، بروز جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والإستغفار، باب استحباب الإستغفار والاستکثار منه، رقم: ۴۸۷۰، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب الإستغفار، رقم: ۳۸۰۵، مسند أحمد، رقم: ۱۷۱۷۴ (۲) الفتح: ۲

اس کے باوجود حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ میں دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں اس حدیث کی تشریح میں علماء نے فرمایا کہ اس حدیث میں "سو" کا جو عدد آپ نے بیان فرمایا، اس سے گنتی بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ استغفار کی کثرت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

گناہوں کے وساوس سب کو آتے ہیں

پھر اس حدیث میں استغفار کرنے کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ میں اتنی کثرت سے استغفار اس لئے کرتا ہوں کہ کبھی کبھی میرے دل پر بھی بادل سا چھا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی بتقاضۂ بشریت ایک نبی کے دل میں بھی خیالات اور وساوس پیدا ہو سکتے ہیں۔ کوئی آدمی نیکی اور تقویٰ کے کتنے ہی بلند مقام پر پہنچ جائے، لیکن گناہوں کی جھلکیوں سے نہیں بچ سکتا۔ نبی کریم ﷺ کا مقام تو بہت اعلیٰ اور ارفع ہے، اس مقام تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا، لیکن جتنے اولیاء کرام، صوفیاء عظام، بزرگانِ دین گزرے ہیں، ان میں سے کوئی ایسا نہیں کہ ان کے دل میں گناہوں کا کبھی وسوسہ اور خیال بھی نہ آیا ہو، اور کوئی خواہش بھی پیدا نہ ہوئی ہو لہٰذا گناہوں کی جھلکیاں تو بڑوں بڑوں کو آتی ہیں۔ البتہ فرق یہ ہوتا ہے کہ ہم جیسے غافل لوگ تو گناہوں کی ذرا سی جھلکی پر ہتھیار ڈال دیتے ہیں، اور گناہ کا ارتکاب کر لیتے ہیں لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماتے ہیں، ان کو بھی گناہوں کے خیالات اور وساوس آتے ہیں۔ اور دل میں گناہوں کے ارادے پیدا ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل اور مجاہدے کی برکت سے وہ خیالات، وساوس اور ارادے کمزور ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ ارادے انسان پر غالب نہیں آتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ کا خیال آنے کے باوجود اس خیال پر عمل نہیں ہوتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا﴾(۱)

یعنی زلیخا نے گناہ کی دعوت دی تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی گناہ کا تھوڑا سا خیال آ گیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس گناہ سے محفوظ رکھا۔

ایک غلط خیال کا ازالہ

لہٰذا تصوف و طریقت کے بارے میں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس میں قدم رکھنے کے بعد رذائل اور گناہوں کا بالکل ازالہ ہو جائے گا۔ اور پھر گناہوں کا بالکل خیال ہی نہیں آئے گا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ مجاہدہ کرنے اور مشق کرنے کے نتیجے میں گناہوں کے تقاضے مغلوب اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان

(۱) یوسف: ۲٤

کا مقابلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس طریق میں بڑی کامیابی یہی ہے کہ گناہوں کے تقاضے مغلوب اور کمزور پڑ جائیں۔ اور انسان کے اُوپر غالب نہ آنے پائیں۔ لیکن یہ سوچنا کہ مجاہدہ کرنے کے بعد دل میں گناہوں کا خیال ہی نہیں آئے گا، یہ بات محال ہے، یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔

جوانی میں توبہ کیجئے

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں گناہ کا داعیہ اور تقاضا پیدا فرمایا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ (۱)

یعنی ہم نے انسان کے دل میں گناہ کا بھی تقاضہ پیدا کیا ہے اور تقویٰ کا تقاضہ بھی پیدا کیا ہے، اسی میں تو امتحان ہے۔ اس لئے کہ اگر انسان کے دل سے گناہ کا تقاضا بالکل ختم ہوجائے اور فنا ہوجائے، تو پھر گناہوں سے بچنے میں انسان کا کیا کمال ہوا؟ پھر نہ تو نفس سے مقابلہ ہوا، اور نہ شیطان سے مقابلہ ہوا، نہ ان سے معرکہ پیش آیا۔ تو پھر جنت کس کے بدلے ملے گی؟ اس لئے کہ جنت تو اسی بات کا انعام ہے کہ دل میں گناہوں کے تقاضے اور داعیے پیدا ہو رہے ہیں، لیکن انسان ان کو شکست دے کر اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت سے اور اللہ کی عظمت اور جلال سے ان تقاضوں پر عمل نہیں کرتا۔ تب جا کر انسان کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار

یعنی بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی متقی اور پرہیزگار بن جاتا ہے، اس لئے کہ اس وقت نہ منہ میں دانت رہے، اور نہ پیٹ میں آنت رہی، اب ظلم کرنے کی طاقت ہی نہیں ہے۔ اس لئے اب پرہیزگار نہیں بنے گا تو اور کیا بنے گا! لیکن پیغمبروں کا شیوہ یہ ہے کہ آدمی جوانی کے اندر توبہ کرے، جبکہ قوت اور طاقت موجود ہے۔ اور گناہوں کا تقاضہ بھی شدت سے پیدا ہو رہا ہے۔ اور گناہ کے مواقع بھی میسر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اللہ کے خوف سے آدمی گناہوں سے بچ جائے، یہ ہے پیغمبروں کا شیوہ۔

بزرگوں کی صحبت کا اثر

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کوئی اللہ والا ہم پر ایسی نظر ڈال دے اور اپنے سینے سے لگالے، اور سینے سے اپنے انوارات منتقل کردے اور اس کے نتیجے میں گناہ کا داعیہ ہی دل سے مٹ جائے۔ یاد

(۱) الشمس: ۸

رکھو، ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔ جو شخص اس خیال میں ہے وہ دھوکے میں ہے۔ اگر ایسا ہوجاتا تو پھر دنیا میں کوئی کافر باقی نہ رہتا، اس لئے کہ پھر تصرفات کے ذریعہ ساری دنیا مسلمان ہوجاتی۔

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کی خدمت میں ایک مرتبہ ایک صاحب حاضر ہوئے۔ اور کہا کہ حضرت، کچھ نصیحت فرمادیجئے۔ حضرت نے نصیحت فرمادی۔ پھر وہ صاحب رخصت ہوتے ہوئے کہنے لگے کہ حضرت! مجھے آپ اپنے سینے میں سے کچھ عطا فرمادیجئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ سینے میں سے کوئی نور نکل کر ہمارے سینے میں داخل ہوجائے، اور اس کے نتیجے میں بیڑہ پار ہوجائے اور گناہوں کی خواہش ختم ہوجائے حضرت نے جواب میں میں فرمایا کہ سینے میں سے کیا دوں، میرے سینے میں تو بلغم ہے۔ چاہئے تو لے لو۔ بہرحال یہ جو خیال ہے کہ کسی بزرگ کی نگاہ پڑ جائے گی، یا سینے میں سے کچھ مل جائے گا تو سب رذائل دور ہوجائیں گے۔ یہ خیال لغو ہے۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

البتہ اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی صحبت میں تاثیر ضرور رکھی ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کی فکر اور سوچ کا رخ بدل جاتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان صحیح راستے پر چل پڑتا ہے۔ مگر کام خود ہی کرنا ہوگا، اور اپنے اختیار سے کرنا ہوگا۔

ہر وقت نفس کی نگرانی ضروری ہے

بہرحال، گناہوں کے وساوس اور ارادوں کا بالکل خاتمہ نہیں ہوسکتا، چاہے کسی بڑے سے بڑے مقام تک پہنچ جائے، البتہ کمزور ضرور پڑ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص سالہا سال تک کسی بزرگ کی صحبت میں رہا، اور جو چیز بزرگوں کی صحبت میں حاصل کی جاتی ہے، وہ حاصل بھی ہوگئی، اور تکمیل بھی ہوگئی، اور دل میں خوف، خشیت اور تقویٰ پیدا ہوگیا، نسبت مع اللہ اور تعلق مع اللہ بھی حاصل ہوگیا، ان سب چیزوں کے حاصل ہوجانے کے باوجود انسان کو ہر ہر قدم پر اپنی نگرانی رکھنی پڑتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اب شیخ بن گئے، اور شیخ سے اجازت حاصل ہوگئی تو اب اپنے آپ سے، اپنے نفس سے غافل ہوگئے، اور یہ سوچا کہ اب تو ہم پہنچ گئے۔ اس مقام پر پہنچ گئے کہ اب تو نفس اور شیطان بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، یہ خیال بالکل غلط ہے، اس لئے کہ شیخ کی صحبت کی برکت سے اتنا ضرور ہوا کہ گناہ کا داعیہ کمزور پڑ گیا۔ لیکن نفس کی نگرانی پھر بھی ہر وقت رکھنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ کسی وقت بھی یہ داعیہ دوبارہ زندہ ہوکر انسان کو پریشان کرسکتا ہے، اس لئے فرمایا کہ۔

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راہ میں تراش وخراش ہمیشہ کی ہے، حتیٰ کہ آخری سانس آنے تک کسی وقت بھی غافل ہوکر مت بیٹھنا، اس لئے کہ یہ نفس کسی وقت بھی انسان کو دھوکہ دے سکتا ہے۔

ایک لکڑہارے کا قصہ

مثنوی میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک لکڑہارا تھا۔ جو جنگل سے جاکر لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتا تھا۔ اور ان کو بازار میں بیچ دیتا تھا، ایک مرتبہ جب لکڑیاں کاٹ کر لایا۔ لکڑیوں کے ساتھ ایک بڑا سانپ بھی لپٹ کر آگیا، اس کو پتہ نہیں چلا۔ لیکن جب گھر پہنچا تو تب اس نے دیکھا کہ ایک سانپ بھی آگیا ہے۔ البتہ اس میں جان نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ مردہ ہے، اس لئے اس لکڑہارے نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہیں گھر کے اندر ہی رہنے دیا۔ باہر نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، لیکن جب اس کو گرمی پہنچی تو اس کے اندر حرکت پیدا ہونی شروع ہوگئی، اور آہستہ آہستہ اس نے رینگنا شروع کردیا، لکڑہارا غفلت میں لیٹا ہوا تھا۔ اس سانپ نے جاکر اس کو ڈس لیا، اب گھر والے پریشان ہوئے کہ یہ تو مردہ سانپ تھا۔ کیسے زندہ ہوکر اس نے ڈس لیا؟

نفس بھی ایک اژدہا ہے

یہ قصہ نقل کرنے کے بعد مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کے نفس کا بھی یہی حال ہے۔ جب انسان کسی اللہ والے کی صحبت میں رہ کر مجاہدات اور ریاضتیں کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں یہ نفس کمزور ہوجاتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اب مردہ ہوچکا ہے، لیکن حقیقت میں وہ مردہ نہیں ہوتا۔ اگر انسان اس کی طرف سے غافل ہوجائے تو کسی بھی وقت زندہ ہوکر ڈس لے گا، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

نفس اژدہا است مردہ است
از غمِ بے آلتی افسردہ است

یعنی یہ انسان کا نفس بھی اژدہا کے مانند ہے، ابھی مرا نہیں ہے، لیکن چونکہ مجاہدے اور ریاضتیں کرنے کی چوٹیں اس پر پڑی ہیں، اس لئے یہ افسردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن کسی وقت بھی زندہ ہوکر ڈس لے گا۔ لہٰذا کسی لمحے بھی نفس سے غافل ہوکر مت بیٹھو۔

گناہوں کا تریاق ”استغفار“ اور توبہ

لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے نفس اور شیطان دو زہریلی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، جو انسان کو

پریشان اور خراب کرتی ہیں، اور جہنم کے عذاب کی طرف انسان کو لے جانا چاہتی ہیں۔اسی طرح ان دونوں کا تریاق بھی بڑا زبردست پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت سے یہ بات بعید تھی کہ زہر تو پیدا فرمادیتے اور اس کا تریاق پیدا نہ فرماتے، اور وہ تریاق اتنا زبردست پیدا فرمایا کہ فوراً اس زہر کا اثر ختم کردیتا ہے، وہ تریاق ہے "استغفار"، "توبہ"، لہٰذا جب بھی یہ نفس کا سانپ تمہیں ڈسے، یا اس کے ڈسنے کا اندیشہ ہو تو تم فوراً یہ تریاق استعمال کرتے ہوئے کہو:

"أَسْتَغْفِرُ اللهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ"

یہ تریاق اس زہر کا سارا اثر ختم کردے گا۔ بہرحال، جو بیماری یا زہر اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اس کا تریاق بھی پیدا فرمایا۔

قدرت کا عجیب کرشمہ

ایک مرتبہ میں جنوبی افریقہ میں کیپ ٹاؤن کے علاقے میں ریل گاڑی پر سفر کر رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ پہاڑی علاقے میں گاڑی رک گئی، ہم نماز کے لئے نیچے اترے، وہاں میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت پودا ہے، اس کے پتے بہت خوبصورت تھے اور وہ پودا بہت حسین وجمیل معلوم ہو رہا تھا۔ بے اختیار دل چاہا کہ اس کے پتے کو توڑ لیں۔ میں نے جیسے ہی اس کے پتے کو توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میرے جو رہنما تھے، وہ ایک دم زور سے چیخ پڑے کہ حضرت! اس کو ہاتھ مت لگائیے گا۔ میں نے پوچھا: کیوں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ بہت زہریلی جھاڑی ہے۔ اس کے پتے دیکھنے میں تو بہت خوشنما ہیں۔ لیکن یہ اتنا زہریلا ہے کہ اس کے چھونے سے انسان کے جسم میں زہر چڑھ جاتا ہے اور جس طرح بچھو کے ڈسنے سے زہر کی لہریں اُٹھتی ہیں، اسی طرح اس کے چھونے سے بھی لہریں اُٹھتی ہیں میں نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ اور پہلے سے معلوم ہوگیا۔ یہ تو بڑی خطرناک چیز ہے، دیکھنے میں بڑی خوبصورت ہے پھر میں نے ان سے کہا کہ یہ معاملہ تو بڑا خطرناک ہے۔ اس لئے کہ آپ نے مجھے تو بتادیا جس کی وجہ سے میں بچ گیا۔ لیکن اگر کوئی انجان آدمی جا کر اس کو ہاتھ لگادے، وہ تو مصیبت اور تکلیف میں مبتلا ہو جائے گا۔

اس پر انہوں نے اس سے بھی زیادہ عجیب بات بتائی۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ جہاں کہیں یہ زہریلی جھاڑی ہوتی ہے، اسی کی جڑ میں آس پاس لازماً ایک پودا اور ہوتا ہے، لہٰذا اگر کسی شخص کا ہاتھ اس زہریلے پودے پر لگ جائے تو وہ فوراً اس دوسرے پودے کے پتے کو ہاتھ لگادے۔ اسی وقت اس کا زہر ختم ہو جائے گا چنانچہ انہوں نے اسی کی جڑ میں وہ دوسرا پودا بھی دکھایا۔ یہ اس کا تریاق ہے۔

بس یہی مثال ہے ہمارے گناہوں کی اور استغفار و توبہ کی، لہٰذا جہاں کہیں گناہ کا زہر چڑھ جائے تو فوراً توبہ استغفار کا تریاق استعمال کرو۔ اسی وقت اس گناہ کا زہر اُتر جائے گا۔

خلیفۃ الارض کو تریاق دے کر بھیجا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر گناہ کی صلاحیت رکھی، اور پھر اس کو خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا، اور جس مخلوق میں گناہ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی، اس کو اپنا خلیفہ بنانے کا اہل بھی قرار نہیں دیا، یعنی فرشتے کہ ان کے اندر گناہ کرنے کی صلاحیت اور اہلیت موجود نہیں، تو وہ خلافت کے بھی اہل نہیں اور انسان کے اندر گناہ کی صلاحیت بھی رکھی، اور دنیا کے اندر بھیجنے سے پہلے نمونے اور مشق کے طور پر ایک غلطی بھی کروائی گئی، چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں بھیجا گیا تو یہ کہہ دیا گیا کہ پوری جنت میں جہاں چاہو جاؤ۔ جو چاہو کھاؤ۔ مگر اس درخت کو مت کھانا۔ اس کے بعد شیطان جنت میں پہنچ گیا۔ اور اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکا دیا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے اس درخت کو کھا لیا۔ اور غلطی سرزد ہوگئی یہ غلطی ان سے کروائی گئی، اس لئے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ لیکن غلطی کروانے کے بعد ان کے اندر پریشانی، شرمندگی پیدا ہوئی کہ یا اللہ مجھ سے کیسی غلطی ہوگئی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو چند کلمات سکھائے۔ اور ان سے فرمایا کہ اب تم یہ کلمات کہو:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾(۱)

قرآن کریم میں یہ فرمایا کہ ہم نے یہ کلمات حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے، یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تھا کہ یہ کلمات ان کو سکھائے بغیر اور ان سے کہلوائے بغیر ویسے ہی معاف فرما دیتے، اور ان سے کہہ دیتے کہ ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں؟ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ کرا کر ان کو بتا دیا کہ جس دنیا میں تم جارہے ہو، وہاں یہ سب کچھ ہوگا، وہاں بھی شیطان تمہارے پاس آئے گا، اور نفس بھی لگا ہوا ہوگا۔ اور کبھی تم سے کوئی گناہ کرائے گا۔ کبھی کوئی گناہ کرائے گا۔ اور تم جب تک ان کے لئے اپنے ساتھ تریاق لے کر نہیں جاؤ گے، اس وقت تک دنیا میں صحیح زندگی نہیں گزار سکو گے۔ وہ تریاق ہے ''استغفار اور توبہ'' لہٰذا غلطی اور استغفار دونوں چیزیں ان کو سکھا کر پھر فرمایا کہ اب دنیا میں جاؤ۔ اور یہ تریاق بھی بہت آسان ہے کہ زبان سے استغفار کرلے تو انشاء اللہ وہ گناہ معاف ہو جائے گا۔

---

(۱) الأعراف: ۲۳، اس قرآنی دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں گے''

''توبہ'' تین چیزوں کا مجموعہ

عام طور پر دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک ''استغفار'' اور ایک ''توبہ''، اصل ان میں سے ''توبہ'' ہے اور ''استغفار'' اس توبہ کی طرف جانے والا راستہ ہے، اور یہ ''توبہ'' تین چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جب تک یہ تین چیزیں جمع نہ ہوں، اس وقت تک توبہ کامل نہیں ہوتی۔ ایک یہ کہ جو غلطی اور گناہ سرزد ہوا ہے اس پر ندامت اور شرمندگی ہو، پشیمانی اور دل شکستگی ہو۔ دوسرے یہ کہ جو گناہ ہوا، اس کو فی الحال فوراً چھوڑ دے، اور تیسرے یہ کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کامل ہو، جب تین چیزیں جمع ہو جائیں، تب توبہ مکمل ہوتی ہے۔ اور جب توبہ کر لی تو وہ توبہ کرنے والا شخص گناہ سے پاک ہو گیا، حدیث شریف میں ہے:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهُ))(۱)

یعنی جس نے گناہ سے توبہ کر لی، وہ ایسا ہو گیا جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں، صرف یہ نہیں کہ اس کی توبہ قبول کر لی، اور نامۂ اعمال کے اندر یہ لکھ دیا کہ اس نے فلاں گناہ کیا تھا وہ گناہ معاف کر دیا گیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم دیکھئے کہ توبہ کرنے والے کے نامۂ اعمال ہی سے وہ گناہ مٹا دیتے ہیں، اور آخرت میں اس گناہ کا ذکر فکر بھی نہیں ہو گا کہ اس بندہ نے فلاں وقت میں فلاں گناہ کیا تھا۔

''کراماً کاتبین'' میں ایک امیر اور ایک مامور

میں نے ایک بات اپنے شیخ سے سنی، کسی کتاب میں نہیں دیکھی۔ وہ یہ کہ ہر انسان کے ساتھ یہ جو دو فرشتے ہیں۔ جن کو ''کراماً کاتبین'' کہا جاتا ہے، جو انسان کی نیکیاں اور برائیاں لکھتے ہیں، دائیں طرف والا فرشتہ نیکیاں لکھتا ہے، اور بائیں طرف والا فرشتہ برائیاں لکھتا ہے، تو میرے شیخ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دائیں طرف والے فرشتے کو بائیں طرف والے فرشتے کا امیر مقرر کیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جہاں کہیں دو آدمی مل کر کام کریں تو ان میں سے ایک امیر ہو اور دوسرا مامور ہو۔ لہٰذا جب انسان کوئی نیک عمل کرتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ فوراً اس نیکی کو لکھ لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو نیکی لکھنے میں دوسرے فرشتے سے پوچھنے کی حاجت اور ضرورت نہیں، کیونکہ وہ امیر ہے۔ اور بائیں طرف والا فرشتہ چونکہ دائیں طرف والے فرشتے کا ماتحت ہے، اس لئے جب بندہ کوئی گناہ اور غلطی کرتا ہے، تو بائیں طرف والا فرشتہ دائیں طرف والے فرشتے سے پوچھتا ہے کہ اس بندہ نے فلاں گناہ کیا ہے میں اس کو لکھوں یا نہیں؟ تو دائیں طرف والا فرشتہ کہتا ہے، نہیں، ابھی مت لکھو، ابھی

(۱) سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر التوبة، رقم: ٤٢٤٠

ٹھہر جاؤ، ہوسکتا ہے کہ یہ بندہ توبہ کرلے، اگر لکھ لو گے تو پھر مٹانا پڑے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر پوچھتا ہے کہ اب لکھ لوں! وہ کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ یہ توبہ کرلے، پھر جب تیسری مرتبہ یہ فرشتہ پوچھتا ہے، اور بندہ اس وقت تک توبہ نہیں کرتا تو اس وقت کہتا ہے کہ اب لکھ لو۔

صد بار گر توبہ شکستی......

اللہ تعالیٰ کی رحمت یہ ہے کہ بندہ کو گناہ کے بعد مہلت دیتے ہیں، کہ وہ گناہ سے توبہ کرلے، معافی مانگ لے۔ تاکہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھنا ہی نہ پڑے، لیکن کوئی شخص توبہ نہ کرے تو پھر لکھ دیا جاتا ہے، اور اس کے لکھنے کے بعد بھی مرتے دم تک دروازہ کھلا ہے کہ جب چاہو، توبہ کرلو، اس کو اپنے نامۂ اعمال سے مٹوالو۔ ایک مرتبہ جب سچے دل سے توبہ کرلو گے تو وہ گناہ تمہارے نامۂ اعمال سے مٹادیا جائے گا، اور جب تک نزع کی حالت اور غرغرہ کی حالت طاری نہ ہو، اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے، ''اللہ اکبر'' کیسے کریم اور رحیم کی بارگاہ ہے۔ فرمایا:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
از کفر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

اگر سو بار توبہ ٹوٹ گئی ہے، تو پھر توبہ کرلو، اور گناہ سے رک جاؤ۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔

رات کو سونے سے پہلے توبہ کرلیا کرو

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ بڑے عجیب وغریب بزرگ تھے۔ جن لوگوں نے ان کی زیارت کی ہے، وہ ان کے مقام سے واقف ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو عجیب فہم وفراست عطا فرمائی تھی۔ عجیب باتیں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ توبہ پر بیان فرما رہے تھے، میں بھی قریب میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے چٹکلے ہوا کرتے تھے۔ ایک آزاد منش نوجوان اس مجلس میں آگیا وہ اپنے کسی مقصد سے آیا تھا، مگر یہ اللہ والے تو ہر وقت سکھانے اور تربیت کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، چنانچہ اس نوجوان سے فرمانے لگے کہ میاں! لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ دین بڑا مشکل ہے، ارے یہ دین کچھ بھی مشکل نہیں، بس رات کو بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلیا کرو۔ بس یہی سارا دین ہے۔

گناہ کا اندیشہ عزم کے منافی نہیں

جب وہ نوجوان چلا گیا تو میں نے کہا کہ حضرت! یہ توبہ واقعی بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ لیکن دل میں ایک سوال رہتا ہے، جس کی وجہ سے بے چینی رہتی ہے۔ فرمانے لگے کہ کیا؟ میں نے کہا کہ حضرت! توبہ کی تین شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ دل میں ندامت ہو، دوسرے یہ کہ فوراً اس گناہ کو چھوڑ دے، تیسرے یہ کہ آئندہ کے لئے یہ عزم کرلے کہ آئندہ یہ گناہ کبھی نہیں کروں گا۔ ان میں سے پہلی دو باتوں پر تو عمل کرنا آسان ہے کہ گناہ پر ندامت بھی ہو جاتی ہے، اور اس گناہ کو اس وقت چھوڑ بھی دیا جاتا ہے لیکن تیسری شرط کہ یہ پختہ عزم کرنا کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا، یہ بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور پتہ نہیں چلتا کہ یہ پختہ عزم صحیح ہوا یا نہیں؟ اور جب عزم صحیح نہیں ہوا تو توبہ بھی صحیح نہیں ہوئی، اور جب توبہ صحیح نہیں ہوئی تو اس گناہ کے باقی رہنے اور اس کے معاف نہ ہونے کی پریشانی رہتی ہے۔

جواب میں حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جاؤ میاں، تم تو عزم کا مطلب بھی نہیں سمجھتے، عزم کا مطلب یہ ہے کہ اپنی طرف سے یہ ارادہ کرلو کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا، اب اگر یہ ارادہ کرتے وقت دل میں یہ دھڑکا اور اندیشہ لگا ہوا ہے کہ پتہ نہیں، میں اس عزم پر ثابت قدم رہ سکوں گا یا نہیں؟ تو اندیشہ اور دھڑکا اس عزم کے منافی نہیں۔ اور اس اندیشے اور خطرے کی وجہ سے توبہ میں کوئی نقص نہیں آتا، بشرطیکہ اپنی طرف سے پختہ ارادہ کرلیا ہو، اور دل میں یہ جو خطرہ لگا ہوا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرلو کہ یا اللہ! میں توبہ تو کر رہا ہوں، اور آئندہ نہ کرنے کا عزم تو کر رہا ہوں۔ لیکن میں کیا اور میرا عزم کیا؟ میں کمزور ہوں، معلوم نہیں کہ اس عزم پر ثابت قدم رہ سکوں گا یا نہیں؟ یا اللہ! آپ ہی مجھے اس عزم پر ثابت قدم فرما دیجئے۔ آپ ہی مجھے استقامت عطا فرمائیے۔ جب یہ دعا کرلی تو انشاء اللہ وہ خطرہ اور اندیشہ زائل ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت حضرت بابا صاحب نے یہ بات ارشاد فرمائی، اس کے بعد سے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی۔

مایوسی بھی ایک رکاوٹ ہے

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب تک تمہیں گناہوں سے ڈر لگتا ہو، اور گناہ کر کے دل میں ندامت پیدا ہوتی ہو، اس وقت تک مایوسی کا کوئی جواز نہیں۔ ہاں، یہ بات بڑی خطرناک ہے کہ دل سے گناہ کا ڈر مٹ جائے، اور گناہ کرنے کے بعد دل میں کوئی ندامت پیدا نہ ہو، اور انسان گناہ پر سینہ زوری

کرنے لگے، اور اس گناہ کو جائز کرنے کے لئے تاویلیں کرنا شروع کردے۔ البتہ جب تک دل میں ندامت پیدا ہوتی ہو، اس وقت تک مایوسی کا کوئی راستہ نہیں۔ ہمارے حضرت یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

سوی نومیدی مرو کہ امیدہا ست
سوی تاریکی مرو خورشیدہا ست

یعنی ناامیدی کی طرف مت جاؤ، کیونکہ امید کے راستے بیشمار ہیں۔ تاریکی کی طرف مت جاؤ کیونکہ بیشمار سورج موجود ہیں۔ لہٰذا توبہ کرلو تو گناہ سب ختم ہوجائیں گے۔

شیطان مایوسی پیدا کرتا ہے

اور جب تک اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھولا ہوا ہے تو پھر مایوسی کیسی؟ یہ جو بعض اوقات ہمارے دل میں خیال آتا ہے کہ ہم تو بڑے مردود ہوگئے ہیں، ہم سے عمل وغیرہ ہوتے نہیں ہیں، گناہوں میں مبتلا ہیں، اس خیال کے بعد مایوسی دل میں پیدا ہوجاتی ہے۔ یاد رکھو! یہ مایوسی پیدا کرنا بھی شیطان کا حربہ ہے، اس لئے کہ شیطان دل میں مایوسی پیدا کرکے انسان کو بے عمل بنانا چاہتا ہے ارے تم یہ دیکھو کہ جس بندہ کا مالک اتنا رحمٰن اور رحیم ہے کہ اس نے مرتے دم تک توبہ کا دروازہ کھول دیا ہے، اور یہ اعلان کردیا ہے کہ جو بندہ توبہ کرلے گا، اس کے گناہ نامۂ اعمال سے بھی مٹا دیں گے، کیا وہ بندہ پھر بھی مایوس ہوجائے؟ اس کو مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوکر استغفار کرے، اور توبہ کرے۔ سب گناہ معاف ہوجائیں گے۔

ایسی تیسی میرے گناہوں کی

ارے ان گناہوں کی کیا حقیقت ہے؟ توبہ کے ذریعے ایک منٹ میں سب اڑ جاتے ہیں، چاہے بڑے سے بڑے گناہ کیوں نہ ہوں۔ وہی حضرت بابا نجم احسن صاحب قدس اللہ سرہ، بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کے اشعار ہم جیسے لوگوں کے لئے بڑی تسلی کے شعر ہوتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

دولتیں مل گئی ہیں آہوں کی
ایسی تیسی میرے گناہوں کی

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آہوں کی دولت عطا فرمادی کہ دل ندامت سے سلگ رہا ہے، اور انسان اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہے، اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہے، اور ندامت کا اظہار کررہا

ہے تو پھر یہ گناہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے؟ لہٰذا جب توبہ کا راستہ کھلا ہوا ہے تو اب مایوسی کا یہاں گزر نہیں۔

استغفار کا درست مطلب

بہرحال، ''توبہ'' کے اندر تین چیزیں شرط ہیں، ان کے بغیر توبہ کامل نہیں ہوتی دوسری چیز ہے ''استغفار''۔ یہ ''استغفار'' توبہ کے مقابلے میں عام ہے۔ استغفار کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا مانگنا، اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگنا حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''استغفار'' کے اندر یہ تین چیزیں شرط نہیں، بلکہ استغفار ہر انسان ہر حالت میں کرسکتا ہے۔ جب کوئی غلطی ہوجائے یا دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہوجائے، یا عبادت میں کوتاہی ہوجائے، یا کسی بھی طرح کی کوئی غلطی سرزد ہوجائے، تو فوراً استغفار کرے اور کہے:

''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ.''

کیا ایسا شخص مایوس ہوجائے؟

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مؤمن کے لئے اصل راستہ تو یہ ہے کہ وہ توبہ کرے، اور تینوں شرائط کے ساتھ کرے، لیکن بعض اوقات ایک شخص بہت سے گناہ چھوڑ دیتا ہے۔ اور جن گناہوں میں مبتلا ہے، ان کو بھی چھوڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے، لیکن ایک گناہ ایسا رہ گیا، جس کو چھوڑنے پر کوشش کے باوجود وہ قادر نہیں ہورہا ہے، بلکہ حالات یا ماحول کی وجہ سے مغلوب ہے، اور اس گناہ کو چھوڑ نہیں پارہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسا شخص توبہ سے مایوس اور ناامید ہوکر بیٹھ جائے کہ میں اس کے چھوڑنے پر قادر نہیں، اس لئے میں تو تباہ ہوگیا۔

حرام روزگار والا شخص کیا کرے؟

مثلاً ایک شخص بینک میں ملازم ہے، اور بینک کی ملازمت ناجائز اور حرام ہے۔ لیکن اس لئے کہ سود کی آمدنی ہے۔ جب وہ دین کی طرف آیا، اور آہستہ آہستہ اس نے بہت سے گناہ چھوڑ دیئے، نماز، روزہ شروع کردیا۔ اور شریعت کے دوسرے احکام پر بھی عمل کرنا شروع کردیا۔ اب وہ دل سے تو یہ چاہتا ہے کہ میں اس حرام آمدنی سے بھی کسی طرح بچ جاؤں، اور بینک کی ملازمت چھوڑ دوں۔ لیکن اس کے بیوی بچے ہیں، ان کی معاش اور حقوق کی ذمہ داری بھی اس کے اوپر ہے، اب اگر وہ ملازمت چھوڑ کر الگ ہوجائے تو خطرہ اس بات کا ہے کہ پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہوجائے۔ جس کی وجہ سے وہ بینک کی ملازمت چھوڑنے پر قادر نہیں ہورہا ہے، البتہ دوسری جائز ملازمت کی تلاش میں بھی لگا ہوا

ہے (بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایسا شخص دوسری ملازمت اس طرح تلاش کرے، جس طرح ایک بے روزگار آدمی ملازمت تلاش کرتا ہے) تو کیا ایسا شخص مایوس ہو کر بیٹھ جائے؟ اس لئے کہ مجبوری کی وجہ سے ملازمت چھوڑ نہیں سکتا، جس کی وجہ سے چھوڑنے کا عزم بھی نہیں کر سکتا، جبکہ توبہ کے اندر چھوڑنے پر عزم کرنا شرط ہے، تو کیا ایسے مبتلا شخص کے لئے توبہ کا کوئی راستہ نہیں ہے؟

ایسا شخص توبہ نہیں، استغفار کرے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کے لئے بھی راستہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ سنجیدگی سے کوشش کرنے کے باوجود جب تک کوئی جائز اور حلال روزگار نہیں ملتا، اس وقت تک ملازمت نہ چھوڑے، لیکن ساتھ ساتھ اس پر استغفار بھی کرتا رہے۔ اس وقت توبہ نہیں کر سکتا، اس لئے کہ توبہ کے لئے گناہ کا چھوڑنا شرط ہے اور یہاں وہ ملازمت چھوڑنے پر قادر نہیں، اس لئے توبہ نہیں ہو سکتی، البتہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے، اور یہ کہے کہ یا اللہ! یہ کام تو غلط ہے، اور گناہ ہے، مجھے اس پر ندامت اور شرمندگی بھی ہے، لیکن یا اللہ! میں مجبور ہوں، اور اس کے چھوڑنے پر قادر نہیں ہو رہا ہوں، مجھے اپنی رحمت سے معاف فرما دیجئے، اور مجھے اس گناہ سے نکال دیجئے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی یہ کام کرے گا تو ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن آئندہ چل کر اس کو گناہ چھوڑنے کی توفیق ہو ہی جائے گی۔ اور ایک حدیث سے استدلال کیا، وہ یہ کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ))(۱)

یعنی جو شخص استغفار کرے، وہ اصرار کرنے والوں میں شمار نہیں ہوتا، اسی بات کو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝﴾(۲)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب فی دعاء النبی، رقم: ۳٤٨٢، سنن أبی داؤد، کتاب فی الاستغفار، رقم: ۱۲۹۳

(۲) آل عمران: ۱۳۵، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر کبھی کوئی بے حیائی کا کام کر بھی بیٹھتے ہیں یا (کسی اور طرح) اپنی جان پر ظلم کر گزرتے ہیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں.... اور اللہ کے سوا ہے بھی کون جو گناہوں کی معافی دے؟... اور یہ اپنے کئے پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے''

یعنی اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ اگر کبھی ان سے غلطی ہو جائے، یا اپنی جانوں پر ظلم کر لیں تو اس وقت وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کی مغفرت کرے اور جو گناہ انہوں نے کیا ہے، اس پر اصرار نہیں کرتے۔

اس لئے استغفار تو ہر حال میں کرتے رہنا چاہئے، اگر کسی گناہ کے چھوڑنے پر قدرت نہیں ہو رہی ہے، تب بھی استغفار نہ چھوڑے۔ بعض بزرگوں نے یہاں تک فرمایا کہ جس زمین پر گناہ اور غلطی سرزد ہوئی ہے، اسی زمین پر استغفار کر لے۔ تاکہ جس وقت وہ زمین تمہارے گناہ کی گواہی دے اس کے ساتھ وہ تمہارے استغفار کی بھی گواہی دے کہ اس بندہ نے ہمارے سامنے استغفار بھی کر لیا تھا۔

استغفار کے بہترین الفاظ

نبی کریم ﷺ پر قربان جایئے، آپ استغفار کے لئے ایسے ایسے الفاظ اُمت کو سکھا گئے کہ اگر کوئی انسان اپنے ذہن سے سوچ کر ان الفاظ تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتا تو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ فرمایا:

((رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ، وَاعْفُ عَنَّا وَتَكَرَّمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمْ، فَإِنَّكَ تَعْلَمُ مَا لَا نَعْلَمُ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ))(۱)

جب حضورِ اقدس ﷺ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کیا کرتے تھے، اس وقت آپ میلین اخضرین (سبز نشان) کے درمیان یہ دعا پڑھا کرتے تھے یعنی اے اللہ! میری مغفرت فرمایئے، اور مجھ پر رحم فرمایئے، اور میرے جو گناہ آپ کے علم میں ہیں، وہ سب معاف فرما دیجئے، اس لئے کہ آپ کے علم میں ہمارے وہ گناہ بھی ہیں، جن کا علم ہمیں بھی نہیں ہے، بیشک آپ ہی سب سے زیادہ معزز اور مکرم ہیں۔

دیکھئے! بہت سے گناہ ایسے ہوتے ہیں، جو حقیقت میں گناہ ہیں۔ لیکن ہمیں ان کے گناہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا، اور بعض اوقات علم نہیں ہوتا، اب کہاں تک انسان اپنے گناہوں کو شمار کر کے ان کا احاطہ کرے گا؟ اس لئے دعا میں فرما دیا کہ جتنے گناہ آپ کے علم میں ہیں، یا اللہ ان سب کو معاف فرما۔

''سیّد الاستغفار'' کو معمول بنایئے

بہتر یہ ہے کہ ''سید الاستغفار'' (استغفار کا سردار) کو یاد کر لیں۔ اور اسے پڑھا کریں۔ اس کا

(۱) إحياء علوم الدين (۷۳/۳)

معمول بنالیں:

((اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّيْ لَآ إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَأَنَا عَبْدُكَ وَأَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ. أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوْءُ لَكَ بِذَنْبِيْ، فَاغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ))(۱)

جس کا ترجمہ یہ ہے:

''یا اللہ! آپ میرے پروردگار ہیں۔ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ نے مجھے پیدا کیا، میں آپ کا بندہ ہوں، اور میں حتی الوسع آپ سے کیے ہوئے عہد اور وعدے پر قائم ہوں، میں نے جو کچھ کیا اس کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، آپ نے جو نعمتیں مجھے عطا فرمائیں انہیں لے کر آپ سے رجوع کرتا ہوں، اور اپنے گناہ سے بھی آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ لہٰذا میرے گناہ معاف فرمادیجئے۔ کیونکہ آپ کے سوا کوئی گناہ کی مغفرت نہیں کرتا''

حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص صبح کے وقت اس کو پورے یقین کے ساتھ پڑھے، تو اگر شام تک اس کا انتقال ہوگیا تو سیدھا جنت میں جائے گا، اور اگر کوئی شخص شام کے وقت پڑھ لے، اور صبح تک اس کا انتقال ہوگیا تو سیدھا جنت میں جائے گا لہٰذا صبح شام اس سیّد الاستغفار کے پڑھنے کا معمول بنالیں، بلکہ ہر نماز کے بعد اس کو ایک مرتبہ پڑھ لیا کریں، اس لئے کہ اس کو حضور اقدس ﷺ نے سیّد الاستغفار کا لقب دیا۔ یعنی یہ تمام استغفاروں کا سردار ہے۔ جب استغفار کے یہ کلمات اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو سکھا رہے ہیں، اور نبی کریم ﷺ اپنی اُمت کو سکھا رہے ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ اس استغفار کے ذریعہ اپنے بندوں کو نوازنا ہی چاہتے ہیں، اور مغفرت کرنا ہی چاہتے ہیں، اس لئے اس کو معمولات میں ضرور شامل کرلیں۔ اگر چاہیں تو استغفار کے مختصر الفاظ بھی یاد کرلیں، وہ یہ ہیں:

''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ''

اور اگر صرف ''استغفر اللہ'' ہی پڑھ لیا کریں تو بھی ٹھیک ہے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب أفضل الإستغفار، رقم: ۵۸۳۱، سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب منه، رقم: ۳۳۱۵، سنن النسائي، كتاب الإستعاذة، باب الإستعاذة من شر ما صنع، رقم: ۵۴۲۷، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب ما يقول إذا أصبح، رقم: ۴۴۰۸، سنن ابن ماجه، كتاب الدعاء، باب ما يدعو به الرجل إذا أصبح وإذا أمسى، رقم: ۳۸۶۲، مسند أحمد، رقم: ۱۶۴۸۸

توبہ اللہ کو محبوب ہے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَذَهَبَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِكُمْ وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ يُذْنِبُوْنَ فَيَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ تَعَالٰى فَيَغْفِرُ لَهُمْ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ (حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی بات زور دے کر تاکید اور اہتمام کے ساتھ بیان کرنی مقصود ہوتی تو قسم کھا کر وہ بات بیان فرماتے، اور قسم میں بھی یہ الفاظ فرماتے کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے) اگر تم بالکل گناہ نہ کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہارا وجود ختم کر دیں، اور ایسے لوگوں کو پیدا کریں جو گناہ کریں، اور پھر استغفار کریں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمادیں۔

انسان کے اندر گناہ کی صلاحیت پیدا کی

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ اگر انسان کی تخلیق سے یہ مقصود ہوتا کہ ہم ایسی مخلوق پیدا کریں، جس کے اندر گناہ کرنے کی صلاحیت ہی موجود نہ ہو، تو پھر انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، پھر تو فرشتے بھی کافی تھے۔ اس لئے کہ وہ ایسی مخلوق ہے جو ہر وقت طاعت اور عبادت ہی میں لگی رہتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس ہی میں مشغول رہتی ہے، اس میں گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، اگر گناہ کرنا چاہے تو بھی نہیں کر سکتی۔

لیکن انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے نیکی اور گناہ دونوں کی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اور پیشِ نظر یہ تھا کہ انسان میں گناہوں کی صلاحیت ہونے کے باوجود وہ گناہوں سے پرہیز کرے۔ اور اگر کبھی کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً استغفار کرے۔ اب اگر انسان یہ عمل نہ کرے تو اس کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر تو فرشتے ہی کافی تھے۔ چنانچہ جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جارہا تھا تو فرشتوں نے یہی کہا تھا کہ یہ آپ کونسی مخلوق پیدا فرما رہے ہیں، جو زمین پر خونریزی کرے گی، فساد مچائے گی، اور ہم آپ کی تسبیح و تقدیس میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا:

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب سقوط الذنب بالاستغفار توبة، رقم: ٤٩٣٦، مسند أحمد، رقم: ٧٧٣٦

﴿إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ﴾(۱)

''میں وہ باتیں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے''

یہ فرشتوں کا کمال نہیں

اس لئے کہ گناہ کی صلاحیت ہونے کے باوجود جب یہ مخلوق گناہوں سے اجتناب کرے گی تو یہ تم سے بھی آگے بڑھ جائے گی، اس لئے کہ تم جو گناہوں سے بچ رہے ہو، اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔ کیونکہ تمہارے اندر گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔

مثلاً ایک آدمی نابینا ہے، اس کو کچھ دکھائی نہیں دیتا، اگر وہ کسی غیر محرم کو نہ دیکھے، فلم نہ دیکھے، فحش قسم کی تصویر نہ دیکھے تو اس میں اس کا کیا کمال ہے؟ اس لئے کہ اس کے اندر دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں، وہ اگر دیکھنا بھی چاہے تو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن ایک شخص وہ ہے جس کی بینائی کامل ہے، ہر چیز دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور اس کے دل میں خواہشات، اُمنگیں اور شوق اُمڈ رہا ہے۔ لیکن اس سارے شوق اور اُمنگوں کے باوجود وہ اللہ کا بندہ ہونے کا تصور کر کے اپنی آنکھوں کو غلط جگہ پڑنے سے بچاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے جنت دینے کا وعدہ کیا ہے۔

جنت کی لذتیں صرف انسان کے لئے ہیں

خوب سمجھ لیجئے! فرشتے اگرچہ جنت میں رہیں، لیکن جنت کی لذتیں ان کے لئے نہیں، جنت کی راحتیں ان کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ ان کے اندر جنت کی لذتوں اور راحتوں کے ادراک کرنے کا مادہ ہی نہیں۔ جنت کی لذتیں اللہ تعالیٰ نے اسی مخلوق کے لئے پیدا فرمائی ہیں جس کے اندر گناہ کی بھی صلاحیت موجود ہے، اور نیکی کی بھی صلاحیت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور آپ کی مشیت میں کون دخل اندازی کر سکتا ہے، اس نے اپنی حکمتِ بالغہ ہی سے سارا جہاں اس لئے پیدا فرمایا تا کہ اس جہاں کے اندر ایسا انسان تخلیق کریں جس کے اندر گناہ کرنے کی بھی صلاحیت ہو، اور پھر وہ گناہ سے رکے۔ اور اگر کبھی بھول چوک اور بشریت کے تقاضے سے کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً وہ استغفار کرے۔ اور اس استغفار کرنے کے نتیجے میں وہ انسان اللہ تعالیٰ کی غفاری کا، اس کی ستاری کا، اور اس کے غفور رحیم ہونے کا مورد بنتا ہے۔ اب اگر گناہ ہی نہ ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ کی غفاری کہاں ظاہر ہوتی؟

---

(۱) البقرة: ۳۰

کفر بھی حکمت سے خالی نہیں

بزرگوں نے فرمایا کہ اس کائنات میں کوئی چیز حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ۔حتیٰ کہ کفر بھی حکمت سے خالی نہیں، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

در کارخانۂ عشق ہم کفر ناگزیر است
آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

یعنی اس کارخانے میں کفر کی بھی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر بولہب نہ ہوتا، یعنی کافر نہ ہوتا تو جہنم کی آگ کس کو جلاتی؟ لہٰذا گناہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ایک حصہ ہے، اور اس گناہ کی خواہش بندہ کے اندر اس لئے پیدا کی گئی، تاکہ بندہ اس خواہش کو کچلے اور اس کو جلائے، کیونکہ بندہ اس خواہش کو جتنا کچلے گا، جتنا جلائے گا، اتنا ہی اس کا تقویٰ کامل ہوگا، اور تقویٰ کا نور اس کو حاصل ہوگا۔

دنیا کی شہوتیں اور گناہ ایندھن ہیں

اللہ تعالیٰ نے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کو مثال دینے میں کمال عطا فرمایا تھا۔ آپ مثال دینے میں امام تھے۔ فرماتے ہیں کہ۔

شہوت دنیا مثال گلخن است
کہ ازو حمام تقوی روشن است

یعنی یہ دنیا کی شہوتیں، لذتیں اور گناہ اس لحاظ سے بڑے کام کی چیزیں ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایندھن عطا کیا ہے۔ تاکہ تم اس ایندھن کو جلا کر تقویٰ کا حمام روشن کرسکو۔ اس لئے کہ تقویٰ کا حمام اسی ایندھن کے ذریعہ روشن ہوگا لہٰذا جس وقت گناہ کی بھرپور خواہش پیدا ہورہی ہو، گناہ کا تقاضہ دل میں موجیں مار رہا ہو، دل مچل رہا ہو، بیتاب ہورہا ہو۔ اس وقت تم اس خواہش اور اس تقاضے کو اللہ تعالیٰ کے لئے کچل دو۔ جب اس کو کچل دو گے، اور جلا دو گے تو اس کے ذریعہ تقویٰ کا حمام روشن ہوگا۔ اور تقویٰ کا نور حاصل ہوگا اب اگر یہ گناہ کا تقاضہ ہی نہ ہوتا تو تمہیں اس حمام کو روشن کرنے کا یہ ایندھن کہاں سے حاصل ہوتا؟

ایمان کی حلاوت

حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص کے دل میں نامحرم پر نگاہ ڈالنے کا تقاضا اور شوق پیدا ہوا، لیکن اس اللہ کے بندے نے اس شوق اور تقاضے کے باوجود اس نگاہ کو نامحرم پر ڈالنے سے روک لیا۔

اور یہ سوچا کہ میرے اللہ اور میرے مالک نے اس عمل سے منع فرمایا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے اس تقاضے کو روک لے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی ایسی حلاوت عطا فرمائیں گے کہ اگر وہ نظر ڈال لیتا تو اس کو ایسی حلاوت حاصل نہ ہوتی، جو اللہ تعالیٰ اس کو نظر نہ ڈالنے کی وجہ سے ایمان کی حلاوت عطا فرمائیں گے۔ دیکھئے! یہی گناہ کا تقاضہ ایمان کی حلاوت حاصل ہونے کا ذریعہ بن گیا، اگر یہ گناہ کا تقاضہ اور داعیہ نہ ہوتا تو ایمان کی حلاوت حاصل نہ ہوتی۔

گناہ پیدا کرنے کی حکمت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو بندہ سے گناہ کرانا نہیں تو پھر اس گناہ کو پیدا ہی کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس گناہ کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی دو حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ ایک مصلحت تو یہ ہے کہ جب بندہ پوری کوشش کر کے اس گناہ سے بچنے کا اہتمام کرے گا تو اس کو تقویٰ کا نور حاصل ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا، کیونکہ انسان جتنا جتنا گناہ سے دور ہوتا جائے گا، اسی اعتبار سے اس کے درجات میں ترقی ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾ (۱)

”جو شخص اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے نئے نئے راستے پیدا فرمائیں گے“

توبہ کے ذریعہ درجات کی بلندی

لیکن اپنی پوری کوشش اور اہتمام کے باوجود بتقاضۂ بشریت انسان کسی جگہ پھسل گیا، اور گناہ کر لیا۔ تو جب اس گناہ پر وہ استغفار کرے گا اور ندامت اور شرمندگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوگا، اور یہ کہے گا:

”أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ“

یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف فرما۔ تو اب اس ندامت اور توبہ کے نتیجے میں اس کے درجات اور زیادہ بلند ہو جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کی غفاری اور ستاری کا مظہر بنے گا۔

یہ باتیں بہت نازک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو غلط سمجھنے سے ہماری حفاظت فرمائے۔ یاد رکھو، گناہ پر کبھی جرات نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر گناہ ہو جائے تو پھر مایوس بھی نہ ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے توبہ اور استغفار کے راستے اسی لئے رکھے ہیں تاکہ انسان مایوس نہ ہو۔

لہٰذا اگر کبھی گناہ سرزد ہو جائے اور اس کے بعد دل میں ندامت کی آگ بھڑک اٹھے اور اس

---

(۱) الطلاق: ۳

ندامت کے نتیجے میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، توبہ کرے، اللہ تعالیٰ کے سامنے روئے، گڑگڑائے۔ تو اس رونے اور گڑگڑانے کے نتیجے میں بعض اوقات اس کو وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ گناہ نہ کرتا تو اس مقام تک نہ پہنچ سکتا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روزانہ تہجد کی نماز کے لئے اُٹھا کرتے تھے۔ ایک دن تہجد کے وقت آنکھ نہ کھلی، حتیٰ کہ تہجد کا وقت نکل گیا۔ چونکہ اس سے پہلے کبھی تہجد کی نماز نہیں چھوٹی تھی، پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ تہجد کی نماز چھوٹ گئی، چنانچہ اس کی وجہ سے ان کو اس قدر ندامت اور رنج ہوا کہ سارا دن روتے روتے گزار دیا کہ یا اللہ! مجھ سے آج تہجد کی نماز چھوٹ گئی جب اگلی رات کو سوئے تو تہجد کے وقت ایک بزرگوار نے تشریف لا کر آپ کو تہجد کی نماز کے لئے جگانا شروع کر دیا کہ اُٹھ کر تہجد پڑھ لو۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فوراً اُٹھ گئے، اور اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور یہاں کیسے آئے؟ اس نے جواب دیا کہ میں وہی بدنام زمانہ ابلیس اور شیطان ہوں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تمہارا کام تو انسان کو غفلت میں مبتلا کرنا ہے۔ نماز کے لئے اُٹھانے سے تمہارا کیا کام؟ شیطان نے کہا: اس سے بحث مت کرو، جاؤ، تہجد پڑھو، اور اپنا کام کرو۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، پہلے بتاؤ کیا وجہ ہے؟ مجھے کیوں اُٹھا رہے تھے؟ جب تک نہیں بتاؤ گے، میں نہیں چھوڑوں گا۔ جب بہت اصرار کیا تو شیطان نے بتایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ گذشتہ رات آپ پر میں نے غفلت طاری کر دی تھی، تا کہ آپ کی تہجد کی نماز فوت ہو جائے، چنانچہ آپ کی تہجد کی نماز فوت ہو گئی، لیکن تہجد چھوٹ جانے کے نتیجے میں آپ نے سارا دن روتے روتے گزار دیا۔ اور اس رونے کے نتیجے میں آپ کے اتنے درجات بلند ہو گئے کہ اگر آپ اُٹھ کر تہجد پڑھ لیتے تو آپ کے درجات اتنے بلند نہ ہوتے۔ یہ تو بہت خسارے کا سودا ہوا، اس لئے میں نے سوچا کہ آج آپ کو اُٹھا دوں، تا کہ اور زیادہ درجات کی بلندی کا راستہ پیدا نہ ہو۔

ورنہ دوسری مخلوق پیدا کر دیں گے

اس لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر انسان سچے دل سے توبہ اور استغفار کرے، اور اللہ تعالیٰ کے حضور ندامت اور شکستگی کے ساتھ حاضر ہو جائے تو بعض اوقات اس میں انسان کے درجات اتنے زیادہ بلند ہو جاتے ہیں کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہ توبہ و استغفار بڑی عظیم چیز ہے۔ اسی لئے اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ گر ساری مخلوق بالکل گناہ ترک کر دے، تو

اللہ تعالیٰ دوسری مخلوق پیدا فرما دیں گے جو گناہ کرے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ اور استغفار کرے گی تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرمادیں گے۔

بہرحال، اس حدیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں عملی تعلیم یہ دی ہے کہ اگر کبھی غلطی ہو جائے تو مایوس مت ہو جاؤ۔ بلکہ توبہ و استغفار کی طرف رجوع کرو البتہ اپنی طرف سے گناہ کا اقدام مت کرو، بلکہ گناہ سے بچنے کی پوری کوشش کرو، لیکن اگر گناہ ہو جائے تو توبہ و استغفار کرلو۔

گناہ سے بچنا فرضِ عین ہے

بعض اوقات دل میں خیال ہوتا ہے کہ پھر تو گناہ چھوڑنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ گناہ بھی کرتے رہو، اور استغفار اور توبہ بھی کرتے رہو خوب سمجھ لیجئے کہ گناہ سے بچنا ہر انسان کے ذمے فرضِ عین ہے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر گوشۂ زندگی میں ہر وقت اپنے آپ کو گناہ سے بچائے، لیکن اگر بتقاضۂ بشریت کبھی گناہ سرزد ہو جائے تو مایوس نہ ہو، بلکہ توبہ کرلے یا اگر کوئی شخص کسی گناہ میں مبتلا ہے، اور اس کے لئے کسی وجہ سے اس کو چھوڑنا ممکن نہیں ہے، مثلاً بینک کی ملازمت میں مبتلا ہے، تو اس صورت میں وہ دوسری ملازمت اس طرح تلاش کرے جیسے ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، لیکن ساتھ میں وہ توبہ و استغفار بھی کرتا رہے۔

بیماری کے ذریعہ درجات کی بلندی

آپ نے یہ حدیث سنی ہوگی کہ جب انسان بیمار ہوتا ہے تو بیماری سے گناہ معاف ہوتے ہیں، اور اس کے ذریعہ درجات بلند ہوتے ہیں، اور بیماری جتنی زیادہ شدید ہوگی، اتنے ہی انسان کے درجات زیادہ بلند ہوں گے۔ لیکن کیا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے بیماری مانگے؟ یا کوشش کرکے بیمار پڑے؟ تاکہ جب میں بیمار ہوں گا تو میرے گناہ معاف ہوں گے، اور میرے درجات بلند ہوں گے ظاہر ہے کہ بیماری ایسی چیز نہیں جس کو مانگا جائے۔ اور جس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، جس کی تمنا کی جائے۔ بلکہ حدیث میں خود حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، کبھی بیماری مت مانگو، لیکن اگر غیر اختیاری طور پر بیماری آجائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھو اور یہ سوچو کہ اس کے ذریعہ ہمارے گناہ معاف ہو رہے ہیں، اور ہمارے درجات بلند ہو رہے ہیں بالکل اسی طرح گناہ بھی کرنے کی چیز نہیں، بلکہ باز رہنے کی چیز ہے۔ اجتناب کرنے کی چیز ہے۔ لیکن کبھی حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر گناہ ہو گیا تو پھر انسان توبہ و استغفار کی طرف رجوع کرے، تو اس کے نتیجے میں اس کے درجات بلند ہوں گے، یہ ہے استغفار کی حقیقت۔

توبہ اور استغفار کی تین قسمیں

توبہ اور استغفار کی تین قسمیں ہیں:

(۱) ایک گناہوں سے توبہ و استغفار

(۲) دوسرے طاعت اور عبادات میں ہونے والی کوتاہیوں سے استغفار

(۳) تیسرے خود استغفار سے استغفار، یعنی استغفار کا بھی حق ادا نہیں کر سکے، اس سے بھی ہم استغفار کرتے ہیں۔

تکمیلِ توبہ

پہلی قسم یعنی گناہوں سے استغفار کرنا ہر انسان پر فرضِ عین ہے۔ کوئی انسان اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ہر انسان اپنے سابقہ گناہوں سے استغفار کرے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف اور طریقت میں سب سے پہلا قدم "تکمیلِ توبہ" ہے۔ اگلے تمام درجات "تکمیلِ توبہ" پر موقوف ہیں۔ جب تک توبہ کی تکمیل نہیں ہوگی آگے کچھ نہیں ہوگا، چنانچہ جب کوئی شخص اپنی اصلاح کے لئے کسی بزرگ کے پاس جاتا ہے تو وہ بزرگ سب سے پہلے توبہ کی تکمیل کراتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"هو أول اقدام المريدين"

یعنی جو شخص کسی شیخ کے پاس مرید ہونے کے لئے جائے تو اس کا سب سے پہلا کام تکمیلِ توبہ ہے، اور شیخ کے ہاتھ پر جو بیعت کی جاتی ہے، وہ بھی درحقیقت توبہ ہی کی بیعت ہوتی ہے، بیعت کے وقت مرید اپنے پچھلے گناہوں سے توبہ کرتا ہے۔ اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم اور عہد کرتا ہے، اس کے بعد شیخ اس کی توبہ کی تکمیل کراتا ہے۔

توبہ اجمالی

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ تکمیلِ توبہ کے دو درجے ہیں، ایک "توبہ اجمالی" اور دوسری "توبہ تفصیلی"۔ "توبہ اجمالی" یہ ہے کہ انسان ایک مرتبہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنی پچھلی زندگی کے تمام گناہوں کو اجمالی طور پر یاد کر کے دھیان میں لاکر ان سب سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرے۔ "توبہ اجمالی" کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے صلاۃ التوبہ کی نیت سے دو رکعت نماز پڑھے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی، انکساری، ندامت اور شرمندگی اور الحاح وزاری کے ساتھ ایک ایک گناہ کو یاد کر کے یہ دعا کرے کہ یا اللہ! اب تک میری پچھلی زندگی میں مجھ سے جو کچھ گناہ ہوئے ہیں، چاہے وہ

ظاہری گناہ ہوں یا باطنی، حقوق اللہ سے متعلق ہوئے ہوں، یا حقوق العباد سے متعلق ہوئے ہوں، چھوٹے گناہ ہوئے ہوں، یا بڑے گناہ ہوئے ہوں۔ یا اللہ! میں ان سب سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ توبہ اجمالی ہوئی.

توبہ تفصیلی

لیکن توبہ اجمالی کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اب بالکل پاک صاف ہو گئے، اب کچھ نہیں کرنا۔ بلکہ اس کے بعد توبہ تفصیلی ضروری ہے، وہ اس طرح کہ جن گناہوں کی تلافی ممکن ہے، ان کی تلافی کرنا شروع کردے۔ جب تک انسان ان کی تلافی نہیں کرے گا، اس وقت تک اس کی توبہ کامل نہیں ہوگی، مثلاً فرض نمازیں چھوٹ گئی تھیں۔ اب جب نمازیں چھوٹ جانے کا خیال آیا تو اب توبہ کرلی، لیکن زندگی کے اندر موت سے پہلے ان نمازوں کو قضاء کرنا واجب ہے، اور اگر توبہ کرکے اطمینان سے بیٹھ گیا، اور نمازوں کی قضاء نہیں کی، تو اس صورت میں توبہ کامل نہیں ہوئی، اس لئے کہ جن گناہوں کی تلافی ممکن تھی، ان کی تلافی نہیں کی، لہٰذا اصلاح کے اندر سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ توبہ کی تکمیل کرے، جب تک یہ نہیں کرے گا، اس وقت تک اصلاح ممکن نہیں۔

نماز کا حساب لگائے

توبہ تفصیلی کے اندر سب سے پہلا معاملہ نماز کا ہے، بالغ ہونے کے بعد سے اب تک جتنی نمازیں قضاء ہوئی ہیں، ان کا حساب لگائے بالغ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکا اس وقت بالغ ہوتا ہے جب اس کو احتلام ہو۔ اور لڑکی اس وقت بالغ ہوتی ہے جب اس کو حیض آنا شروع ہو جائے، لیکن اگر کسی کے اندر یہ علامتیں ظاہر نہ ہوں تو اس صورت میں جس دن پندرہ سال عمر ہو جائے اس وقت وہ بالغ ہو جاتا ہے۔ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی ہو، اس دن سے اس کو بالغ سمجھا جائے گا۔ اس دن سے اس پر نماز بھی فرض ہے، روزے بھی فرض ہیں۔ اور دوسرے فرائضِ دینیہ بھی اس پر لاگو ہو جائیں گے

لہٰذا انسان سب سے پہلے یہ حساب لگائے کہ جب سے میں بالغ ہوا ہوں، اس وقت سے اب تک کتنی نمازیں چھوٹ گئی ہیں بہت سے لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اور بچپن ہی سے ماں باپ نے نماز پڑھنے کی عادت ڈال دی۔ جس کی وجہ سے بالغ ہونے کے بعد سے اب تک کوئی نماز قضاء ہی نہیں ہوئی۔ اگر ایسی صورت ہے تو سبحان اللہ۔ اور ایک مسلمان گھرانے میں ایسا ہی ہونا چاہئے، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کی تلقین کرو۔ اور جب بچہ دس سال کا ہو جائے تو اس کو مار کر نماز پڑھواؤ[1] لیکن

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، رقم: ٤١٨، مسند أحمد، رقم: ٦٥٠٢

اگر بالفرض بالغ ہونے کے بعد غفلت کی وجہ سے نمازیں چھوٹ گئیں، تو ان کی تلافی کرنا فرض ہے۔

تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لے کر یاد کرے کہ میرے ذمے کتنی نمازیں باقی ہیں۔ اگر ٹھیک ٹھیک حساب لگانا ممکن ہو تو ٹھیک ٹھیک حساب لگالے، لیکن اگر ٹھیک ٹھیک حساب لگانا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں ایک محتاط اندازہ کر کے اس طرح حساب لگائے کہ اس میں نمازیں کچھ زیادہ تو ہو جائیں، لیکن کم نہ ہوں۔ اور پھر اس کو ایک کاپی میں لکھ لے کہ "آج اس تاریخ میرے ذمے اتنی نمازیں فرض ہیں اور آج سے میں ان کو ادا کرنا شروع کر رہا ہوں، اور اگر میں اپنی زندگی میں ان نمازوں کو ادا نہ کر سکا تو میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے ترکے سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے"

ایک وصیت نامہ لکھ لے

یہ وصیت لکھنا اس لئے ضروری ہے کہ گر آپ نے یہ وصیت نہیں لکھی، اور قضاء نمازوں کو ادا کرنے سے پہلے آپ کا انتقال ہو گیا تو اس صورت میں ورثاء کے ذمے شرعاً یہ ضروری نہیں ہوگا کہ آپ کی نمازوں کا فدیہ ادا کریں۔ یہ فدیہ ادا کرنا ان کی مرضی پر موقوف ہوگا، چاہیں تو دیں اور چاہیں تو نہ دیں۔ اگر فدیہ ادا کریں گے تو یہ ان کا احسان ہوگا۔ شرعاً ان کے ذمے فرض و واجب نہیں لیکن اگر آپ نے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کر دی تو اس صورت میں ورثاء شرعاً اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ کل مال کے ایک تہائی ترکہ کی حد تک اس وصیت کو نافذ کریں، اور نمازوں کا فدیہ ادا کریں۔

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ "ہر وہ شخص جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اور اس کے پاس کوئی بات وصیت لکھنے کے لئے موجود ہو تو اس کے لئے دو راتیں بھی وصیت لکھے بغیر گزارنا جائز نہیں"۔(۱)

لہٰذا اگر کسی کے ذمے نمازیں قضاء ہیں تو اس حدیث کی روشنی میں اس کو وصیت لکھنا ضروری ہے۔ اب ہم لوگوں کو ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہئے کہ ہم میں سے کتنے لوگوں نے اپنا وصیت نامہ لکھ کر رکھا ہوا ہے، حالانکہ وصیت نامہ نہ لکھنا ایک مستقل گناہ ہے۔ جب تک وصیت نامہ نہیں لکھے گا، اس وقت تک یہ گناہ ہوتا رہے گا۔ اس لئے فوراً آج ہی ہم لوگوں کو اپنا وصیت نامہ لکھ لینا چاہئے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الوصایا، باب الوصایا، رقم: ۲۵۳۳، صحیح مسلم، کتاب الوصیة، باب، رقم: ۳۰۷۴، سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی الحث علی الوصیة، رقم: ۸۹۶، سنن النسائی، کتاب الوصایا، باب الکراھیة فی تأخیر الوصیة، رقم: ۳۵۵۷، سنن أبی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء في ما یؤمر به من الوصیة، رقم: ۲٤۷۸، سنن ابن ماجه، کتاب الوصایا، باب الحث علی الوصیة، رقم: ۲٦۹۰، مسند أحمد، رقم: ٤۲۳۹

”قضاءِ عمری“ کی ادائیگی

اس کے بعد ان قضاء نمازوں کو ادا کرنا شروع کر دے۔ ان کو ”قضاءِ عمری“ بھی کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر وقتی نماز کے ساتھ ایک نماز قضاء بھی پڑھ لے، اور اگر کسی کے پاس وقت زیادہ ہو تو ایک سے زیادہ بھی پڑھ سکتا ہے، تاکہ جتنی جلدی یہ نمازیں پوری ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔ بلکہ وقتی نمازوں کے ساتھ جو نوافل ہوتے ہیں، ان کے بجائے قضاء نماز پڑھ لے، اور نمازِ فجر کے بعد اور عصر کی نماز کے بعد نفلی نماز پڑھنا تو جائز نہیں، لیکن قضاء نماز پڑھنا جائز ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اتنی آسانی فرما دی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس آسانی سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور جتنی نمازیں ادا کرتے جائیں، اس کاپی میں ساتھ ہی ساتھ لکھتے جائیں کہ اتنی ادا کرلیں، اتنی باقی ہیں۔

سنتوں کے بجائے قضاء نماز پڑھنا درست نہیں

بعض لوگ یہ مسئلہ پوچھتے ہیں کہ چونکہ ہمارے ذمے قضاء نمازیں بہت باقی ہیں تو کیا ہم سنتیں پڑھنے کے بجائے قضاء پڑھ سکتے ہیں؟ تاکہ قضاء نمازیں جلد پوری ہو جائیں اس کا جواب یہ ہے کہ سنتِ موکدہ پڑھنی چاہئے، ان کو چھوڑنا درست نہیں۔ البتہ نوافل کے بجائے قضاء نمازیں پڑھنا جائز ہے۔

قضاء روزوں کا حساب اور وصیت

اسی طرح روزوں کا جائزہ لیں، جب سے بالغ ہوئے ہیں، اس وقت سے اب تک روزے چھوٹے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں چھوٹے تو بہت اچھا، اگر چھوٹ گئے ہیں تو ان کا حساب لگا کر اپنے پاس وصیت نامہ کی کاپی میں لکھ لیں کہ آج فلاں تاریخ کو میرے ذمے اتنے روزے باقی ہیں۔ میں ان کی ادائیگی شروع کر رہا ہوں۔ اگر میں اپنی زندگی میں ان کو ادا نہیں کر سکا تو میرے مرنے کے بعد میرے ترکہ میں سے ان روزوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے۔ اس کے بعد جتنے روزے ادا کرتے جائیں، اس وصیت نامہ کی کاپی میں لکھتے جائیں کہ اتنے روزے ادا کر لیے اتنے باقی ہیں، تاکہ حساب صاف رہے۔

واجب زکوٰۃ کا حساب اور وصیت

اسی طرح زکوٰۃ کا جائزہ لیں، بالغ ہونے کے بعد زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بالغ ہونے کے بعد اگر اپنی ملکیت میں قابلِ زکوٰۃ اشیاء تھیں، اور ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی، تو اب تک جتنے سال گزرے ہیں، ہر سال کی علیحدہ علیحدہ زکوٰۃ نکالیں، اور اس کا باقاعدہ حساب لگائیں۔ اور پھر زکوٰۃ

ادا کریں۔ اور اگر یاد نہ ہو تو پھر احتیاط کر کے اندازہ کریں۔ جس میں زیادہ ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن کم نہ ہو۔ اور پھر اس کی ادائیگی کی فکر کریں۔ اور اس کو اپنے وصیت نامہ کی کاپی میں لکھ لیں۔ اور جتنی زکوٰۃ ادا کر دیں، اس کو کاپی میں لکھتے چلے جائیں۔ اور جلد از جلد ادا کرنے کی فکر کریں۔

اسی طرح حج زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہوتا ہے، اگر حج فرض ہے اور اب تک ادا نہیں کیا، تو جلد از جلد اس سے بھی سبکدوش ہونے کی فکر کریں۔ یہ سب حقوق اللہ ہیں، ان کو ادا کرنا بھی "توبہ تفصیلی" کا ایک حصہ ہے۔

حقوق العباد ادا کرے یا معاف کرائے

اس کے بعد حقوق العباد کا جائزہ لیں، کہ کسی کا کوئی جانی حق یا کسی کا کوئی مالی حق اپنے ذمے واجب ہو، اور اب تک ادا نہ کیا ہو تو اس کو ادا کریں یا معاف کرائیں۔ یا کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی ہو، اس سے معاف کرائیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے باقاعدہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں کھڑے ہو کر یہ اعلان فرمایا:

"اگر میں نے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی ہو، یا کسی کو کوئی صدمہ پہنچایا ہو، یا کسی کا کوئی حق میرے ذمے ہو تو آج میں آپ سب کے سامنے کھڑا ہوں، وہ شخص آ کر مجھ سے بدلہ لے لے، یا معاف کر دے"(۱)

لہٰذا جب حضورِ اقدس ﷺ معافی مانگ رہے ہیں تو ہم اور آپ کس شمار میں ہیں، لہٰذا زندگی میں اب تک جن جن لوگوں سے تعلقات رہے، یا لین دین کے معاملات رہے، یا اُٹھنا بیٹھنا رہا، یا عزیز و اقارب ہیں، ان سب سے رابطہ کر کے زبانی یا خط لکھ کر ان سے معلوم کریں اور اگر ان کا تمہارے ذمے کوئی مالی حق نکلے تو اس کو ادا کریں، اور اگر مالی حق نہیں ہے، بلکہ جانی ہے، مثلاً کسی کی غیبت کی تھی، کسی کو برا بھلا کہہ دیا تھا، یا کسی کو صدمہ پہنچایا تھا، ان سب سے معافی مانگنا ضروری ہے۔

ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

"اگر کسی شخص نے دوسرے شخص پر ظلم کر رکھا ہے چاہے وہ جانی ظلم ہو یا مالی ظلم ہو، آج وہ اس سے معافی مانگ لے، یا سونا چاندی دے کر اس دن کے آنے سے پہلے حساب صاف کر لے جس دن نہ درہم ہوگا اور نہ دینار ہوگا، کوئی سونا چاندی کام نہیں آئے گا"(۲)

(۱) مجمع الزوائد، باب ما جاء فی وداعه (۲۷/۹)

(۲) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب من کانت له مظلمة عند الرجل محللها له، رقم: ۲۲۶۹، مسند أحمد، رقم: ۹۲۴۲

فکرِ آخرت والوں کا حال

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ آخرت کی فکر عطا فرماتے ہیں، وہ ایک ایک شخص کے پاس جا کر ان کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ یا ان سے حقوق کی معافی کراتے ہیں۔ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے "العذر والنظر" کے نام سے ایک رسالہ لکھ کر اپنے تمام اہلِ تعلقات کے پاس بھیجا جس میں حضرت نے یہ لکھا کہ چونکہ آپ سے میرے تعلقات رہے ہیں۔ خدا جانے کس وقت کیا غلطی مجھ سے ہوئی ہو، یا کوئی واجب حق میرے ذمے باقی ہو۔ خدا کے لئے آج مجھ سے وہ حق وصول کرلیں، یا معاف کر دیں۔

اس طرح میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے تمام تعلقات رکھنے والوں کو "کچھ تلافی مافات" کے نام سے ایک خط لکھ کر بھجوایا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں ہمارے بزرگوں کا یہ معمول رہا ہے، اس لئے ہر آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔ یہ سب باتیں "توبہ تفصیلی" کا حصہ ہیں۔

حقوق العباد باقی رہ جائیں تو؟

یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ "حقوق اللہ" توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے، یا اس کو ادا نہ کرے لیکن حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی سے زندگی میں حقوق العباد ضائع ہوئے۔ اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ان حقوق کی ادائیگی کی فکر عطا فرمائی، اور توبہ کی توفیق عطا فرمائی، جس کے نتیجے میں اس نے ان حقوق کی ادائیگی کی فکر شروع کر دی، اور اب لوگوں سے معلوم کر رہا ہے کہ میرے ذمے کس شخص کے کیا حقوق باقی رہ گئے ہیں۔ تاکہ میں ان کو ادا کر دوں، لیکن ابھی ان حقوق کی ادائیگی کی تکمیل نہیں کر پایا تھا کہ اس سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ چونکہ اس نے حقوق کی ادائیگی مکمل نہیں کی تھی، اور معاف بھی نہیں کرائے تھے، کیا آخرت کے عذاب سے اس کی نجات اور بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو بھی مایوس نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ جب یہ شخص حقوق کی ادائیگی اور توبہ کے راستے پر چل پڑا تھا، اور کوشش بھی شروع کر دی تھی، تو ان شاء اللہ، اس کوشش کی برکت سے آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کے اصحابِ حقوق کو راضی فرما دیں گے، اور وہ اصحابِ حقوق اپنا حق معاف فرما دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا عجیب واقعہ

دلیل میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث شریف کا وہ مشہور واقعہ پیش کیا کہ ایک شخص نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کو توبہ کی فکر لاحق ہوئی۔ اب سوچا کہ میں کیا کروں۔ چنانچہ وہ عیسائی راہب کے پاس گیا، اور اس کو جا کر بتایا کہ میں نے اس طرح ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا ہے، تو کیا میرے لئے توبہ کا اور نجات کا کوئی راستہ ہے؟ اس راہب نے جواب دیا کہ تو تباہ ہو گیا، اور اب تیری تباہی اور ہلاکت میں کوئی شک نہیں، تیرے لئے نجات کا اور توبہ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ جواب سن کر وہ شخص مایوس ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ ننانوے قتل کر دیئے ہیں، ایک اور سہی، چنانچہ اس راہب کو بھی قتل کر دیا۔ اور سو کا عدد پورا کر دیا۔ لیکن دل میں چونکہ توبہ کی فکر لگی ہوئی تھی، اس لئے دوبارہ کسی اللہ والے کی تلاش میں نکل گیا۔ تلاش کرتے کرتے ایک اللہ والا اس کو مل گیا۔ اور اس سے جا کر اپنا سارا قصہ بتایا۔ اس نے کہا کہ اس میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، اب تم پہلے توبہ کرو، اور پھر اس بستی کو چھوڑ کر فلاں بستی میں چلے جاؤ، اور وہ نیک لوگوں کی بستی ہے۔ ان کی صحبت اختیار کرو۔ چونکہ وہ توبہ کرنے میں مخلص تھا۔ اس لئے وہ اس بستی کی طرف چل پڑا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اس کی موت کا وقت آ گیا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب وہ مرنے لگا تو مرتے مرتے بھی اپنے آپ کو سینے کے بل گھسیٹ کر اس بستی کے قریب کرنے لگا جس بستی کی طرف وہ جا رہا تھا۔ تاکہ میں اس بستی سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جاؤں۔ آخر کار جان نکل گئی۔ اب اس کی روح لے جانے کے لئے ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب دونوں پہنچ گئے۔ اور دونوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ ملائکہ رحمت کہنے لگے کہ چونکہ یہ شخص توبہ کر کے نیک لوگوں کی بستی کی طرف جا رہا تھا، اس لئے اس کی روح ہم لے جائیں گے۔ ملائکہ عذاب کہنے لگے کہ اس نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہے اور ابھی اس کی معافی نہیں ہوئی، لہٰذا اس کی روح ہم لے جائیں گے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ شخص کونسی بستی سے زیادہ قریب ہے، جس بستی سے چلا تھا، اس سے زیادہ قریب ہے، یا جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے زیادہ قریب ہے۔ اب دونوں طرف کے فاصلوں کی پیمائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ جس بستی کی طرف جا رہا تھا اس سے تھوڑا قریب ہے۔ چنانچہ ملائکہ رحمت اس کی روح لے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوشش کی برکت سے اس کو معاف فرما دیا۔ (۱)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس کے ذمے حقوق العباد تھے، لیکن چونکہ اپنی

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب قبول توبة القاتل وإن کثر قتله، رقم: ٤٩٦٧، سنن ابن ماجه، کتاب الدیات، باب هل لقاتل مؤمن توبة، رقم: ٢٦١٢، مسند أحمد، رقم: ٦٣٧٠

طرف سے کوشش شروع کر دی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔ اسی طرح جب کسی انسان کے ذمے حقوق العباد ہوں اور وہ ان کی ادائیگی کی کوشش شروع کر دے، اور اس فکر میں لگ جائے اور پھر درمیان میں موت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ وہ اصحابِ حقوق کو قیامت کے دن راضی فرمادیں گے

بہر حال، یہ دو قسم کی توبہ کرلیں۔ ایک توبہ اجمالی، اور ایک توبہ تفصیلی، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

پچھلے گناہ بھلا دو

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم یہ دونوں قسم کی توبہ کرلو، تو اس کے بعد اپنے پچھلے گناہوں کو یاد بھی نہ کرو، بلکہ ان کو بھول جاؤ۔ اس لئے کہ جن گناہوں سے تم توبہ کر چکے ہو، ان کو یاد کرنا ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی ناقدری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمالیا ہے کہ جب استغفار کرو گے، اور توبہ کرو گے تو میں تمہاری توبہ کو قبول کرلوں گا۔ اور تمہارے گناہوں کو معاف کردوں گا۔ اور تمہارے نامۂ اعمال سے مٹادوں گا اب اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرمادیا۔ لیکن تم الٹا ان گناہوں کو یاد کر کے ان کا وظیفہ پڑھ رہے ہو۔ یہ ان کی رحمت کی ناقدری ہے۔ کیونکہ ان کی یاد بعض اوقات حجاب اور رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اس لئے ان کو یاد مت کرو، بلکہ بھول جاؤ۔

یاد آنے پر استغفار کرلو

محقق اور غیر محقق میں یہی فرق ہوتا ہے۔ غیر محقق بعض اوقات اُلٹا کام بتادیتے ہیں۔ میرے ایک دوست بہت نیک تھے۔ ہر وقت روزے سے ہوتے تھے، تہجد گزار تھے، ایک پیر صاحب سے ان کا تعلق تھا، وہ بتایا کرتے تھے کہ میرے پیر صاحب نے مجھے یہ کہا ہے کہ رات کو جب تم تہجد کی نماز کے لئے اُٹھو تو تہجد پڑھنے کے بعد اپنے پچھلے سارے گناہوں کو یاد کیا کرو، اور ان کو یاد کر کے خوب رویا کرو لیکن ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ طریقہ درست نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو توبہ کے بعد ہمارے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا ہے، اور ہمارے نامۂ اعمال سے مٹادیا ہے۔ لیکن تم ان کو یاد کر کے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ ابھی ان گناہوں کو نہیں مٹایا، اور میں تو ان کو مٹنے نہیں دوں گا، بلکہ ان کو یاد کروں گا، تو اس طریقے میں اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت کی ناقدری اور ناشکری ہے، اس لئے کہ جب انہوں نے تمہارے اعمال نامے سے ان کو مٹادیا ہے تو اب ان کو بھول جاؤ، ان

کو یاد مت کرو، اور اگر کبھی بے اختیار ان گناہوں کا خیال آجائے تو اس وقت استغفار پڑھ کر اس خیال کو ختم کردو۔

حال کو درست کرلو

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اچھی بات بیان فرمائی، یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ جب تم توبہ کر چکو تو پھر ماضی کی فکر چھوڑ دو۔ اس لئے کہ جب توبہ کرلی تو یہ اُمید رکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمائیں گے انشاء اللہ۔ اور مستقبل کی فکر بھی چھوڑ دو کہ آئندہ کیا ہوگا، کیا نہیں ہوگا۔ حال جو اس وقت گزر رہا ہے، اس کی فکر کرو کہ یہ درست ہوجائے، یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزر جائے، اور اس میں کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔

آج کل ہمارا یہ حال ہے کہ یا تو ہم ماضی میں پڑے رہتے ہیں کہ ہم سے اتنے گناہ ہوچکے ہیں اب ہمارا کیا حال ہوگا، کس طرح بخشش ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مایوسی پیدا ہوکر حال بھی خراب ہوجاتا ہے۔ یا مستقبل کی فکر میں پڑے رہتے ہیں کہ اگر اس وقت توبہ کر بھی لی تو آئندہ کس طرح گناہ سے بچیں گے ارے یہ سوچو کہ جب آئندہ وقت آئے گا، اس وقت دیکھا جائے گا۔ اس وقت کی فکر کرو جو گزر رہا ہے، اس لئے کہ یہی حال ماضی بن رہا ہے، اور ہر مستقبل کو حال بننا ہے۔ اس لئے بس اپنے حال کو درست کرلو، اور ماضی کو یاد کر کے مایوس مت ہوجاؤ۔ حقیقت میں شیطان ہمیں بہکاتا ہے، وہ یہ ورغلاتا ہے کہ اپنے ماضی کو دیکھو کہ تم کتنے بڑے بڑے گناہ کر چکے ہو۔ اور اپنے مستقبل کو دیکھو کہ تم سے مستقبل میں کیا بنے گا؟ اور ماضی اور مستقبل کے چکر میں ڈال کر ہمارے حال کو خراب کرتا رہتا ہے۔ اس لئے شیطان کے دھوکے میں مت آؤ۔ اور اپنے حال کو درست کرنے کی فکر کرو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ فکر عطا فرمادے۔ آمین۔

عَنْ اَبِیْ قَلَابَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ لَمَّا لَعَنَ إِبْلِيْسَ سَأَلَهُ النَّظْرَةَ، فَأَنْظَرَهُ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ، قَالَ: وَعِزَّتِكَ لَا أَخْرُجُ مِنْ قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ مَا دَامَ فِيْهِ الرُّوْحُ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَعِزَّتِيْ لَا أَحْجُبُ عَنْهُ التَّوْبَةَ مَا دَامَ الرُّوْحُ فِي الْجَسَدِ.(۱)

خیر القرون

حضرت ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں، اگر کسی نے اسلام کی حالت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہو، اس کو ''صحابی'' کہتے ہیں، اور جس نے اسلام کی حالت میں

(۱) کتاب الزهد لابن المبارك، رقم: ۱۰۴۵ (۱/۳۶۹)، الدر المنثور (۲/۴۶۰)

کسی صحابی کی زیارت کی ہو، اس کو "تابعی" کہتے ہیں، اور اگر کسی نے اسلام کی حالت میں کسی تابعی کی زیارت کی ہو تو اس کو "تبع تابعی" کہتے ہیں، یہ تین قرون ہیں، جن کو حضور اقدس ﷺ نے خیر القرون قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ"(۱)

یعنی سب سے بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے متصل ہیں، اور پھر وہ جو ان کے متصل ہیں لہٰذا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے تابعین کو بھی بڑا اونچا مقام عطا فرمایا ہے۔ حضرت ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ بھی تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے براہِ راست حضور اقدس ﷺ کی زیارت نہیں کی لیکن متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت کی ہے، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد ہیں۔

حضرات تابعین کی احتیاط اور ڈر

یہ حدیث جو حضرت ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے، اگرچہ اپنے مقولے کے طور پر بیان فرمائی ہے، لیکن حقیقت میں یہ حدیث ہے، اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے اپنی عقل سے ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ اور اپنے مقولے کے طور پر اس لئے بیان فرمایا کہ حضرات تابعین حضور اقدس ﷺ کی طرف کوئی بات منسوب کرتے ہوئے ڈرتے تھے، اس لئے کہ کہیں کوئی بات منسوب کرنے میں اونچ نیچ ہو جائے، جس کے نتیجے میں ہماری پکڑ ہو جائے کہ تم نے حضور اقدس ﷺ کی طرف غلط بات منسوب کر دی، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"(۲)

(۱) صحيح البخاري، كتاب الشهادات، باب لا يشهد على شهادة جور إذا أشهد، رقم: ۲٤٥٨، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم، رقم: ٤٦٠١، سنن الترمذي، كتاب الفتن عن رسول الله، باب ما جاء في القرن الثالث، رقم: ۲۱٤٧، مسند أحمد، رقم: ۳٤١٣۔

(۲) صحيح البخاري، كتاب العلم، باب اثم من كذب على النبي، رقم: ۱۰۷، صحيح مسلم، مقدمة، باب تغليظ الكذب على رسول الله، رقم: ٤، سنن الترمذي، كتاب العلم عن رسول الله، باب ما جاء في تعظيم الكذب على رسول الله، رقم: ۲٥٨۳، سنن أبي داؤد، كتاب العلم، باب في التشديد في الكذب على رسول الله، رقم: ۳١٦٦، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب في التغليظ في تعمد الكذب على رسول الله، رقم: ۳۰، مسند أحمد، رقم: ٥٥١، سنن الدارمي، المقدمة، باب اتقاء الحديث عن النبي والتثبت فيه، رقم: ۲۳۳۔

یعنی "جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے، اور میری طرف ایسی بات منسوب کرے جو میں نے نہیں کہی تو اس کو چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے" اتنی سخت وعید آپ ﷺ نے بیان فرمائی۔ اس لئے صحابہ کرام اور تابعین حدیث بیان کرتے ہوئے لرزتے تھے۔

حدیث بیان کرنے میں احتیاط کرنی چاہئے

ایک تابعی ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان فرماتے ہیں کہ جب وہ صحابی ہمارے سامنے حضورِ اقدس ﷺ کی کوئی حدیث بیان فرماتے تو اس وقت ان کا چہرہ پیلا پڑ جاتا تھا، اور بعض اوقات ان پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی، کہ کہیں کوئی بات بیان کرنے میں غلطی ہو جائے حتیٰ کہ بعض صحابہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے اس طرح کی، یا اس جیسی، یا اس قسم کی بات بیان فرمائی تھی، ہو سکتا ہے کہ میرے سے بیان کرنے میں کچھ اُلٹ پھیر ہو گیا ہو۔ یہ سب اس لئے کرتے تا کہ حضورِ اقدس ﷺ کی طرف کوئی بات غلط منسوب کرنے کا گناہ نہ ہو اس سے ہمیں اور آپ کو یہ سبق ملتا ہے کہ ہم لوگ بسا اوقات تحقیق اور احتیاط کے بغیر احادیث بیان کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ ذرا سی کوئی بات کہیں سنی، فوراً ہم نے کہہ دیا کہ حدیث میں یوں آیا ہے، حالانکہ یہ دیکھئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے براہِ راست حضورِ اقدس ﷺ سے باتیں سنیں، وہ کتنی احتیاط کر رہے ہیں۔ لیکن ہم اس میں احتیاط نہیں کرتے۔ اس لئے احادیث بیان کرنے میں ہمیشہ بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ جب تک ٹھیک ٹھیک الفاظ معلوم نہ ہوں، اس وقت تک اس کو حدیث کے طور پر بیان نہیں کرنا چاہئے اس حدیث میں دیکھئے کہ حضرت ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے یوں فرمایا، بلکہ اس کو اپنے قول کے طور پر فرما رہے ہیں، حالانکہ حقیقت میں یہ حدیث ہے۔

بہرحال، وہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو راندۂ درگاہ کیا ہر مسلمان کو یہ واقعہ معلوم ہے کہ ابلیس کو حکم دیا گیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے۔ اس نے انکار کر دیا کہ میں تو سجدہ نہیں کرتا۔ اس انکار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو راندۂ درگاہ کر دیا۔

ابلیس کی بات درست تھی، لیکن

ایک بات یہاں یہ سمجھ لیں کہ اگر غور کیا جائے تو بظاہر ابلیس جو بات کہہ رہا تھا، وہ کوئی بری بات نہیں تھی۔ کیونکہ اگر وہ یہ کہتا کہ یہ پیشانی تو آپ کے لئے خاص ہے۔ یہ پیشانی تو صرف آپ کے سامنے جھک سکتی ہے، کسی اور کے سامنے نہیں جھک سکتی۔ یہ خاکی پتلا جس کو آپ نے اپنے ہاتھ سے بنایا، اس کو میں سجدہ کیوں کروں؟ میرا سجدہ تو آپ کے لئے ہے تو بظاہر یہ بات غلط نہیں تھی۔ لیکن یہ

بات اس لئے غلط ہوئی کہ جس ذات کے آگے سجدہ کرنا ہے، جب وہ ذات خود ہی حکم دے رہی ہے کہ اس خاکی پتلے کو سجدہ کرو۔ تو اب چوں وچرا کی مجال نہ ہونی چاہئے تھی۔ اس حکم کے بعد پھر اپنے عقلی گھوڑے نہیں دوڑانے چاہئیں تھے کہ یہ خاکی پتلا سجدہ کرنے کے لائق ہے یا نہیں؟

دیکھئے! فی الواقع آدمی سجدہ کے لائق تو نہیں تھا۔ چنانچہ جب حضورِ اقدس ﷺ کی آخری اُمت اس دنیا میں آئی تو ہمیشہ کے لئے یہ حکم دے دیا گیا کہ اب کسی انسان کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل حکم یہی تھا کہ انسان کو سجدہ کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ ہی حکم فرمائیں کہ سجدہ کرو تو اب عقلی گھوڑے نہیں دوڑانے چاہئیں۔ شیطان نے پہلی غلطی یہ کی کہ اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے۔

میں آدم سے افضل ہوں

دوسری غلطی یہ کی کہ شیطان نے سجدہ نہ کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ یہ پیشانی تو آپ کے لئے ہے، بلکہ یہ وجہ بتائی کہ اس آدم کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے، اور مجھے آپ نے آگ سے بنایا ہے، اور آگ مٹی سے افضل ہے، اس لئے میں اس کو سجدہ نہیں کرتا، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس کو راندۂ درگاہ کر دیا، اور حکم دے دیا کہ یہاں سے نکل جاؤ۔

اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگ لی

بہرحال، جس وقت اللہ تعالیٰ نے اس کو راندۂ درگاہ کیا، اس وقت اس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی، اور کہا:

"أَنْظِرْنِیْ إِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ"(۱)

اے اللہ، مجھے اس وقت تک کی مہلت دے دیجئے جس وقت آپ لوگوں کو اُٹھائیں گے، یعنی میں قیامت تک زندہ رہوں، مجھے موت نہ آئے۔

شیطان بڑا عارف تھا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ "ابلیس" اللہ تعالیٰ کی بہت معرفت رکھتا تھا، بہت بڑا عارف تھا، کیونکہ ایک طرف تو اس کو دھتکارا جا رہا ہے، راندۂ درگاہ کیا جا رہا ہے، جنت سے نکالا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ کا اس پر غضب نازل ہو رہا ہے، لیکن عین غضب کی حالت میں

(۱) الاعراف: ۱۴

بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ لی، اور مہلت مانگ لی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ غضب سے مغلوب نہیں ہوتے، اور غضب کی حالت میں بھی اگر ان سے کوئی چیز مانگی جائے تو وہ دے دیتے ہیں، چنانچہ اس نے مہلت مانگ لی۔

میں موت تک اس کو بہکاتا رہوں گا

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

"إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝ إِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۝"[1]

ہم تمہیں قیامت تک کے لئے مہلت دیتے ہیں، تمہیں قیامت تک موت نہیں آئے گی، جب مہلت مل گئی تو اب اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے اللہ! میں آپ کی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ابن آدم کے دل سے اس وقت تک نہیں نکلوں گا، جب تک اس کے جسم میں روح باقی ہے، یعنی موت آنے تک نہیں نکلوں گا۔ اور یہ ابن آدم جس کی وجہ سے مجھے راندۂ درگاہ ہونا پڑا، اس کے دل میں غلط قسم کے خیالات ڈالتا رہوں گا، اس کو بہکاتا رہوں گا، گناہوں کی خواہش، اس کے داعیے، اس کے محرکات اس کے دل میں پیدا کرتا رہوں گا، اور اس کو گناہوں کی طرف مائل کرتا رہوں گا، جب تک وہ زندہ ہے۔

میں موت تک توبہ قبول کرتا رہوں گا

شیطان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی عزت کی قسم کھائی، اور فرمایا کہ میری عزت کی قسم، میں اس ابن آدم کے لئے توبہ کا دروازہ بھی اس وقت تک بند نہیں کروں گا، جب تک اس کے جسم میں روح باقی ہے۔ تو میری عزت کی قسم کھاتا ہے کہ میں نہیں نکلوں گا، میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اس کے لئے توبہ کا دروازہ بند نہیں کروں گا۔ تو اگر زہر ہے، تو میں نے ہر ابن آدم کو اس زہر کا تریاق بھی دے دیا ہے کہ اس کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جب ابن آدم گناہوں سے توبہ کرلے گا تو میں تیرے سارے مکر و فریب اور تیرے سارے بہکاوے کو اس توبہ کے نتیجے میں ایک آن میں ختم کردوں گا۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے لئے اپنی رحمت کا عام اعلان فرمادیا، اور فرمادیا کہ یہ مت سمجھنا کہ ہم نے کوئی مافوق الفطرت طاقت شیطان کی صورت میں تمہارے اُوپر مسلط کردی ہے، جس سے تم نجات نہیں پاسکتے۔

---

(۱) الحجر: ۳۸

شیطان ایک آزمائش ہے

بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے شیطان کو صرف تمہاری ذرا سی آزمائش اور امتحان کے لئے پیدا کردیا ہے، ہم نے ہی اس کو بنایا، اور ہم نے ہی اس کو بہکانے کی طاقت دی ہے۔ لیکن ایسی طاقت نہیں دی کہ تم اس کو زیر نہ کرسکو۔ قرآن نے صاف اعلان کردیا:

﴿إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾(۱)

یعنی شیطان کا مکر بہت کمزور ہے، اور اتنا کمزور ہے کہ اگر کوئی شخص اس شیطان کے آگے ڈٹ جائے کہ تیری بات نہیں مانوں گا، تو جس گناہ پر آمادہ کرنا چاہ رہا ہے میں وہ گناہ نہیں کروں گا تو شیطان اسی وقت پگھل جاتا ہے۔ یہ شیطان بزدلوں پر اور ان لوگوں پر شیر ہو جاتا ہے جو اپنی ہمت سے کام لینے سے جی چراتے ہیں، اور جو گناہوں کو چھوڑنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے، لیکن بالفرض اگر اس کا داؤ چل جائے، اور کوئی بے ہمت آدمی اس کی بات مان لے تو پھر میں نے توبہ کا تریاق پیدا کردیا ہے، ہمارے پاس آجاؤ، اور اپنے گناہوں کا اقرار کرلو کہ یا اللہ، ہم سے غلطی ہوگئی، اور اپنے گناہ سے توبہ کرو، اور کہو، أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ، تو اس کے نتیجے میں شیطان کا سارا اثر ایک لمحے میں زائل ہو جائے گا۔

بہترین گناہ گار بن جاؤ

چنانچہ اسی وجہ سے ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ))(۲)

تم میں سے ہر شخص بہت خطاکار ہے، عربی میں ''خطاء'' اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ غلطیاں کرے، اور جو معمولی غلطی کرے اس کو عربی میں ''خاطی'' کہتے ہیں، یعنی غلطی کرنے والا، اور ''خطاء'' کے معنی ہیں: بہت زیادہ غلطی کرنے والا، تو فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص بہت خطاکار ہے۔ لیکن ساتھ میں یہ بھی فرمایا کہ خطاکاروں میں سے سب سے بہتر خطاکار وہ ہے جو توبہ بھی بہت کرتا ہے اس حدیث میں اشارہ اس بات کی طرف کردیا کہ دنیا کے اندر تم سے گناہ بھی ہوں گے، گناہوں کے داعیے

---

(۱) النساء: ۷۶

(۲) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللّٰه، باب منه، رقم: ۲۴۲۳، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر التوبة، رقم: ۴۲۴۱، مسند أحمد، رقم: ۱۲۵۷۶، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی التوبة، رقم: ۲۶۱۱۔

بھی پیدا ہوں گے، لیکن ان کے آگے ڈٹ جانے کی کوشش کرو، اور اس کے آگے جلدی سے ہتھیار مت ڈالا کرو، اور اگر کبھی گناہ ہو جائے تو پھر مایوس ہونے کے بجائے ہمارے حضور حاضر ہو کر توبہ کر لیا کرو۔ یہاں بھی ''توّاب'' کا صیغہ استعمال کیا۔ ''تائب'' نہیں کہا، اس لئے کہ تائب کے معنی ہیں ''توبہ کرنے والا'' اور ''توّاب'' کے معنی ہیں ''بہت توبہ کرنے والا''، مطلب یہ ہے کہ صرف ایک مرتبہ توبہ کر لینا کافی نہیں، بلکہ ہر مرتبہ جب بھی گناہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرتے رہو، اور جب کثرت سے توبہ کرو گے تو پھر انشاء اللہ شیطان کا داؤ نہیں چلے گا، اور شیطان سے حفاظت رہے گی۔

اللہ کی رحمت کے سو حصے ہیں

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ، فَأَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةً وَّتِسْعِیْنَ، وَأَنْزَلَ فِی الْأَرْضِ جُزْءًا وَاحِدًا، ذٰلِكَ الْجُزْءُ یَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ حَتّٰی تَرْفَعَ الدَّابَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْیَةَ أَنْ تُصِیْبَهُ.''(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے جو رحمت پیدا فرمائی ہے، اس کے سو حصے کیے ہیں، ان سو میں سے صرف ایک حصہ رحمت کا اس دنیا میں اُتارا ہے، جس کی وجہ سے لوگ آپس میں ایک دوسرے پر رحمت کا، ترس کھانے کا اور شفقت کا معاملہ کرتے ہیں۔ جیسے باپ اپنے بیٹے پر رحم کر رہا ہے، یا ماں اپنے بچوں پر رحم کر رہی ہے، بھائی بھائی پر رحم کر رہا ہے، بھائی بہن پر کر رہا ہے، یا ایک دوست دوسرے دوست پر کر رہا ہے۔ گویا دنیا میں جتنے لوگ بھی آپس میں شفقت اور رحم کا معاملہ کر رہے ہیں، وہ ایک حصہ رحم کا نتیجہ اور طفیل ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں نازل فرمایا، حتیٰ کہ گھوڑی کا بچہ جب دودھ پینے کے لئے آتا ہے تو وہ گھوڑی اپنا پاؤں اُٹھا لیتی ہے۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دودھ پینے کے دوران یہ پاؤں بچے کو لگ جائے، یہ بھی اس سو دیں حصے کا ایک جز ہے۔ اور ننانوے حصے رحمت کے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس محفوظ رکھے ہوئے ہیں، ان کے ذریعہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمت کا مظاہرہ فرمائیں گے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب جعل اللہ الرحمة مائة جزء، رقم: ۵۵٤۱، صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة اللہ تعالیٰ وأنها سبقت غضبه، رقم: ٤۹٤۲، مسند أحمد، رقم: ۲٤۰۵٦، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب ان للہ مائة رحمة، رقم: ۲٦٦٦۔

اس ذات سے مایوسی کیسی؟

اس حدیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں یہ بتادیا کہ کیا تم لوگ اس ذات کی رحمت سے مایوس ہوتے ہو، جس ذات نے تمہارے لئے آخرت میں اتنی ساری رحمتیں اکٹھی کر کے رکھی ہوئی ہیں، اس ذات سے مایوسی کا اظہار کرتے ہو؟ کیا وہ اپنی رحمت سے تم کو دور کردے گا؟ البتہ صرف اتنی بات ہے کہ ان رحمتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی دیر ہے۔ اور ان رحمتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرو، استغفار کرو، گناہوں کو چھوڑو، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، جتنا رجوع کرو گے، اور توبہ استغفار کرو گے، اتنا ہی اللہ کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہوگی، اور آخرت میں تمہارا بیڑہ پار کردے گی۔

صرف تمنا کرنا کافی نہیں

لیکن یہ رحمت اسی شخص کو فائدہ دے گی جو یہ چاہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی اس رحمت سے فائدہ اُٹھالوں، اب اگر کوئی شخص اس رحمت سے فائدہ اُٹھانا ہی نہ چاہے، بلکہ ساری عمر غفلت ہی میں گزار دے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے تمنا رکھے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے، ایسے لوگوں کے لئے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

"اَلْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ"(۱)

عاجز شخص وہ ہے جو خواہشات کے پیچھے دوڑا چلا جارہا ہے، اور اللہ تعالیٰ پر اُمیدیں باندھے ہوئے ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے غفور رحیم ہیں، معاف فرمادیں گے ہاں، البتہ جو شخص اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اُمیدوار ہو، اور کوشش کررہا ہو، پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت انشاء اللہ اس کو آخرت میں ڈھانپ لے گی۔

ایک شخص کا عجیب واقعہ

ایک اور حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے پچھلی اُمتوں کے ایک شخص کا واقعہ بیان فرمایا کہ ایک شخص تھا، جس نے اپنی جان

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۳۸۳، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الموت والاستعداد له، رقم: ۴۲۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۶۵۰۱۔

پر بڑا ظلم کیا تھا۔ بڑے بڑے گناہ کیے تھے، بڑی خراب زندگی گزاری تھی، اور جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے گھر والوں سے وصیت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی زندگی گناہوں اور غفلتوں میں گزار دی ہے، کوئی نیک کام تو کیا نہیں ہے، اس لئے جب میں مرجاؤں تو میری نعش کو جلا دنا، اور جو راکھ بن جائے، تو اس کو بالکل باریک پیس لینا، پھر اس راکھ کو مختلف جگہوں پر تیز ہوا میں اُڑا دینا، تاکہ وہ ذرّات دور دور تک چلے جائیں۔ یہ وصیت میں اس لئے کر رہا ہوں کہ اللہ کی قسم! اگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آگیا تو مجھے اللہ تعالیٰ ایسا عذاب دے گا کہ ایسا عذاب دنیا میں کسی اور شخص کو نہیں دیا ہوگا، اس لئے کہ میں نے گناہ ہی ایسے کیے ہیں کہ اس عذاب کا مستحق ہوں۔

جب اس شخص کا انتقال ہوگیا تو اس کے گھر والوں نے اس کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس کی نعش کو جلایا، پھر اس کو پیسا، اور پھر اس کو ہواؤں میں اُڑا دیا، جس کے نتیجے میں اس کے ذرات دور دور تک بکھر گئے یہ تو اس کی حماقت کی بات تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ میرے ذرات کو جمع کرنے پر قادر نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا کہ اس کے سارے ذرات جمع کردو۔ جب ذرات جمع ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس کو دوبارہ مکمل انسان جیسا تھا ویسا بنا دیا جائے۔ چنانچہ وہ دوبارہ زندہ ہوکر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے سوال کیا کہ تم نے اپنے گھر والوں کو یہ سب عمل کرنے کی وصیت کیوں کی تھی؟ جواب میں اس نے کہا:

"خَشْيَتَكَ يَا رَبِّ"

اے اللہ! آپ کے ڈر کی وجہ سے، اس لئے کہ میں نے گناہ بہت کیے تھے۔ اور ان گناہوں کے نتیجے میں مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میں آپ کے عذاب کا مستحق ہوگیا ہوں۔ اور آپ کا عذب بڑا سخت ہے، تو میں نے اس عذاب کے ڈر سے یہ وصیت کردی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے ڈر کی وجہ سے تم نے یہ عمل کیا تھا۔ جاؤ، میں نے تمہیں معاف کردیا۔

یہ واقعہ خود حضورِ اقدس ﷺ نے بیان فرمایا۔ اور صحیح مسلم میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے۔ (۱)

اب ذرا سوچئے کہ اس شخص کی یہ وصیت بڑی احمقانہ تھی۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو وہ کافرانہ تھی، اس لئے کہ وہ شخص یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آگیا تو اللہ تعالیٰ مجھے بہت عذاب دے گا، لیکن اگر تم لوگوں نے مجھے جلا کر اور راکھ بنا کر اُڑا دیا تو پھر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ معاذ اللہ۔ یہ عقیدہ رکھنا تو کفر اور شرک ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ راکھ کے ذرات جمع کرنے پر قادر نہیں

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة الله تعالی وأنها سبقت غضبه، رقم: ٤٩٤٩، مسند أحمد، رقم: ٧٣٢٧، مؤطا مالك، كتاب الجنائز، باب أن عائشة قالت...... رقم: ٥٠٦۔

ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا؟ تو اس نے جواب دیا: یا اللہ! آپ کے ڈر کی وجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اچھا تو جانتا تھا کہ ہم تیرے رب ہیں، اور مانتا تھا کہ ہم تیرے رب ہیں۔ اور یہ بھی مانتا تھا کہ تو نے ہماری نافرمانی کی ہے، اور اس نافرمانی پر تو شرمسار بھی تھا، اور نادم بھی تھا، اور تو نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے ان گناہوں پر ندامت کا اظہار کر دیا تھا، اس لئے ہم تیری مغفرت کرتے ہیں، اور تجھے معاف فرماتے ہیں۔

اس واقعہ کو بیان کرنے سے حضورِ اقدس ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت درحقیقت بندے سے صرف ایک چیز کا مطالبہ کرتی ہے، وہ یہ کہ بندہ ایک مرتبہ اپنے کیے پر سچے دل سے شرمسار ہو جائے، نادم ہو جائے، اور نادم ہو کر اس وقت جو کچھ کر سکتا ہے، وہ کر گزرے، تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر کے اس کو معاف فرما دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنی میں اپنے گناہوں پر نادم ہونے اور توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اپنی رحمت سے ہم سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

توبہ، اصلاحِ نفس کی پہلی سیڑھی ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

روزے کا مقصد تقویٰ کا حصول

اس کتاب میں ''انفاسِ عیسیٰ'' میں آگے توبہ کا بیان ہے۔ توبہ سے متعلق بہت سی باتیں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بیان فرمائی ہیں جو بڑے فائدے کی ہیں۔ یہ بیان ہمارے مناسبِ حال بھی ہے، کیونکہ یہ رمضان المبارک کا مہینہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کا مہینہ ہے اور اس مہینے کا صحیح فائدہ یہ ہے کہ اس ماہِ مبارک میں انسان اپنے تمام پچھلے گناہوں سے تائب ہو جائے اور آئندہ کے لئے اپنی زندگی کو اللہ جل جلالہ کے احکام کے مطابق بنانے کا عزم تازہ کرے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ"(۱)

یعنی ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ پچھلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تمہیں تقویٰ حاصل ہو'' پورے مہینے بھر کی جو ریاضت اور کورس ہے، اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنے دل میں تقویٰ پیدا کیا جائے اور تقویٰ پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے دل میں یہ فکر پیدا ہو جائے کہ ماضی میں مجھ سے جو کچھ ہوا، اس سے توبہ کرلوں اور آئندہ کے لئے اس بات کا عزم کرے کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزاروں گا۔ اس لئے یہ توبہ کا بیان ہمارے مناسبِ حال ہے اور توبہ کی بہت سی جزئیات حضرت والا نے یہاں بیان فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆ اصلاحی مجالس (۵/۲۲۶ تا ۲۵۴) رمضان المبارک، بعد از نماز ظہر، جامع مسجد دارالعلوم کراچی۔

(۱) البقرة: ۱۸۳

اصلاحِ نفس کی پہلی سیڑھی ’’توبہ‘‘

توبہ اصلاحِ نفس کی پہلی سیڑھی ہے، مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی اصلاح کے لئے قدم اُٹھائے تو سب سے پہلے اس کا کام یہ ہے کہ وہ ’’توبہ‘‘ کی تکمیل کرے، یعنی گزشتہ زمانے میں جو گناہ اور غلطیاں اس سے سرزد ہوئیں، ان سب سے اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کرے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ’’احیاء العلوم‘‘ میں توبہ کا بیان شروع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’أوّل اقدام المریدین التوبة‘‘ یعنی وہ مریدین جو اپنی اصلاحِ نفس کا ارادہ لے کر کسی شیخ کے پاس جائیں تو ان کا سب سے پہلا کام ’’تکمیلِ توبہ‘‘ ہے۔ اسی لئے بزرگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنی اصلاح کی فکر عطاء فرماتے ہیں اور وہ شخص اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو اس کو سب سے پہلا کام جو تلقین کیا جاتا ہے، وہ ’’تکمیلِ توبہ‘‘ ہے۔ یعنی پہلے اپنے تمام سابقہ گناہوں سے سچی توبہ کرلے اور اپنے آپ کو ان گناہوں اور نجاستوں سے دھولے جن کے اندر ماضی کے ایام گزرے ہیں۔ جب توبہ کرکے نئی زندگی شروع کرلے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت متوجہ ہوگی۔ اس لئے توبہ کی بڑی اہمیت ہے اور اصلاحِ نفس کی طرف جانے والی سب سے پہلی سیڑھی ہے۔

توبہ اجمالی

پھر توبہ کی دو قسمیں ہیں: ایک اجمالی توبہ اور ایک تفصیلی توبہ۔ اجمالی توبہ یہ ہے کہ اب تک جتنے گناہ ہوچکے ہیں، ایک مرتبہ بیٹھ کر ان سب سے یکبارگی اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرلے اور توبہ کرنے سے پہلے دو رکعت ’’صلوٰۃ التوبہ‘‘ کی نیت سے پڑھے اور اس کے بعد یہ کہے کہ اے اللہ! اب تک مجھ سے جتنے گناہ ہوئے ہیں، جتنی غلطیاں ہوئی ہیں اور جتنی کوتاہیاں ہوئی ہیں، اے اللہ! میں ان سب سے معافی مانگتا ہوں اور توبہ استغفار کرتا ہوں اور پکا ارادہ کرتا ہوں کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا، یہ ہے ’’توبہ اجمالی‘‘ جو سب سے پہلا کام ہے۔

توبہ تفصیلی

اس کے بعد دوسرے نمبر پر ’’توبہ تفصیلی‘‘ ہے۔ توبہ تفصیلی یہ ہے کہ جتنے گناہ ہوئے ہیں، ان میں سے جن گناہوں کی تلافی ممکن ہے، ان گناہوں کی تلافی کی جائے۔

تلافی ممکن ہو تو تلافی کرنی ہوگی

توبہ کا قاعدہ یہ ہے کہ جس گناہ کی معافی مانگ رہے ہو، اگر اس کی کوئی تلافی ممکن ہے تو وہ تلافی کرنی ہوگی، مثلاً کسی دوسرے شخص کے پیسے کھالیے اور اب بیٹھ کر توبہ کر رہا ہے کہ یا اللہ! مجھے معاف کردے، یہ توبہ قبول نہیں ہوگی، اس لئے کہ جس شخص کے پیسے کھائے ہیں، جب تک اس کے پیسے نہیں لوٹاؤ گے یا جب تک اس سے معاف نہیں کراؤ گے، اس وقت تک توبہ قبول نہیں ہوگی، کیونکہ یہاں پر تلافی ممکن ہے۔ یا مثلاً کسی کا دل دکھایا یا کسی کو تکلیف پہنچائی، اس کی تلافی ممکن ہے، وہ یہ کہ اس سے جا کر معافی مانگ لو۔

یہی قاعدہ حقوق اللہ سے توبہ کرنے کے بارے میں بھی ہے، مثلاً آپ نے زکوٰۃ ادا نہیں کی، چونکہ اس کی تلافی کرنی ممکن ہے، اس لئے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، لہٰذا توبہ کے ساتھ تلافی بھی کرو۔ اسی طرح اگر نمازیں رہ گئی ہیں یا روزے رہ گئے ہیں تو پہلے ان کی تلافی کرو اور پھر معافی مانگو۔

قضاءِ عمری کا حکم

آج کل یہ مسئلہ بہت زور و شور سے پھیلایا جارہا ہے کہ قضاء عمری کوئی چیز نہیں، دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''اَلْاِسْلَامُ یَجُبُّ مَا کَانَ قَبْلَہٗ''(۱) یعنی اگر کوئی شخص نیا مسلمان ہو تو اسلام لانے سے پہلے جو اس نے گناہ کیے تھے، اسلام لانے سے وہ سب ختم ہوجاتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص ستر سال کی عمر میں اسلام لایا تو اب اسلام لانے کے بعد گزشتہ ستر سال کی نمازیں قضاء کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جب وہ آج اسلام لایا تو اب آج ہی سے نمازیں شروع کردے۔

توبہ کو اسلام لانے پر قیاس کرنا

بعض لوگوں نے اسلام لانے پر ''توبہ'' کرنے کو بھی قیاس کرلیا، وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ساری عمر نمازیں نہیں پڑھیں، اب توبہ کرلی تو اب گزشتہ زمانے کی نمازیں قضاء کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ توبہ کو اسلام پر قیاس کرنا درست نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شخص ابھی مسلمان ہوا ہے، وہ جب کافر تھا تو اس کفر کے زمانے میں وہ فروع کا مخاطب ہی نہیں تھا،

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱۷۱۰۹، سنن البیهقی، رقم: ۱۸۷۵۳ (۲/۴۴۸)

اس کو تو یہ حکم تھا کہ پہلے اسلام لا ، اس زمانے میں اس پر نماز فرض نہیں تھی ، کیونکہ نماز تو اس وقت فرض ہوگی جب وہ مسلمان ہوگا ، اس لئے گزشتہ زمانے کی نمازیں اس پر قضاء کرنی ضروری نہیں ۔

بخلاف مسلمان کے ، اس پر تو بالغ ہوتے ہی نماز فرض ہوگئی اور جب اس نے وہ نمازیں نہیں پڑھیں تو وہ اس کے ذمے پر باقی رہیں ، ایک عرصہ دراز کے بعد جب اس نے نماز چھوڑنے کے گناہ سے توبہ کی تو توبہ کا اصول یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کی ہے ، اگر اس کی تلافی ممکن ہے تو تلافی کیے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی ، لہٰذا اس کے ذمے ان نمازوں کی قضاء ضروری ہوگی ۔ اسی طرح اگر روزے چھوڑے ہیں تو ان روزوں کی قضاء کرنی ہوگی ، کیونکہ روزے اس کے ذمے باقی ہیں ۔

توبہ سے نمازیں معاف نہیں ہوں گی

ورنہ اس کی تو کوئی معقول وجہ نہیں کہ ایک شخص تو اسی سال تک مسلسل نماز پڑھتا رہے اور دوسرا شخص اسی سال تک نماز نہ پڑھے اور پھر آخر میں اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرلے کہ یا اللہ ! میں توبہ استغفار کرتا ہوں اور اس توبہ کے نتیجے میں اس کی ساری نمازیں معاف ہوجائیں ، یہ تو کوئی معقول بات نہیں ۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ایک دن کی نمازیں قضاء ہوجائیں تو ان کو قضاء کرلو اور پڑھ لو لیکن اگر ایک دن سے زیادہ کی نمازیں قضاء ہوجائیں تو ان کو قضاء کرنے کی ضرورت نہیں ، صرف توبہ کرلو ۔ یہ عجیب مسئلہ اپنی طرف سے بنالیا ہے ، اس کے ذریعہ لوگوں کے ہاتھ میں بڑا اچھا نسخہ آگیا کہ جب نمازیں قضاء ہوجائیں تو ان کو ایک دن سے زیادہ کرلو اور اس کے بعد توبہ کرلو ، یہ سب فضول باتیں ہیں ، کیونکہ توبہ کا اصول یہ ہے کہ جس کی تلافی ممکن ہے اس کی تلافی کیے بغیر توبہ قبول نہیں ہوتی ۔

شراب سے توبہ

ایک شخص بہت عرصے تک شراب پیتا رہا ، اب توبہ کرنے کی توفیق ہوئی تو بس توبہ کرلینا کافی ہے ، کیونکہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ، تلافی کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیں گے ۔

چوری سے توبہ

کسی شخص نے کچھ پیسے چوری کیے اور کھالیے ، بعد میں توبہ کی توفیق ہوئی تو اس کی تلافی ممکن ہے ، وہ اس طرح کہ جس کے پیسے چوری کیے تھے ، اس کو پیسے واپس کرے یا اس سے معاف کرائے ، اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی ۔

زکوٰۃ نہ دینے سے توبہ

یا مثلاً گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، اب توبہ کی توفیق ہوئی تو جب تک گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا، اس وقت تک توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یہی معاملہ نمازوں کا اور روزوں کا ہے کہ جب تک ان کو ادا نہیں کرے گا، صرف توبہ کر لینے سے معاف نہیں ہوں گے۔

نمازیں ادا کرے اور وصیت بھی کرے

بہر حال! توبہ تفصیلی یہ ہے کہ انسان اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لے کر دیکھے کہ میرے ذمے اللہ تعالیٰ کے یا بندوں کے حقوق کچھ واجب ہیں یا نہیں؟ حقوق اللہ میں نماز کو دیکھے کہ میرے ذمے کتنی نمازیں باقی ہیں، ان کو قضاء کرنے کی فکر کرے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مستقل کاپی بنائے، اس کاپی کے اندر یہ لکھے کہ میرے ذمے اتنی نمازیں باقی ہیں، اگر پوری طرح یاد نہ ہوں تو ایک احتیاطی تخمینہ لگا کر ان کی تعداد لکھے اور یہ لکھے کہ میں آج فلاں تاریخ سے ان نمازوں کی ادائیگی شروع کر رہا ہوں اور ہر نماز کے ساتھ ایک سابقہ نماز کی قضاء کروں گا اور جتنی نمازیں ادا کر لوں گا وہ اس کاپی کے اندر درج کر دوں گا، اگر میں ان نمازوں کو قضاء کیے بغیر مر جاؤں تو میں اپنے ورثاء کو وصیت کرتا ہوں کہ میرے مال سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کر دیں۔

بلا وصیت فدیہ ادا کرنا واجب نہیں

اگر کوئی شخص اس طرح وصیت نہیں کرے گا تو پھر اگرچہ یہ شخص لاکھوں روپے ترکہ میں چھوڑ کر چلا جائے، پھر بھی وارثوں کے ذمے نمازوں کا فدیہ ادا کرنا واجب نہیں ہوگا، وارثوں پر نماز روزوں کا فدیہ ادا کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے جب مرنے والا وصیت کر جائے، اور یہ واجب بھی کل مال کے ایک تہائی کی حد تک واجب ہوگا، ایک تہائی سے زیادہ میں وصیت نافذ نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ روزے ادا کرے اور وصیت کرے

یہی معاملہ روزوں کا ہے۔ اب تک زندگی میں جتنے روزے چھوڑے ہیں، ان کو کاپی کے اندر لکھ لے، اگر یقینی تعداد یاد نہ ہو تو اندازے سے ایک احتیاطی تعداد لکھ لے، پھر ان کو ادا کرنا شروع کرے اور کاپی میں لکھتا رہے کہ میں نے اتنے روزے ادا کر لیے اور اس کاپی میں یہ وصیت بھی لکھے کہ اگر اس دوران میرا انتقال ہو جائے تو میرے ترکہ میں سے بقیہ روزوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے۔ اسی

طرح زکوٰۃ کا حساب کرے کہ گزشتہ سالوں میں میرے اوپر کتنی زکوٰۃ فرض ہوئی جو میں نے اب تک ادا نہیں کی، پھر اس کو کاپی کے اندر درج کرے اور اس کو ادا کرنا شروع کرے اور کاپی میں لکھتا رہے، اور یہ وصیت بھی لکھ دے کہ اگر اس دوران میرا انتقال ہو جائے تو بقیہ زکوٰۃ میرے مال میں سے ادا کر دی جائے، یہ توبہ تفصیلی ہے۔ بہر حال! اصلاحِ نفس کے لئے جب کوئی شخص کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو اس سے یہ دونوں کام کرائے جاتے ہیں، ایک توبہ اجمالی اور ایک توبہ تفصیلی۔ توبہ کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی جزئیات یہاں بیان فرمائی ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

گناہ نہ کرنے کا عزم دھرا رہ جاتا ہے

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ

''ہر ہفتہ توبہ کرتا ہوں لیکن بعد ایک روز کے تمام تہیہ وغیرہ غارت ہو جاتا ہے''(۱)

یہ وہ حالت ہے جو تقریباً ہر ایک کو زندگی میں پیش آتی ہے کہ توبہ کر لی اور ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے تمام پچھلے گناہوں سے معافی مانگ لی اور تہیہ اور عزم بھی کر لیا کہ آئندہ گناہ نہیں کریں گے، لیکن اگلے دن ہی وہ سب تہیہ اور عزم غارت ہو جاتا ہے، یعنی جس وقت گناہ نہ کرنے کا عزم کیا تھا، اس وقت تو بڑا پکا عزم اور ارادہ تھا کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کریں گے، لیکن جب کچھ وقت گزرتا ہے اور حالات اور واقعات سامنے آتے ہیں تو وہ سارا عزم دھرا رہ جاتا ہے اور آدمی دوبارہ اس گناہ کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے، اکثر و بیشتر یہ حالت ہر ایک کو پیش آتی ہے۔

توبہ کی پہلی شرط گناہ پر ندامت

بلکہ ایک بات اور عرض کر دوں، وہ یہ کہ پہلے تو آدمی کو اس بات میں شبہ رہتا ہے کہ میری توبہ سچی ہوئی یا نہیں، اس لئے کہ توبہ کے لئے تین شرائط ہیں، جب یہ تین شرائط پائی جائیں تب توبہ سچی ہوتی ہے، پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کو پچھلے تمام گناہوں پر دل میں ندامت ہو، شرمندگی ہو اور اس گناہ کا اقرار اور اعتراف ہو، اگر اقرار اور اعتراف نہیں ہے اور گناہ پر ندامت اور پشیمانی نہیں ہے بلکہ سینہ زوری ہے تو پھر توبہ کہاں ہوئی۔ لہٰذا یہ بات کہ انسان گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھے، یہ بڑی خطرناک بات ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔ لہٰذا توبہ کی پہلی شرط ندامت ہے کہ یا اللہ! مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی، میں اقراری مجرم ہوں، مجھے معاف فرما دے۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۱۹۴

توبہ کی دوسری شرط: گناہ کا ترک

توبہ کی دوسری شرط جس کے بغیر توبہ کامل نہیں ہوتی، وہ یہ ہے کہ فوراً اس گناہ کو چھوڑ دے، اس کے بغیر توبہ نہیں ہوسکتی، یہ تو نہیں ہوسکتا کہ انسان ایک طرف توبہ کر رہا ہے اور دوسری طرف اس گناہ کو بھی کر رہا ہے، یہ تو کوئی توبہ نہ ہوئی۔

توبہ کی تیسری شرط: گناہ نہ کرنے کا عزم

تیسری شرط یہ ہے کہ آئندہ کے لئے دل میں یہ عزم اور ارادہ کرلے کہ میں آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا اور اس کے پاس نہیں پھٹکوں گا۔ بہر حال! توبہ کی یہ تین شرائط ہیں جن کے بغیر توبہ مکمل نہیں ہوتی۔

عزم نہ ہونے کا شبہ

جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے کہ گناہ پر ندامت اور شرمندگی ہو، اکثر صاحبِ ایمان کو یہ چیز حاصل ہوجاتی ہے۔ اور دوسری شرط یعنی گناہ کو چھوڑ دینا، اس پر بھی عام طور پر عمل ہوجاتا ہے۔ البتہ تیسری شرط کہ یہ عزم کرنا کہ آئندہ کبھی اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا، اس شرط کے پورا ہونے میں اکثر شبہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں پکا ارادہ ہوا یا نہیں، کیونکہ توبہ کرتے وقت دل میں یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ توبہ تو کر رہا ہوں لیکن میں کتنا اس توبہ پر قائم رہوں گا اور کتنا میں اپنے آپ کو اس گناہ سے بچا سکوں گا، اس بارے میں دل میں شبہ رہتا ہے، اس شبہ کی موجودگی میں عزم مکمل ہوا یا نہیں، اور جب عزم مکمل ہونے میں شبہ ہے تو توبہ مکمل ہونے میں بھی شبہ ہوا، کیونکہ عزم کے بغیر توبہ مکمل نہیں ہوتی، اس وجہ سے آدمی پریشانی کا شکار رہتا ہے۔

دھڑکا لگا رہنا توبہ کے منافی نہیں

غور سے سمجھ لیجئے کہ توبہ کے پکا اور سچا ہونے کے لئے عزم بیشک ضروری ہے، لیکن اگر دل میں ساتھ ساتھ یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ میں عزم تو کر رہا ہوں مگر پتہ نہیں میں آئندہ اس عزم پر قائم رہوں گا یا نہیں، اپنے نفس پر بھروسہ نہیں ہے، تو محض یہ دھڑکا لگا رہنا توبہ کی تکمیل کے منافی نہیں، جب پکا ارادہ کرلیا تو دھڑکے کے باوجود وہ ارادہ پکا ہی رہے گا اور اس کی وجہ سے توبہ میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا انشاء اللہ۔

دھڑکے کی ایک مثال

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے آپ نے ایک عمارت تعمیر کی اور اپنی طرف سے اس کو پختہ بنایا، ستون پختہ بنائے، بیم پختہ بنائے، لوہا اور سیمنٹ مناسب لگایا، لیکن ساتھ میں یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ اگر کسی دن زلزلہ آیا تو عمارت گر جائے گی، یا کسی وقت اس کے اوپر بم گر گیا تو یہ عمارت گر جائے گی، اب زلزلہ کا بھی اندیشہ ہے، بم گرنے کا بھی اندیشہ ہے اور کوئی حادثہ پیش آجانے کا بھی اندیشہ ہے لیکن ان اندیشوں کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ عمارت پکی نہیں بنی، بلکہ عمارت تو پکی ہے، البتہ اندیشے اپنی جگہ ہیں، ان اندیشوں کے لئے کوئی اور تدبیر اور سدِ باب سوچو لیکن اس کی وجہ سے عمارت کو کمزور نہیں کہا جائے گا۔

آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم توبہ کے لئے کافی ہے

یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں اور نہ مجھے یہ بات کہنے کی جرأت ہوتی، بلکہ یہ بات میں نے اپنے ایک بزرگ حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازِ صحبت تھے اور بڑے عجیب وغریب صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے، وہ اپنی ہر مجلس میں اس بات پر بہت زور دیا کرتے تھے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دین پر چلنا بڑا مشکل ہے، ارے میاں! روزانہ توبہ کر لیا کرو۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ یہ فرماتے ہیں کہ توبہ کر لیا کرو، ہمیں تو اسی میں شک رہتا ہے کہ پکی توبہ ہوئی یا نہیں؟ کیونکہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم پکا ہوا یا نہیں؟ اس وقت انہوں نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ اپنی طرف سے تو گناہ نہ کرنے کا عزم کر لو، پھر یہ جو گناہ ہو جانے کا اندیشہ اور دھڑکا لگا ہوا ہے، یہ توبہ کے منافی نہیں۔ بعد میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات میں کئی مقامات پر یہ مضمون نظر سے گزرا، حضرت والا نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ یہ اندیشہ توبہ کے منافی نہیں، اس لئے جب ایک مرتبہ اپنی طرف سے پکا ارادہ کر لیا کہ انشاء اللہ یہ کام نہیں کروں گا تو بس توبہ ہوگئی۔

توبہ کے نتیجے میں گناہ نامۂ اعمال سے مٹا دیے جاتے ہیں

اور توبہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت تم نے یہ توبہ کر لی، اس وقت تک تمہارے جتنے گناہ تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مٹا دیئے۔ اس بارگاہ کا کرم دیکھئے کہ توبہ کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ وہ گناہ معاف کر دیئے اور معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ تمہارے نامہ اعمال میں درج تو ہیں

لیکن اس پر تمہیں سزا نہیں دیں گے بلکہ توبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ تمہارے نامۂ اعمال سے بھی مٹا دیئے جائیں گے، اب وہ گناہ تمہارے نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے نہیں ہوں گے تا کہ آخرت میں ان گناہوں کو دیکھ کر شرمندگی بھی نہ ہو کہ میں نے فلاں کام کیا تھا۔

آج کل حساب کا جو طریقہ ہے، اس میں تین کالم ہوتے ہیں، ایک ڈیبٹ کا، ایک کریڈٹ کا، ایک بیلنس کا، یعنی یہ آمدنی ہوئی اور یہ خرچ ہوا اور یہ بیلنس ہوا۔ لہٰذا جتنے پیسے کسی کو دیئے ہیں وہ بھی حساب میں لکھے ہوئے ہیں اور جتنے پیسے کسی سے لیے ہیں وہ بھی حساب میں لکھے ہوئے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں حساب اس طرح ہے کہ وہاں ڈیبٹ کوئی نہیں، کیونکہ جب تم نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل کے ساتھ معافی مانگ لی تو اب تمہارے ڈیبٹ کے خانے میں کچھ بھی لکھا ہوا نہیں ہوگا بلکہ جو کچھ لکھا ہوگا وہ کریڈٹ کے خانے میں ہوگا اور اس پر تمہیں انشاء اللہ ثواب ملے گا۔

’’ستّار‘‘ ستّاری کا معاملہ فرمائیں گے

بخاری شریف میں حدیث ہے کہ ایک بندے کو اللہ تعالیٰ بلائیں گے اور سرگوشی کے انداز میں اس سے کہیں گے کہ بتا تو نے دنیا میں یہ گناہ کیا تھا؟ وہ کہے گا: جی ہاں! کیا تھا۔ فلاں گناہ کیا تھا؟ وہ کہے گا: کیا تھا۔ فلاں گناہ کیا تھا؟ جی ہاں! کیا تھا۔ گناہ شمار کرانے اور اقرار لینے کے بعد پھر اس بندے سے فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں تیری ستاری کی، تیری پردہ پوشی کی اور کسی کو ان گناہوں کے بارے میں پتہ بھی نہیں چلا، ان گناہوں کو یا میں جانتا ہوں یا تو جانتا ہے، آج میں تیرے ان گناہوں کو معاف کرتا ہوں[1] لہٰذا وہاں آخرت میں بھی کسی دوسرے کو وہ گناہ نہیں دکھائیں گے، اللہ تعالیٰ ایسی ستاری فرمائیں گے۔ بہر حال! اگر ایک مرتبہ توبہ پکی ہوگئی تو انشاء اللہ وہ گناہ معاف ہوگئے اور نامۂ اعمال سے مٹا دیئے گئے۔

اللہ تعالیٰ سے ہی توبہ پر استقامت طلب کرو

اب اگر اس بات کا دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کہیں یہ گناہ دوبارہ ہم سے سرزد نہ ہو جائے تو یہ دھڑکا لگا کرے اور اس کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! میں نے توبہ کر لی، لیکن اے اللہ! جب تک آپ کی توفیق نہیں ہوگی، میں اپنے قوتِ بازو سے اس توبہ پر قائم نہیں رہ سکتا، آپ اپنے فضل و کرم سے مجھے اس پر استقامت عطا فرمائیے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب قول اللہ تعالی ألا لعنة اللہ علی الظالمین، رقم: ۲۲٦۱، مسند أحمد، رقم: ۵۱۷۹

اے اللہ! ہمارے اعضاء آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں

ایک دعا میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ إِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِيَنَا وَجَوَارِحَنَا بِيَدِكَ لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْهَا شَيْئًا فَإِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ بِنَا فَكُنْ أَنْتَ وَلِيَّنَا وَاهْدِنَا إِلٰى سَوَاءِ السَّبِيْلِ))(۱)

''اے اللہ! ہمارے دل، ہماری پیشانیاں اور ہمارے اعضاء و جوارح، یہ سب آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، ان میں سے کسی چیز کا آپ نے ہمیں مالک نہیں بنایا، نہ ہم اپنے دل کے مالک ہیں، نہ اپنی زبان کے مالک ہیں اور نہ اعضاء کے مالک ہیں، لہٰذا جب یہ سب اعضاء آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں تو اے اللہ! آپ ہی ہمارے کارساز بن جائیے اور ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرمائیے''

اے اللہ! وہ چیز عطا فرما جو آپ کو راضی کردے

یہ بھی اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! ہم نے توبہ تو کرلی لیکن یہ دل، یہ دماغ، یہ زبان، یہ ہاتھ، یہ پاؤں اور یہ اعضاء و جوارح سب آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اے اللہ! اب آپ ہی ان کو ثابت قدم رکھئے، ہمارے بس میں نہیں اور یہ دعا کریں:

((اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ سَأَلْتَنَا مِنْ أَنْفُسِنَا مَا لَا نَمْلِكُهٗ إِلَّا بِكَ فَأَعْطِنَا مِنْهَا مَا يُرْضِيْكَ عَنَّا))(۲)

''اے اللہ! آپ نے ہم سے ایسی ایسی چیزوں کا مطالبہ فرمایا ہے جس کو پورا کرنے کی ہمارے اندر طاقت نہیں جب تک کہ آپ کی توفیق نہ ہو، لہٰذا اے اللہ! ہمیں وہ چیزیں عطا فرما جو آپ کو ہم سے راضی کردیں''

اس لئے اپنی توبہ پکی کرلو اور جو دھڑکا لگا ہوا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو اور یہ کہو: اے اللہ! آپ ہی اس توبہ پر ثابت قدم رکھئے۔

پختہ کار بننے کے لئے لمبا سفر درکار ہے

دوسرا مسئلہ وہ ہے جو ان صاحب نے حضرت والا سے پوچھا کہ ہر ہفتہ توبہ کرتا ہوں اور ایک

(۱) تاریخ بغداد، رقم: ۷۱۷۷ (۱۳/۱۹۹)

(۲) كنز العمال، رقم: ۳۶۲۵ (۲/۱۷۸)، جامع الأحاديث، رقم: ٤٩٥٥ (٦/١٧٥)

دن کے بعد تمام تہیہ غارت ہو جاتا ہے، ایک دن توبہ کی، دوسرے دن پھر گناہ میں مبتلا ہو گیا۔ یہ معاملہ بکثرت ہم سب کو پیش آتا رہتا ہے۔ حضرت والا نے ان صاحب کے جواب میں پہلے تین شعر لکھے۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی
صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامی

یہ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے، یعنی کوئی صوفی صحیح معنوں میں صوفی نہیں ہو سکتا جب تک وہ پانی کے ساتھ تلچھٹ بھی نہ پیئے، جب صوفی پانی کے ساتھ تلچھٹ پینا گوارا کر لیتا ہے تو بالآخر اللہ تعالیٰ اس کو صاف کر دیتے ہیں، اور انسان کے اندر جو خامی ہے اس کو دور ہونے میں اور انسان کو پختہ کار بننے میں ایک دن ایک رات کافی نہیں بلکہ اس کے لئے لمبا سفر چاہئے۔

مرتے دم تک فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا

حضرت والا نے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا شعر نقل فرمایا کہ

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راستے میں ہر وقت تراش و خراش کرنی پڑتی ہے اور مرتے دم تک ایک لمحے کے لئے بھی فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا۔ یعنی یہ نہیں کہ آدمی مطمئن ہو کر بیٹھ جائے کہ اب ہماری اصلاح ہو گئی۔ یہ نفس جو تمہارے ساتھ لگا ہوا ہے، یہ کسی وقت بھی تمہیں ڈس جائے گا، لہٰذا کسی وقت بھی بے فکر ہو کر نہیں بیٹھنا۔ جیسے آپ نے پھلواری لگائی تو اب اس پھلواری کو قاعدے میں رکھنے کے لئے کٹائی چھٹائی کی ضرورت ہر وقت لگی رہے گی، کبھی ایک پتہ کاٹ دیا، کبھی ٹہنی کاٹ دی، کبھی پھول کاٹ دیا، اگر اس پھلواری کو ویسے ہی چھوڑ دو گے تو وہ جھاڑ جھنکاڑ بن جائے گا۔ اسی طرح انسان کو اپنے نفس کی تراش خراش کرنی پڑتی ہے اور اس کی ہر وقت نگرانی کرنی پڑتی ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئے۔

آخر کار عنایت ہو ہی جاتی ہے

تیسرا شعر یہ لکھا کہ

تا دمِ آخر دمے آخر بود
کہ عنایت با تو صاحب سر بود

یعنی اگر اللہ تعالیٰ آخر دم تک اپنی طرف رجوع کی توفیق عطا فرما دیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف

سے عنایت ہو ہی جاتی ہے۔

جب توبہ ٹوٹے دوبارہ عزم کرلو

یہ تین شعر لکھنے کے بعد حضرت والا نے یہ جملہ لکھا:

''حاصل یہ کہ فکر و کوشش جاری رکھنا چاہئے، انشاء اللہ تعالیٰ اسی طرح کامیابی ہو جائے گی''۔(۱)

یعنی اس گُر کو پلّے باندھ لو، وہ یہ کہ جو بار بار توبہ ٹوٹ رہی ہے، اس سے مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا ہے، بلکہ اس کا مقابلہ اس طرح کرنا ہے کہ جب توبہ ٹوٹے پھر دوبارہ پختہ عزم کرو، پھر توبہ ٹوٹے پھر دوبارہ پختہ عزم کرلو، یہ فکر اور کوشش آخر وقت تک جاری رہنی چاہئے، مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئے کہ یہ میری توبہ بار بار ٹوٹ رہی ہے لہٰذا توبہ کرنے کو چھوڑ دو، یہ مایوسی ٹھیک نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ پختہ عزم کرو۔

انسان کے ارادے میں بڑی قوت ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ارادے میں بڑی قوت دی ہے، انسان نے اپنے ارادے کی طاقت سے بڑے بڑے پہاڑ سر کرلیے ہیں، ارادے کی طاقت سے چاند پر پہنچ گیا، اور مریخ پر پہنچ گیا، ایٹم بم بنالیا، ہائیڈروجن بم بنالیا، اسی ہمت کی طاقت سے یہ سب کام کرلیے، اس ہمت کی طاقت کو نفس و شیطان کا مقابلہ کرنے کے لئے استعمال کرو، گناہ سے بچنے کے لئے اس کو استعمال کرو، اگر ایک مرتبہ گر گئے تو پھر دوبارہ تازہ دم ہو کر اُٹھو اور اپنے عزم کو تازہ کرو کہ میں پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ اس گناہ کا مقابلہ کروں گا۔

اگر ہتھیار ڈال دیئے تو مارا گیا

ابتداء میں کشمکش ہوتی ہے، جب انسان قرآن و حدیث سنتا ہے یا بزرگوں کی باتیں سنتا ہے تو دل میں خیال آتا ہے کہ گناہوں کو چھوڑنا چاہئے اور صحیح راستے پر آنا چاہئے، لیکن نفس جو گناہ کا عادی بنا ہوا ہے وہ دوسری طرف لے جانا چاہتا ہے، اب نیکی کے تقاضے اور برائی کے تقاضے میں کشتی ہوتی ہے، نفس چونکہ موٹا ہے اور اس کے اندر گناہ کرنے کی طاقت موجود ہے جبکہ نیکی کے تقاضے کے اندر ابھی اتنی طاقت پیدا نہیں ہوئی، اس لئے جب دونوں کے درمیان کشتی ہوتی ہے تو یہ نفس نیکی کے تقاضے کو

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۹۴

گرادیتا ہے، اب اگر نیکی کے تقاضے نے اس نفس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے کہ اس نفس نے مجھے ڈھادیا، اب اس نفس سے مقابلہ کرنا بیکار ہے تو یہ نیکی کا تقاضا مارا گیا۔

پھر ہمیشہ نفس گرتا رہے گا

لیکن اگر نیکی کے تقاضے کو یہ سمجھایا کہ تو جتنی مرتبہ پڑے گا، اتنی مرتبہ تیرے اندر مزید قوت پیدا ہوگی، تو اب وہ نیکی کا تقاضا نئی طاقت کے ساتھ، نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ اُٹھے گا، اب جب دوبارہ نفس سے مقابلہ ہوگا تو یہ نیکی کا تقاضا کچھ دیر اس کے مقابلے میں ڈٹا رہے گا، یہ نہیں ہوگا کہ پہلے ہی داؤ میں گر جائے بلکہ پہلی مرتبہ کی بنسبت مقابلہ بہتر ہوگا، البتہ پھر دوبارہ گر جائے گا، پھر اس گرنے کے نتیجے میں دوبارہ اس کے اندر مزید طاقت اور قوت پیدا ہوگی، اب تیسری مرتبہ جب مقابلہ ہوگا تو یہ نفس کا ڈٹ کر برابر کا مقابلہ کرے گا، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نیکی کا تقاضا نفس کو بھی چت کردے گا۔ زندگی بھر یہ ہوتا رہے گا کہ کبھی اس نے گرادیا اور کبھی اس نے گرادیا، کبھی یہ غالب آگیا اور کبھی وہ غالب آگیا، جب بار بار مقابلہ ہوتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر اتنی طاقت عطا فرمادیں گے کہ پھر ہمیشہ نیکی کا تقاضا نفس کو گرائے گا اور نفس ہمیشہ گرتا رہے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

مرتے دم تک نفس سے ہوشیار رہنا ہے

لیکن قاعدہ یہ ہے کہ بڑے سے بڑا پہلوان بھی غافل ہو کر نہیں بیٹھتا کہ اب چونکہ میں بہت بڑا پہلوان ہوگیا ہوں، لہٰذا اب مجھے کسرت کی اور مشق کرنے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اس کو بھی روزانہ کسرت کرنی ہے اور روزانہ بادام کھانے ہیں اور روزانہ اپنی غذا کا اہتمام کرنا ہے، اگر اس نے یہ چیزیں چھوڑ دیں تو وہ ٹھُس ہو جائے گا اور کسی کا مقابلہ کرنے کی طاقت اس میں نہیں رہے گی، لہٰذا اگر طاقت حاصل کر کے پہلوان بن بھی گیا اور نفس وشیطان کو گرا بھی دیا، تب بھی اس کو ہر وقت ریاضت کی ضرورت ہے تاکہ اس کی قوت اسی درجے میں بحال رہے، اسی لئے فرمایا:

تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

آخر دم تک ایک لمحے کے لئے بھی فارغ ہونے کا موقع نہیں ہے۔

جامِ مے توبہ شکن، توبہ میری جام شکن

بہر حال! توبہ ٹوٹنے کا معاملہ ہر انسان کے ساتھ پیش آتا ہے، لہٰذا گھبرانے کی ضرورت نہیں، جب توبہ ٹوٹے، دوبارہ توبہ کرلو اور أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ پڑھ لو۔ ایک شاعر

کا بڑے مزے کا شعر ہے کہ۔

جامِ مے توبہ شکن، توبہ میری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

جب جامِ مے سامنے آتا ہے تو توبہ ٹوٹ جاتی ہے اور جب توبہ آتی ہے تو جام کو توڑ دیتی ہے، اس کے نتیجے میں میرے سامنے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ ''پیمانوں'' کا لفظ شاعر نے یہاں دو معنوں میں استعمال کیا ہے، ایک تو ''عہد'' کے معنی میں، کیونکہ ''عہد'' کو بھی ''پیمان'' کہتے ہیں اور دوسرے ''گلاس'' کے معنی میں، کیونکہ شرب کے گلاس کو پیمانہ کہا جاتا ہے، اس لئے اس نے کہا کہ ''سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے'' یعنی ایک طرف پیمان ٹوٹ رہے ہیں اور دوسری طرف پیمانے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ ''پیمان'' میں اتنی طاقت عطا فرمادیتے ہیں کہ پھر ''پیمانے'' ہی ٹوٹتے ہیں، ''پیمان'' نہیں ٹوٹے۔ اگر آدمی شروع میں گھبرا جائے کہ یہ میری توبہ ٹوٹ رہی ہے اور ہار کر بیٹھ جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس و شیطان نے غلبہ پالیا، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی اس سے حفاظت فرمائے۔

توبہ تازہ کرتے رہیں

جتنی مرتبہ بھی توبہ ٹوٹے، اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً دوبارہ عہد کو تازہ کرو اور دوبارہ توبہ کی طرف بڑھو، ان کی بارگاہ تو ایسی ہے جیسے کسی شاعر نے کہا کہ

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
از کفر و کبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

یعنی اور جگہوں کا تو معاملہ یہ ہے کہ اگر تم ایک مرتبہ جرم کرو گے، دو مرتبہ کرو گے، تین مرتبہ کرو گے، معاف کردیئے جاؤ گے، لیکن اگر روزانہ ہی جرم کرو گے تو وہ کان سے پکڑ کر باہر نکال دیئے جاؤ گے اور یہ کہہ دیا جائے گا کہ اب یہاں مت آنا، مگر ان کی بارگاہ ایسی ہے کہ ان کی طرف سے یہ اعلان ہو رہا ہے کہ اگر سو بار بھی توبہ توڑ چکے ہو تو پھر میرے پاس واپس آجاؤ، پھر بھی تمہاری توبہ قبول کرلوں گا۔ مرتے دم تک نزع کی آخری حالت سے پہلے پہلے تک توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لہٰذا گھبرانے کی ضرورت نہیں بلکہ کوشش جاری رکھنی چاہئے، انشاء اللہ اسی طرح کامیابی ہو جائے گی، ہمت نہ ہارو اور مایوس ہو کر مت بیٹھو اور کوشش کو چھوڑ کر نہ بیٹھ جاؤ، اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن کامیابی عطا فرمادیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے باتیں کیا کرو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں! اللہ تعالیٰ سے اس طرح باتیں کیا کرو کہ یا اللہ! میں اس گناہ کے سیلاب سے نہیں بچ سکوں گا، یہ میرے بس میں نہیں، میں آپ سے مانگتا ہوں کہ آپ ہی مجھے بچائیے ورنہ پھر مجھ سے مؤاخذہ نہ فرمائیے گا، ہر چیز آپ کی قدرت میں ہے، میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اپنے اللہ میاں سے اس طرح کی باتیں کیا کرو، اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دعا رد نہیں فرماتے۔

حضرت یونس علیہ السلام سے سبق لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یونس علیہ السلام کے قصے کے بیان میں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب بات بیان فرمائی ہے، وہ یہ کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تین دن رہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات درمیان میں عرض کر دوں کہ اہلِ حکمت کے نزدیک اس کائنات میں کوئی خبر خبرِ محض نہیں بلکہ ہر خبر بمعنی انشاء ہوتی ہے، یعنی ہر خبر سے کوئی نہ کوئی امر یا نہی نکلتا ہے کہ یہ کام کرو یا یہ کام نہ کرو اور ہر خبر سے کوئی نہ کوئی سبق ملتا ہے، لہٰذا قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جتنے واقعات بیان فرمائے ہیں، ان کے اندر کوئی نہ کوئی سبق ہے۔

بہر حال! حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تین دن رہے، وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا، اس اندھیرے میں یہ کام کیا کہ اپنے رب کو پکارا اور کہا:

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾

آگے اللہ تعالیٰ نے بڑے مزے کی بات بیان فرمائی:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾(۱)

جب اس نے ہمیں پکارا تو ہم نے اس کی پکار کو قبول کر لیا اور اس کو ہم نے اس گھٹن سے نجات دے دی اور اسی طرح ہم مؤمنوں کو نجات دیتے ہیں یا نجات دیں گے۔

کیا ہر مؤمن پہلے مچھلی کے پیٹ میں جائے گا؟

اب سوال یہ ہے کہ اس آخری جملے کا کیا مطلب ہے کہ ہم اسی طرح مؤمنوں کو نجات دیں گے، کیا ہر مؤمن پہلے مچھلی کے پیٹ میں جائے گا، وہاں جا کر یہ کلمات "لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ

(۱) الأنبياء: ۸۸

اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" پڑھے گا تو ہم اس کو بھی مچھلی کے پیٹ سے نجات دے دیں گے؟ ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں، بلکہ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی تم کسی بھی قسم کی ظلمت میں گھر جاؤ، گناہوں کی ظلمت میں یا ماحول کی ظلمت میں یا شر کی ظلمت میں گھر جاؤ تو ہمیں پکارو اور کہو "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ"، اور جب تم ہمیں پکارو گے تو جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو ہم نے نجات دی تھی، اسی طرح ہم تمہیں بھی نجات دیں گے۔

اس ذات کو پکارو

لہٰذا ہم لوگ جو نفس کی اور گناہوں کی تاریکی میں گھرے ہوئے ہیں، اس کا حل یہ ہے کہ اسی ذات کو پکارو جس نے اس نفس کو پیدا کیا اور جو خالقِ نور بھی ہے اور خالقِ ظلمت بھی ہے، جو خالقِ خیر بھی ہے اور خالقِ شر بھی ہے، اسی کو پکارو اور کہو کہ اے اللہ! آپ نے ان کو پیدا فرمایا ہے، آپ ہی ان کو ہم سے دور فرما دیجئے، تم اس طرح پکارو گے تو اللہ تعالیٰ نجات عطا فرما دیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سو مرتبہ استغفار فرماتے

خلاصہ یہ کہ توبہ ایسی چیز نہیں کہ اگر کسی وقت وہ ٹوٹ جائے تو آدمی مایوس ہو کر بیٹھ جائے۔ نہیں، بلکہ ساری عمر یہ کام کرتے رہنا ہے۔ ارے ہم اور آپ کس شمار وقطار میں ہیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اپنے پروردگار سے دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں، جبکہ آپ گناہوں سے معصوم ہیں اور گناہوں کا صدور آپ سے ممکن نہیں اور کوئی بھول چوک ہو بھی گئی تو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے اعلان فرما دیا ہے کہ وہ سب معاف ہے، اس کے باوجود آپ فرماتے ہیں کہ میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔(۱)

پچھلے درجات سے استغفار ہوتا تھا

بزرگوں نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے استغفار فرماتے تھے کہ آپ کے درجات میں ہر لمحہ اور ہر لحظہ ترقی ہو رہی تھی، جب آپ اگلے درجے پر پہنچتے تو پچھلا درجہ آپ کو بمنزلہ گناہ کے نظر آتا تھا، آپ اس پر استغفار فرماتے تھے، لہٰذا ہمیں تو ہر آن استغفار کرتے رہنا چاہئے،

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والإستغفار، باب استحباب الإستغفار والاستکثار منه، رقم: ۴۸۷۰، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب الإستغفار، رقم: ۳۸۰۵، مسند أحمد، رقم: ۱۷۱۷۴

جب غلطی ہو جائے پھر لوٹ آؤ، پھر غلطی ہو جائے تو پھر استغفار کرلو، یہی عمل کرتے رہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غلبہ عطا فرمادیں گے انشاء اللہ اور نفس و شیطان تمہارے قابو آجائیں گے بشرطیکہ تم ان کے سامنے ڈٹ جاؤ۔

شیطان کا مکر کمزور ہے

قرآن کریم نے فرمایا:

﴿إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا﴾(۱)

یعنی شیطان کا مکر بڑا کمزور ہے، بظاہر تو یہ بڑا فوں فاں کرتا ہے اور بڑا رعب دار معلوم ہوتا ہے لیکن جو آدمی ایک مرتبہ اس کے سامنے ڈٹ گیا، یہ وہیں غبارے کی طرح بیٹھ جاتا ہے، بس اس کے سامنے ڈٹ جانا شرط ہے۔ بعض لوگ فوں فاں بہت کرتے ہیں اور شور مچاتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں لیکن ان کے اندر کچھ بھی نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کوئی دوسرا آدمی ان کے مقابلے میں ڈٹ جائے تو وہ وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ روس کا سربراہ بڑی ڈینگیں مارا کرتا تھا کہ میں یہ کردوں گا، وہ کردوں گا، ساری دنیا کو تباہ و برباد کردوں گا، روزانہ اس کا ایک نیا بیان آجاتا تھا، لوگ پریشان تھے کہ معلوم نہیں یہ کیا چیز ہے، لیکن جب بیٹھا تو بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نفس و شیطان کو ایسا ہی بنایا ہے، ان کا مقابلہ کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے اور یہ بڑے طاقتور معلوم ہوتے ہیں لیکن ذرا سا آدمی ان کے سامنے ڈٹ جائے تو یہ بتاشے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں، اس لئے ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، جتنی مرتبہ غلطی ہو جائے اور گناہ ہو جائے، ہر مرتبہ لوٹ آؤ۔

توبہ کے معنی ہیں لوٹ آنا

توبہ کے معنی کیا ہیں؟ توبہ کے لفظی معنی ہیں "لوٹ آنا" یہ تَابَ يَتُوبُ تَوْبَةً سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں لوٹ کے آجانا، یعنی گناہ کرنے کے نتیجے میں تم بھٹک گئے تھے، اب واپس لوٹ آؤ، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم لوٹو گے تو میں لوٹوں گا، یعنی جب تم توبہ کرو گے تو میں گناہ معاف کردوں گا، لہٰذا جب بھی ذرا پٹری سے اُتر گئے، پھر واپس پٹری پر آجاؤ، پھر اُتر گئے پھر واپس آجاؤ، یہ نہ ہو کہ بس جب پٹری سے اُتر گئے تو بس اب اُتر ہی گئے، اب واپس لوٹنے کی ضرورت نہیں، یہ نہ کرو بلکہ دوبارہ لوٹ آؤ۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

(۱) النساء: ۷۶

گناہ چھوڑنے کا عزم کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

چند روز سے توبہ کا بیان چل رہا ہے اور اصلاحِ نفس کے راستے میں سب سے پہلا قدم توبہ کی تکمیل ہے۔آگے ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اگر توبہ کے وقت عزمِ ترک فی المستقبل نہ ہو تو عزم عمل فی المستقبل بھی نہ ہو بلکہ عزم عمل سے ذہن خالی ہو، اگر اس طرح خالی الذہن ہو کر بھی توبہ ندامت کے ساتھ ہو گئی تو توبہ صحیح ہو گئی“(۱)

تکمیلِ توبہ کی تین شرطیں

اس ملفوظ میں مختصر لفظوں میں بہت بڑا مضمون حضرت والا نے بیان فرمایا ہے جس میں ہم جیسے کمزوروں کے لئے بڑی تسلی کا سامان ہے۔توبہ کے بارے میں تمام حضرات صوفیاء یہ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں سے توبہ کی تکمیل ہوتی ہے، پہلی چیز یہ ہے کہ جو گناہ سرزد ہوا ہے، دل سے اس پر ندامت اور شرمندگی ہو کہ مجھ سے یہ غلطی ہو گئی، دوسری چیز یہ ہے کہ اس گناہ کو فوراً چھوڑ دے، مثلاً ایک شخص نے جھوٹ بولا، اب اس جھوٹ سے توبہ کرنا چاہتا ہے تو پہلے تو ندامت پیدا کرے کہ مجھ سے یہ کیسی غلطی ہو گئی کہ میں نے یہ جھوٹ بول دیا اور پھر فوراً جھوٹ بولنا چھوڑ دے، تیسری چیز یہ ہے کہ آئندہ کے لئے یہ عزم کرے کہ میں آئندہ ہرگز یہ کام نہیں کروں گا، جب یہ تین چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو پھر توبہ کامل ہو جاتی ہے۔

تیسری چیز کے پائے جانے میں شک

جہاں تک پہلی دو چیزوں کا تعلق ہے یعنی اس گناہ پر نادم اور شرمندہ ہونا اور اس گناہ کو چھوڑ دینا، ان دونوں پر عام طور پر عمل ہو جاتا ہے اور ان کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔جہاں تک تیسری

☆ اصلاحی مجالس (۵/۳۰۶ تا ۳۲۴)، رمضان المبارک، بعد از نماز ظہر، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) انفاس عیسیٰ: ص ۱۹۷

چیز کا تعلق ہے یعنی آئندہ کے لئے پختہ ارادہ کرنا کہ میں آئندہ ہرگز اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا، اس میں یہ شبہ رہتا ہے کہ میرا یہ عزم کامل ہوا یا نہیں؟ جبکہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کرنا توبہ کا لازمی جز ہے، جب اس میں شبہ پیدا ہو گیا تو اس کے نتیجے میں توبہ مشکوک ہو گئی، اور جب توبہ مشکوک ہو گئی تو گناہ معاف نہیں ہوں گے، کیونکہ اگر توبہ صحیح ہو تو اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کا وعدہ ہے، لیکن اگر توبہ کے صحیح ہونے میں ہی شک ہو گا تو گناہ کے معاف ہونے میں بھی شک ہو جائے گا۔ بہر حال! اس تیسری چیز کے بارے میں اکثر و بیشتر دِلوں میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے۔

رات کو سونے سے پہلے توبہ کر لیا کرو

ہمارے بزرگ حضرت بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ توبہ پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ چنانچہ میں ایک دن ان کے پاس گیا تو اس وقت ایک نوجوان اپنے کسی کام سے ان کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس نوجوان میں سر سے لے کر پاؤں تک دینداری کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص بھی ان کے پاس آتا تو اس کے کان میں کوئی دین کی بات ڈال دیتے تھے، چاہے وہ کسی بھی مقصد سے آیا ہو، لہٰذا جب وہ نوجوان واپس جانے لگا تو آپ نے اس سے فرمایا:

''بیٹا ایک بات سنتے جاؤ، وہ یہ کہ لوگ دین کو بہت مشکل سمجھتے ہیں کہ دین پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ہے، ارے کچھ بھی مشکل نہیں، بس رات کو سونے سے پہلے تھوڑی دیر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کر لیا کرو''

وہ نوجوان آدمی تھا، نہ نماز، نہ روزہ، نہ کوئی اور عبادت کرتا تھا لیکن حضرت والا نے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ بس توبہ کر لیا کرو۔

اللہ والے لوگوں کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں

اب نیا آدمی جو ناشناسِ ادا ہو گا وہ تو اس واقعہ کو دیکھ کر یہ سمجھے گا کہ حضرت نے اس کو کھلی چھٹی دے دی کہ تو جو چاہے کرتا رہ، نماز بھی نہ پڑھ، روزہ بھی نہ رکھ اور گناہ بھی کرتا رہ، لیکن رات کو بیٹھ کر توبہ کر لیا کر۔ یہ چھوٹ دینا ان کے لئے کیسے درست ہوا؟

بات دراصل یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندے جن کو اللہ تعالیٰ فہم عطا فرماتے ہیں، یہ حضرات لوگوں کو شکار کرتے ہیں اور شکار کرنے کے لئے جس طرح دانہ ڈالا جاتا ہے، اسی طرح ان لوگوں کا بھی شکار کرنے کا ایک طریقہ ہے، کیونکہ اگر اس نوجوان سے یہ کہہ دیتے کہ تو روزانہ پانچ وقت نماز پڑھا کر اور یہ جو بے ہودہ لباس پہن رکھا ہے اس کو چھوڑ اور تو نے داڑھی منڈائی ہوئی ہے، اس کو چھوڑ، تو وہ

نوجوان پہلے دن ہی بھاگ جاتا اور کبھی واپس نہ آتا۔ اس لئے حضرت نے اس سے صرف ایک بات یہ فرمادی کہ رات کو بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرلیا کر۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑ دیا

بات دراصل یہ ہے کہ اگر اس نوجوان نے اس بات پر عمل کرلیا کہ روزانہ رات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرنے لگا تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا تعلق جڑ گیا، کیونکہ اب تک وہ غفلت میں تھا، اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق کٹا ہوا تھا اور کبھی اس کے دل میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا خیال بھی نہیں آتا تھا، اب جس وقت توبہ کرے گا تو ایک لمحہ کے لئے وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑے گا، اور جب روزانہ اس پر عمل کرے گا تو یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف نہ کھینچ لیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾(۱)

عام طور پر اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور منتخب کرلیتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جس بندے کے بارے میں ارادہ فرمالیا کہ اس کو ہدایت دینی ہے اور اس کو اپنا مقرب بنانا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ عام طور پر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے۔

اس آیت کا دوسرا ترجمہ

لیکن ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ عربی جاننے والوں سے پوچھو تو وہ بتائیں گے کہ اس آیت کا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ مجھے کھینچ لیا جائے۔ کیونکہ لفظ "يَشَآءُ" کے فاعل کی ضمیر جس طرح "اللّٰه" کی طرف لوٹ سکتی ہے، اسی طرح لفظ "مَنْ" کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، اور "يَهْدِيٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ" کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف اس شخص کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے تعلق جوڑ لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ضرور کھینچ لیں گے

لہٰذا جب ایک بندے نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑ لیا، چاہے تھوڑی دیر کے لئے تعلق

(۱) الشوریٰ: ۳

جوڑا ہو اور کہا کہ یا اللہ! میں توبہ کرتا ہوں اور اے اللہ! مجھے اپنی طرف کھینچ لیجئے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کھینچ ہی لیں گے۔ بہر حال! بندے کا کام یہ ہے کہ ذرا سا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور اس سے مانگے کہ اے اللہ! مجھے آپ کیوں محروم فرماتے ہیں، مجھے بھی اپنی طرف کھینچ لیجئے، اور اے اللہ! اگر میرے اندر شرائط نہیں پائی جاتیں تو وہ شرائط میرے اندر پیدا کر دیجئے، اگر میرے اندر وہ تقاضے اور اوصاف نہیں ہیں تو اے اللہ! ان اوصاف کو میرے اندر پیدا کرنا آپ کی قدرت میں ہے، اے اللہ! وہ اوصاف اور تقاضے میرے اندر پیدا کر دیجئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ سے مانگو اور جب ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے تعلق جڑ گیا تو بس یہ تبدیلی کا نقطۂ آغاز ہے۔ اب جو شخص غفلت میں زندگی گزار رہا ہے، اس کو نہ تو اللہ تعالیٰ کا خیال اور نہ رسول ﷺ کا خیال، نہ نماز کا خیال، نہ روزے کا خیال، نہ آخرت کا خیال، نہ دین کا خیال، اس شخص کو حضرت نے یہ فرمادیا کہ تو رات کو بیٹھ کر توبہ کرلیا کر، اگر اس شخص نے اس پر عمل کرلیا ہوگا تو یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ شخص واپس نہ آیا ہو اور دین کی طرف نہ آیا ہو۔ بہر حال! دوسروں کی اصلاح کے لئے بزرگ یہ طریقے اختیار کرتے ہیں، اسی طرح حضرت بابا صاحب نے اس نوجوان کے کان میں یہ بات ڈال دی اور وہ چلا گیا۔

میرے دل میں عزم کے بارے میں اشکال

میں نے حضرت بابا صاحب سے عرض کیا کہ حضرت! میرے دل میں توبہ کے بارے میں یہ اشکال رہتا ہے کہ میں نے توبہ تو کرلی لیکن کیا پتہ کہ وہ توبہ صحیح ہوئی یا نہیں؟ کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ گناہ چھوڑنے کا جو عزم کیا ہے وہ پختہ ہوا یا نہیں، اس کا اطمینان نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ سے یہ تو کہہ دیا کہ اے اللہ! مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا، میں آپ سے معافی مانگتا ہوں، اے اللہ! مجھے معاف فرمادیجئے، اور وقتی طور پر اس گناہ کو چھوڑ بھی دیا لیکن آئندہ ساری عمر کبھی اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا، یہ عزم پکا ہوا یا نہیں، اس کا اطمینان نہیں ہوتا اور یہ عزم توبہ کی تیسری شرط ہے، جب اس شرط کے پائے جانے میں شبہ ہوتا ہے تو توبہ کے درست ہونے میں بھی شبہ رہتا ہے کہ یہ توبہ درست ہوئی یا نہیں؟

آئندہ گناہ ہو جانے کا اندیشہ عزم کے منافی نہیں

حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میری بات سن کر فرمایا کہ ارے بھائی! تم نے اپنے ذہن میں عزم کا بہت بڑا لمبا چوڑا معیار قائم کر رکھا ہے، ارے بھائی! عزم کے معنی یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ارادہ کرلو کہ میں یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا، پھر اگر دل میں یہ وسوسے، خدشات اور اندیشے آرہے ہیں کہ معلوم نہیں کہ میں اس عزم پر ثابت قدم رہوں گا یا نہیں؟ میں اس عزم کو پورا کرسکوں گا یا نہیں؟ یہ

اندیشے اور وسوسے عزم کی صحت کے منافی نہیں۔

مثلاً اپنی طرف سے یہ عزم کرلیا کہ یا اللہ! اب میں جھوٹ نہیں بولوں گا، اب غیبت نہیں کروں گا، اب اپنی نگاہ غلط جگہ پر نہیں اُٹھاؤں گا۔ اب اس عزم کے بعد دل میں یہ وسوسہ آرہا ہے کہ پتہ نہیں میں اس عزم پر قائم رہ سکوں گا یا نہیں، تو اس وسوسے کو آنے دو، کیونکہ یہ وسوسہ عزم کے مکمل ہونے میں مانع نہیں، بس عزم مکمل ہوگیا۔

پھر اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرو

پھر اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! میں نے تو اپنی طرف سے عزم کرلیا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اس عزم پر کیسے قائم رہوں گا، اے اللہ! آپ ہی مجھے توفیق عطا فرمایئے، آپ ہی مجھے استقامت عطا فرمایئے اور آپ ہی مجھے اس عزم پر قائم اور دائم رکھئے۔ بس توبہ مکمل ہوگئی۔ اس لئے کہ ''عزم'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے ارادہ کرلینا، اب اس ارادہ پر میں کتنا قائم رہوں گا اور کتنا قائم نہیں رہوں گا، اس کی پیشینگوئی تو کوئی بھی نہیں کرسکتا، یہ کسی کے بس میں نہیں، یہ اختیار سے باہر ہے، اور جب اختیار سے باہر ہے تو انسان اس کا مکلف نہیں، کیونکہ انسان اپنے اختیاری امور کا مکلف ہے۔ حضرت بابا صاحب نے ایسی بات فرمادی کہ الحمدللہ، اس سے بڑا اطمینان ہوا اور تسلی حاصل ہوگئی۔

عزمِ عمل سے ذہن خالی ہونا چاہئے

بعد میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ملفوظ نظر سے گزرا جس میں وہی بات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے جو حضرت بابا صاحب نے فرمائی، فرمایا:

> ''اگر توبہ کے وقت عزمِ ترک فی المستقبل نہ ہو تو عزمِ عمل فی المستقبل بھی نہ ہو بلکہ عزمِ عمل سے ذہن خالی ہو، اگر اس طرح خالی الذہن ہو کر بھی توبہ ندامت کے ساتھ ہوگئی تو توبہ صحیح ہوگئی''

یعنی اصل بات تو یہ ہے کہ توبہ کے وقت گناہ نہ کرنے کا ارادہ ہو کہ میں آئندہ کبھی کسی قیمت پر بھی یہ گناہ نہیں کروں گا، لیکن اگر کسی وجہ سے اس ارادہ کا استحضار نہ رہا تو کم از کم اس گناہ کے دوبارہ کرنے کا بھی ارادہ نہ ہو بلکہ عزمِ عمل سے ذہن خالی ہو، یعنی نہ تو یہ ارادہ ہو کہ یہ گناہ کروں گا اور نہ یہ ارادہ ہو کہ یہ گناہ نہیں کروں گا، دونوں سے ذہن خالی ہو تب بھی توبہ درست ہے۔ کیوں درست ہے؟

توبہ ''ندامت'' ہی کا نام ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ویسے ہی اپنی طرف سے بات نہیں کرتے بلکہ اس کے پیچھے کوئی دلیل ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی دلیل کے طور پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی طرف اشارہ فرمایا:

((اَلنَّدَمُ تَوْبَۃٌ))(۱)

یعنی توبہ کا اصل عنصر اور اصل جوہر جس سے توبہ وجود میں آتی ہے، وہ ہے ندامت اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پشیمان ہونا، نادم ہونا، شرمسار ہونا۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے گناہ پر نادم ہے تو اس کے دل میں یہ بات ہے کہ یا اللہ! میں نہیں چاہتا کہ میں یہ عمل دوبارہ کروں، بس اس ندامت کے نتیجے میں توبہ درست ہوگئی اور جب توبہ درست ہوگئی تو انشاء اللہ وہ گناہ بھی معاف ہوگیا۔ اب اس وسوسہ کے اندر مت پڑو کہ پتہ نہیں عزم مکمل ہوا یا نہیں۔

توبہ کے بعد یہ دعا کرلو

البتہ ہر توبہ کے بعد یہ دعا ضرور کرلو کہ اے اللہ! میں نے یہ توبہ تو کرلی لیکن اے اللہ! جب تک آپ توفیق نہیں دیں گے، میں اس توبہ پر قائم نہیں رہ سکوں گا، اے اللہ! اپنی رحمت سے اس توبہ پر قائم رہنے کی آپ ہی توفیق عطا فرما دیجئے۔ فرض کرو کہ پھر غلطی سے کسی وقت بھٹک گئے تو پھر توبہ کرلو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ مرتے دم تک کھلا رکھا ہے، جب تک نزع کی کیفیت اور سکرات الموت کی کیفیت طاری نہیں ہو جاتی، اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لہٰذا غلطی ہو جائے پھر لوٹ آؤ۔

توبہ کے بھروسہ پر گناہ مت کرو

البتہ کوئی شخص اس سے یہ نہ سمجھے کہ اب گناہ کی چھوٹ ہوگئی، بس گناہ کرتے رہو اور توبہ کرتے رہو اور گناہ پر جرأت حاصل کرلو۔ یہ نہیں، بلکہ اپنی طرف سے اس بات کا پورا اہتمام کرنا ہے کہ گناہ سے بچے، آدمی اگر گناہوں پر جری ہو جائے ۔ العیاذ باللہ ۔ اور توبہ کی اُمید پر گناہ کا ارتکاب کرلے کہ بعد میں توبہ کرلوں گا تو یہ بڑی خطرناک بات ہے، یہ شیطان کا انتہائی خطرناک اور زہریلا داؤ ہے۔ یاد رکھئے! توبہ کے بھروسہ پر گناہ کا ارتکاب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ''تریاق'' کے بھروسہ پر زہر پی لینا۔

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، رقم: ٤٢٤٢، مسند أحمد، رقم: ٣٣٧٨

بچھو کے کاٹے کا عمل

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کو سمجھانے کے لئے اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند میں سانپ، بچھو بہت ہوا کرتے تھے، آئے دن لوگوں کو کاٹتے رہتے تھے، اس لئے وہاں سانپ بچھو کے کاٹنے کے بہت سے عمل بھی ہوتے تھے، اگر وہ عمل کرلیا جائے تو وہ زہر اُتر جاتا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بچھو کے کاٹنے کا ایک عمل سیکھ لیا تھا، اگر کسی کو بچھو کاٹ لیتا تو حضرت والد صاحب وہ عمل فرماتے تو اسی وقت بلا تاخیر وہ درد ختم ہوجاتا اور زہر اُتر جاتا، چنانچہ لوگ دور دور کے دیہاتوں سے اپنے مریضوں کو لے کر والد صاحب کے پاس آیا کرتے تھے، آپ دم فرما دیتے، وہ درد فوراً ختم ہوجاتا۔ حضرت والد صاحب کا یہ عمل ہر جگہ مشہور ہوگیا۔

بچھو کے کاٹنے کا ایک واقعہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں ایک کوٹھری تھی جو بطور اسٹور کے استعمال ہوتی تھی، اس زمانے میں بجلی تو نہیں تھی، لالٹینوں کا زمانہ تھا، ایک دن ہماری والدہ صاحبہ اس کوٹھری سے کوئی چیز نکالنا چاہتی تھیں۔ گھر میں ایک لالٹین تھی جو اس وقت حضرت والد صاحب کے پاس تھی اور حضرت والد صاحب لالٹین کی روشنی میں لکھنے پڑھنے کا کام کر رہے تھے۔ ہماری والدہ صاحبہ نے والد صاحب سے کہا کہ میں ذرا کوٹھری میں جانا چاہتی ہوں، آپ یہ لالٹین تھوڑی دیر کے لئے مجھے دے دیں تاکہ میں فلاں چیز اُٹھالاؤں۔ حضرت والد صاحب چونکہ کچھ لکھنے میں مشغول تھے، اس کو چھوڑنا گراں ہو رہا تھا، والد صاحب نے فرمایا کہ یہ تو چھوٹی سی چیز ہے، بغیر لالٹین کے اُٹھالائیں۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ وہ چیز تو سامنے ہی رکھی ہے لیکن مجھے یہ خطرہ ہے کہ اگر میں نے اندھیرے میں وہاں پاؤں رکھ دیا تو کہیں مجھے کوئی بچھو نہ کاٹ لے۔ اس وقت حضرت والد صاحب کے منہ سے یہ بات نکلی کہ ''اے میاں! اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا تو کیا ہوگا، میرے پاس آجانا، فوراً دم کردوں گا، انشاء اللہ ٹھیک ہوجائے گا'' مطلب یہ تھا کہ ویسے تو بچھو کے کاٹنے کا صرف احتمال ہی ہے، لیکن اگر کاٹ بھی لیا تو مجھے دم کرنا تو آتا ہی ہے، دم کردوں گا۔

سارا عمل بیکار ہوگیا

اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ والدہ صاحبہ جیسے ہی کوٹھری میں داخل ہوئیں اور اندر پاؤں رکھا، بچھو نے کاٹ لیا۔ حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں اُٹھ کر فوراً ان کے پاس گیا اور جلدی سے وہی

بچھو کے کاٹے کا عمل شروع کیا، اب میں وہ عمل کرتا ہوں لیکن وہ عمل اثر ہی نہیں کرتا۔ جس عمل سے سینکڑوں بچھوؤں کے کاٹے کا علاج کیا، وہی عمل آج کر رہا ہوں لیکن ذرہ برابر اثر نہیں ہو رہا ہے۔ اس عمل کی جتنی طاقت تھی وہ ساری صرف کر دی، مگر درد کی لہریں ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ بالآخر دوسروں سے علاج کرانے پر مجبور ہوئے، اپنا علاج سارا بیکار ہو گیا۔

کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کارگر نہیں

یہ واقعہ سنا کر فرماتے تھے کہ دیکھو! میں نے اس عمل کے بھروسے پر بچھو کے کاٹنے سے احتیاط نہ کی اور یہ خیال کیا کہ اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا تو کیا ہے، عمل ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک سبق تو یہ دیا کہ یہ جتنے علاج ہیں، چاہے وہ علاج دواؤں سے ہوں یا وہ علاج عملیات سے ہوں، کوئی علاج اس وقت تک کارگر نہیں ہوتا جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو، ایک ہی دوا ایک مریض کو فائدہ کر رہی ہے اور ایک مریض کو نقصان کر رہی ہے جبکہ دونوں کی بیماری ایک ہے۔

دوا اللہ تعالیٰ سے سوال کرتی ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک معالج تھے "ڈاکٹر ہاشمی صاحب" اسی سال ان کی عمر تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میری ساری زندگی کی ڈاکٹری کا تجربہ یہ ہے کہ جب دوا مریض کے پیٹ میں جاتی ہے تو اندر جا کر اللہ تعالیٰ سے پوچھتی ہے کہ یا اللہ! کیا کروں؟ فائدہ کروں یا اُلٹی پڑ جاؤں؟ جب وہاں سے کوئی جواب ملتا ہے تو عمل کرتی ہے۔ بہر حال! حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک سبق تو یہ دیا کہ تم یہ جو اپنے عمل پر بھروسہ کیے بیٹھے ہو، یاد رکھو! اس عمل میں کچھ نہیں رکھا، کوئی وظیفہ، کوئی تعویذ، کوئی گنڈا اس وقت تک کارگر نہیں ہوتا جب تک ہمارا حکم نہ ہو، اس وظیفہ پر اور اس تعویذ پر بھروسہ کر لینا اور یہ کہنا کہ بیماری آجائے تو کیا، ہمارے پاس علاج موجود ہے، یہ بات غلط ہے۔ ایک تو اس واقعہ نے یہ سبق دیا۔

دوا کے بھروسہ پر بیماری کو دعوت مت دو

دوسرا سبق یہ دیا کہ انسان کے پاس کتنا ہی بہتر سے بہتر علاج موجود ہو، لیکن اس علاج کی موجودگی کی وجہ سے بیماری کو مت بلاؤ بلکہ بیماری سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو اور یہ دعا کرو کہ اے اللہ! ہم بیماری کے متحمل نہیں ہیں۔

بہر حال! حضرت والد صاحب اسی مضمون کو بیان کرنے کے لئے یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ

توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرلینا، یہ ایسا ہے جیسے عمل کے بھروسہ پر بچھو سے کٹوالینا، چونکہ دوا اور عمل موجود ہے، لہٰذا بچھو سے کٹوالوں۔ ارے! کیا پتہ کہ بچھو کے کاٹنے کے بعد دوا استعمال کرنے کا موقع بھی ملے گا یا نہیں؟ اور اگر دوا استعمال کرنے کا موقع مل بھی گیا تو وہ دوا کارآمد بھی ہوگی یا نہیں؟

توبہ کی مہلت ملے گی یا نہیں؟

لہٰذا جس وقت تم توبہ کے بھروسہ پر گناہ کا ارتکاب کرنے کا ارادہ کررہے ہو، کیا پتہ کہ گناہ کے بعد توبہ کی مہلت بھی ملے یا نہ ملے؟ کیا اس بات کی گارنٹی ہے کہ گناہ کے بعد توبہ کی مہلت ضرور مل جائے گی؟ اور اگر بالفرض توبہ کی مہلت مل بھی گئی تو توبہ کی توفیق ملے گی یا نہیں؟ کیونکہ گناہ کے اندر نحوست ہوتی ہے، وہ نحوست یہی ہے کہ گناہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے غفلت پیدا کرتا ہے، انسان کو غافل بنادیتا ہے۔ تم نے تو یہ سوچ کر گناہ کرلیا کہ بعد میں توبہ کرلوں گا، لیکن گناہ نے اپنی نحوست دکھائی اور تمہارے دل میں غفلت پیدا کردی اور گناہ کی لذت میں ایسے محو ہوئے کہ توبہ کرنے کا خیال ہی نہ آیا اور توبہ کرنے کی توفیق ہی نہ ہوئی۔

گناہ کے نتیجے میں ذوق خراب ہوجاتا ہے

پھر گناہ کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچتا ہے اور انسان کی عقل خراب کردیتا ہے، گناہ کی وجہ سے انسان کی مَت اُلٹی ہوجاتی ہے، اچھا عمل بُرا لگنے لگتا ہے اور بُرا عمل اچھا لگنے لگتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کا ذائقہ خراب ہوجائے تو اس کے نتیجے میں اچھی خاصی میٹھی چیز اس کو کڑوی لگنے لگتی ہے، اسی طرح گناہ کے نتیجے میں انسان کا ذوق خراب ہوجاتا ہے اور اس کی عقل ماری جاتی ہے، کڑوی چیز کو میٹھی اور میٹھی چیز کو کڑوی سمجھنے لگتا ہے، ایسی حالت میں پھر توبہ کی توفیق کیسے ہوگی؟ پھر انسان دوسرے گناہوں کی طرف اور بڑھ جاتا ہے۔

گناہ کا حجاب ختم ہوجاتا ہے

اور جب تک انسان گناہ نہیں کرتا تو اس کی طبیعت میں اس گناہ کو کرنے میں ایک رکاوٹ ہوتی ہے، ایک بند ہوتا ہے، جب تم نے توبہ کے بھروسہ پر اس گناہ کو ایک مرتبہ کرلیا تو وہ بند ٹوٹ گیا اور اب غلط کام کرنے کی جرأت پیدا ہوگئی، اب یہ جرأت تم سے اور گناہ کرائے گی۔ اس لئے کبھی بھی توبہ کے بھروسہ پر گناہ ہرگز مت کرو بلکہ ہر قیمت پر گناہ سے بچو۔

موت سے پہلے توبہ کا دروازہ کھلا ہے

البتہ اگر گناہ سے بچنے کی کوشش کے باوجود کسی وقت پھسل گئے اور غلطی ہوگئی اور گناہ میں مبتلا ہوگئے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے اور مرتے دم تک کھلا رہے گا، جب چاہو آجاؤ اور توبہ کرلو۔ قرآن کریم نے صاف صاف فرمادیا:

﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّيْ تُبْتُ الْئٰنَ﴾(۱)

یعنی توبہ اس شخص کی نہیں ہے جو ساری عمر اس بھروسہ پر گناہ کرتا رہا کہ جب مرنے لگوں گا تو توبہ کرلوں گا، پھر جب موت کا وقت آیا تو کہنے لگا کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ ایسی توبہ تو فرعون نے بھی کرلی تھی جب دریا میں ڈوبنے لگا تو کہنے لگا:

﴿اٰمَنْتُ أَنَّهٗ لَآ إِلٰهَ إِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا إِسْرَآءِيْلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾(۲)

یعنی میں اس ذات پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمانوں میں سے ہوتا ہوں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب ایمان لاتا ہے جبکہ وقت گزر چکا۔

ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں بلکہ توبہ اس شخص کی قبول ہوتی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾(۳)

یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں جو نادانی میں برا کام کرگزرتے ہیں اور پھر وہ جلد ہی لوٹ آتے ہیں۔ یعنی جن سے جہالت اور نادانی میں گناہ ہوگیا تو پھر فوراً جلد از جلد لوٹ آئیں،

---

(۱) النساء: ۱۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ”توبہ کی قبولیت ان کے لئے نہیں جو برے کام کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت آکھڑا ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے اب توبہ کرلی ہے“

(۲) یونس: ۹۰، ۹۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ”میں مان گیا کہ جس خدا پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں بھی فرماں برداروں میں شامل ہوتا ہوں“ (جواب دیا گیا کہ:) ”اب ایمان لاتا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مسلسل فساد ہی مچاتا رہا“

(۳) النساء: ۱۷، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ”اللہ نے توبہ قبول کرنے کی جو ذمہ داری لی ہے وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی سے کوئی برائی کرڈالتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کرلیتے ہیں، چنانچہ اللہ ان کی توبہ قبول کرلیتا ہے“

دیر نہ کریں، یہ نہ سوچیں کہ توبہ کرلیں گے، ابھی تو بہت وقت پڑا ہے، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور مرتے دم تک کھلا ہوا ہے، یہ مت سوچو، اس لئے کہ کیا پتہ کہ آخری وقت کب آجائے۔

توبہ ٹوٹ جائے تو دوبارہ توبہ کرلو

لہٰذا جو لوگ توبہ کرتے ہیں لیکن اس پریشانی میں رہتے ہیں کہ ہماری توبہ بار بار ٹوٹ جاتی ہے، ایسے لوگ گھبرائیں نہیں بلکہ دوبارہ لوٹ آئیں اور دوبارہ توبہ کرلیں، لیکن ان کا یہ عمل گناہوں پر جرأت پیدا نہ کرے، اس لئے کہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرلینا ایسا ہے جیسے تریاق کے بھروسہ پر زہر پی لیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچے دل سے تمام گناہوں سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

استغفار کے لئے وقت مقرر کرلیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا:

''استغفار جس میں کچھ بھی وقت صرف نہیں ہوتا اور نہایت آسان ہے، بہت بھولتا ہوں''(۱)

یعنی استغفار اتنی آسان چیز ہے کہ اس میں کوئی لمبا چوڑا وقت صرف نہیں ہوتا، ایک لمحہ کے اندر آدمی یہ کہہ دیتا ہے "أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ"، اتنا آسان ہونے کے باوجود میں یہ استغفار کرنا بھول جاتا ہوں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں ان کو لکھا:

''اس حالت میں استغفار بعد خاص کسی وقت مقرر کرلیجئے تاکہ اگر ہر وقت یاد نہ رہ سکے تو قلق نہ ہو''(۲)

ویسے تو استغفار کے لئے نہ وقت مقرر ہے اور نہ تعداد مقرر ہے، اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اپنی ہر غلطی پر استغفار کرنا چاہئے، لیکن ایسی حالت میں جبکہ آدمی استغفار کرنا بھول جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ کوئی خاص وقت مقرر کرلے کہ میں فلاں وقت استغفار کیا کروں گا اور عدد بھی متعین کرلے کہ اتنی مرتبہ استغفار کروں گا، مثلاً ایک تسبیح پڑھوں گا۔

استغفار کے وقت ذہن میں گناہوں کا استحضار

چنانچہ ہمارے بزرگ طالبین کو جب معمولات بتاتے ہیں تو ان میں استغفار کی ایک تسبیح ضرور شامل ہوتی ہے۔ وہ استغفار یہ ہے:

"أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ. یا
أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَلِيَّ الْعَظِيْمَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ.

☆ اصلاحی مجالس (۵/۲۵۶ تا ۲۶۸)، رمضان المبارک، بعد از نماز ظہر، دار العلوم، کراچی

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۴ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۴

اس استغفار کو خاص وقت میں اور خاص تعداد میں کر لینا مفید ہوتا ہے، اور یہ استغفار محض زبانی حرکت سے نہ ہو بلکہ استغفار کے وقت ذہن میں ذرا اس بات کا دھیان پیدا کرے کہ مجھ سے نہ جانے کتنی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، نہ جانے کتنے گناہ سرزد ہوئے ہیں، بہت سے گناہ وہ ہیں جن کو میں جانتا ہوں اور بہت سے گناہ وہ ہیں جن کو میں جانتا بھی نہیں ہوں، اے اللہ! میں آپ سے ان سب گناہوں کی معافی مانگ رہا ہوں۔

حضور ﷺ کی ایک خوبصورت دعا

حضور اقدس ﷺ نے ایک دعا تلقین فرمائی، یہ دعا آپ سے اس وقت پڑھنا ثابت ہے جب آپ حج یا عمرہ کے موقع پر صفا مروہ کی سعی کے دوران میلین اخضرین میں دوڑا کرتے تھے، وہ دعا یہ ہے:

((رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاعْفُ عَنَّا وَتَكَرَّمْ وَتُجَاوِزْ عَمَّا تَعْلَمْ فَإِنَّكَ تَعْلَمُ مَا لَا نَعْلَمُ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ))(۱)

''اے اللہ! میری مغفرت فرمایئے اور رحم فرمایئے اور درگزر فرمایئے اور مجھ پر کرم فرمایئے اور میرے ان گناہوں سے درگزر فرمایئے جو آپ جانتے ہیں، اس لئے کہ آپ وہ جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے، بیشک آپ سب سے زیادہ معزز اور مکرم ہیں''

اس دعا میں آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو گناہ میرے علم میں ہیں، ان کو معاف فرمایئے بلکہ یہ فرمایا کہ جو گناہ آپ کے علم میں ہیں، میں ان سے معافی طلب کرتا ہوں، آپ اپنی رحمت سے وہ سب معاف فرما دیجئے۔ اور ساتھ میں آپ نے یہ بھی فرما دیا کہ آپ وہ سب جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے، نہ جانے کتنے گناہ ایسے ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کا بھی ہمیں احساس نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نامۂ اعمال میں گناہوں کا اضافہ ہو رہا ہے اور ہمیں پتہ بھی نہیں، اس لئے روزانہ ایک تسبیح استغفار کی پڑھ لی جائے تو انشاء اللہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ گناہوں سے نجات بھی عطا فرمائیں گے اور اگر گناہوں کا صدور بھی ہوگا تو استغفار کی برکت سے معاف بھی فرما دیں گے۔

پہلے استغفار پھر دوسرے اذکار

پھر استغفار کے سلسلے میں مشائخ کے مذاق مختلف ہیں، بعض مشائخ تو یہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی اپنے روزانہ کے معمولات پورے کرنے بیٹھے تو استغفار سے شروع کرے، دوسری تسبیحات بعد میں کرے، استغفار سے شروع اس لئے کرے کہ پہلے پاک وصاف ہو جائے پھر آگے بڑھے، اس

(۱) إحياء علوم الدين (۳/۷۳)

لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح ،تحمید، تقدیس وغیرہ یہ سب انوارات ہیں، ان انوارات کو حاصل کرنے سے پہلے ان کے قابل تو بن جائے۔ لہٰذا پہلے استغفار کرے اور پھر دوسرے اذکار کرے۔

پہلے دوسرے اذکار پھر آخر میں استغفار

جبکہ بعض دوسرے مشائخ یہ فرماتے ہیں کہ استغفار آخر میں کرے، اس لئے کہ قرآن کریم میں نیک بندوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے رات کو کم سوتے ہیں اور اللہ جل شانہ کے ذکر میں، نماز میں، عبادات میں رات گزارتے ہیں اور پھر سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں تاکہ یہ استغفار ان کوتاہیوں کو بھی شامل کر لے جو ان عبادات میں پائی گئیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! رات کو ہم نے عبادت تو کی لیکن آپ کی شایانِ شان عبادت نہ ہو سکی، مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ، اور جب ان عبادات میں ہونے والی کوتاہیوں سے بھی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی گئی تو اب یہ عبادات کامل اور مکمل ہو گئیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول ہو گئیں۔ بہرحال! استغفار کے بارے میں مشائخ کے مذاق مختلف ہیں، لہٰذا جس شخص کا جس مذاق کی طرف رجحان زیادہ ہو، اس مذاق کو اختیار کر لے، دونوں راستے بزرگوں کے بتائے ہوئے ہیں۔

ماتحتوں پر زیادتی کی صورت میں معافی کی تفصیل

آگے ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''شاگردوں کو ان کی کوتاہی پر بے وقوف پاگل وغیرہ کہہ دینا چنداں مذموم نہیں، اس لئے اس سے استغفار کی ضرورت نہیں کہ تمام طلبہ جماعت کے سامنے معافی چاہی جائے بلکہ بعض اوقات خلافِ مصلحت ہے کہ سبب ہے ان کی جسارت و جرأت اور فسادِ اخلاق کا، البتہ زجر میں اعتدال سے تجاوز نہ ہو، وعلى هذا مريدين وعيال وخدم ونحوهم من التابعين''(۲)

شاگردوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا

جو حضرات اکثر و بیشتر تعلیم و تدریس کے کام میں مشغول رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے دل

(۱) الذاریات: ۱۷، ۱۸ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۴

میں فکر عطا فرماتے ہیں، ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات شاگردوں کو ڈانٹنا پڑتا ہے اور بُرا بھلا کہنا پڑتا ہے، بعض اوقات تھوڑا بہت مارنا بھی پڑتا ہے اور ان افعال سے ظاہر ہے کہ دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے اور دوسرے کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے اور یہ ایسا گناہ ہے کہ اس سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ جس کو تکلیف پہنچائی جائے، اس سے معافی مانگے، اور جب تک اس سے معافی نہیں مانگے گا اور وہ شخص معاف نہیں کرے گا، وہ گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوگا۔

شاگردوں سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں

اس ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اصول بتادیا کہ اگر استاذ شاگرد کو ڈانٹے یا بُرا بھلا کہے یا تھوڑا سا مارلے تو اس پر شاگرد سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں بلکہ بعض اوقات معافی مانگنا مضر ہوتا ہے، اس لئے کہ جو شریر طبیعت کا شاگرد ہوگا وہ اس کا اُلٹا اثر لے گا کہ اچھا استاذ جی بھی ہم سے معافی مانگ رہے ہیں، لہٰذا آئندہ اور زیادہ شرارت کرو اور زیادہ گستاخی کرو، کیونکہ اگر استاذ کسی وقت ڈانٹ ڈپٹ کریں گے تو بعد میں ہم سے معافی بھی مانگیں گے، اس کے نتیجے میں ان کے اندر اور زیادہ جرأت اور جسارت پیدا ہوجائے گی، اس لئے ان سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اصول ہر اس شخص میں جاری ہوگا جو آپ کے زیرِ تربیت ہو، چاہے وہ شاگرد ہو، چاہے مرید ہو، چاہے بیٹا ہو۔

زیرِ تربیت افراد میں یہ اصول کیوں؟

زیرِ تربیت افراد میں یہ اصول کیوں جاری ہوگا؟ اس لئے کہ جب ایک شخص نے اپنے آپ کو آپ کی تربیت میں دے دیا اور اس نے یا اس کے سرپرست نے یہ درخواست کی کہ آپ اس کی تربیت کریں، اور شاگرد استاذ کے پاس جب پڑھنے کے لئے آتا ہے تو وہ ایک طرح سے یہ درخواست کرتا ہے کہ آپ میری تربیت کریں، اسی طرح جو مرید شیخ کے پاس آتا ہے وہ یہ درخواست لے کر آتا ہے کہ آپ میری تربیت کریں اور اس درخواست کے اندر یہ بات بھی شامل ہے کہ میں آپ کو یہ حق دیتا ہوں کہ آپ میری تربیت کی خاطر جو طریقہ مناسب سمجھیں، وہ طریقہ اختیار کریں، لہٰذا اگر میری تربیت کے لئے مجھے ڈانٹنے کی ضرورت ہو تو بیشک مجھے ضرور ڈانٹیں، اور اس تربیت کے اندر تھوڑی بہت پٹائی بھی داخل ہے بشرطیکہ وہ ضرب غیر مبرح ہو، اس سے زیادہ مارنا کسی طرح بھی حلال نہیں، کیونکہ ایسی مار کی ممانعت منصوص ہے۔ بہرحال! اگر استاذ نے کسی شاگرد کو پاگل یا بیوقوف کہہ دیا تو یہ کہنے کا حق استاذ کو حاصل ہے اور انشاء اللہ اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، لہٰذا ان الفاظ کے کہنے پر طلبہ سے معافی مانگنے کی بھی ضرورت نہیں۔

زجر میں اعتدال پر قائم رہیں

البتہ استاذ خود اس کا خیال کرے کہ زجر کرنے میں اعتدال سے تجاوز نہ ہو، یہ نہ ہو کہ جتنی ضرورت تھی اس سے زیادہ ڈانٹ دیا، یا جتنی ضرورت تھی اس سے زیادہ مار دیا، اس کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ لیکن اب درمیان میں کون خط کھینچ کر بتائے کہ اتنا ڈانٹنا جائز تھا اور اس سے زیادہ ناجائز تھا، یا اتنا مارنا جائز تھا اور اس سے زیادہ مارنا ناجائز تھا، یہ خط کھینچنا انسان کے لئے آسان نہیں، بلکہ اس کے لئے شیخ کی صحبت کی ضرورت ہوتی ہے، شیخ کی صحبت میں رہ کر شیخ سے اس کے بارے میں سوال کرے کہ میں کس حد تک ڈانٹ سکتا ہوں اور کس حد تک مار سکتا ہوں، کیونکہ اس کے بارے میں دو اور دو چار کر کے کوئی اصول بتانا بڑا مشکل ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو مار رہے تھے اور ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرمایا:

((لَعَّانِيْنَ وَصِدِّيْقِيْنَ كَلَّا وَرَبِّ الْكَعْبَةِ))(۱)

یعنی ایک طرف صدیق بنتے ہیں اور دوسری طرف لعنتیں بھی کر رہے ہیں، رب کعبہ کی قسم! یہ دونوں باتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر تلافی کے طور پر اس غلام کو تو آزاد کر دیا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے غلام آزاد فرما دیئے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور اس دوران انہوں نے اس غلام کو اس کے وطن کی طرف نسبت کر کے کوئی تحقیر کا جملہ کہہ دیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سنا تو آپ نے فرمایا:

((إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ))(۲)

(۱) شعب الإيمان (٢٩٤/٤) رقم: ٥١٥٤، كنزالعمال (١١١٦/٣) رقم: ٨١٨٩، الترغيب والترهيب، (٣١٢/٣) رقم: ٤٢١٢

(۲) صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب المعاصي من أمر الجاهلية ولا يكفر صاحبها، رقم: ٢٩، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب اطعام المملوك مما يأكل، رقم: ٣١٣٩، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في حق المملوك، رقم: ٤٤٩٠

اے ابوذر! تم ایسے آدمی ہو کہ تمہارے اندر جاہلیت کی خو باقی ہے، اس لئے کہ تم نے اپنے غلام کو وطنیت کا طعنہ دے دیا۔

بہر حال! اعتدال پر قائم رہنا بہت ضروری ہے، لہٰذا احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اس حد پر پہنچنے سے پہلے رک جائے جہاں یہ شبہ ہو کہ یہ اعتدال کے اندر داخل ہے یا نہیں۔ یہ وصف اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق اور بزرگوں کی صحبت کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے، ورنہ آدمی کے بس کی بات نہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے، بھائی نیاز، میں نے ان کی زیارت کی ہے، سیدھے سادھے بزرگ تھے اور حضرت والا کے خادمِ خاص تھے اور ذرا منہ چڑھے تھے، مگر حضرت کے مزاج شناس بھی تھے، حضرت والا کے پاس جو مریدین اور اہلِ تعلق آیا کرتے تھے یہ ان کے ساتھ ذرا بے تکلف بھی ہو جاتے تھے اور کبھی ان کو تنبیہ بھی کر دیا کرتے تھے کہ یہ کام اس طرح کرو اور یہ کام نہ کرو۔ ایک دن کسی نے حضرت والا سے ان کی شکایت کر دی کہ یہ بھائی نیاز صاحب آپ کے بہت منہ چڑھے ہیں، جو لوگ آپ کے پاس آتے ہیں یہ ان کے ساتھ بد اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ حضرت والا کو یہ سن کر تکلیف ہوئی کہ یہاں آنے والوں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرنا بری بات ہے۔

چنانچہ آپ نے بھائی نیاز کو بلایا اور ڈانٹا کہ بھائی نیاز! یہاں آنے والے لوگوں کے ساتھ تم بد کلامی کرتے ہو اور ان کو ڈانٹتے ہو، ایسا کیوں کرتے ہو؟ بھائی نیاز نے کہا کہ حضرت! اللہ سے ڈرو اور جھوٹ نہ بولو۔ وہ دراصل کہنا یہ چاہتے تھے کہ جو لوگ آپ سے یہ شکایت کر رہے ہیں، وہ اللہ سے ڈریں اور جھوٹ نہ بولیں، اس لئے کہ حقیقت کے خلاف شکایت کر رہے ہیں، لیکن بے خیالی میں ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا کہ حضرت! اللہ سے ڈریں اور جھوٹ نہ بولیں۔ بتایئے اگر کوئی شخص اپنے نوکر کو ڈانٹے اور جواب میں نوکر یہ کہے کہ جھوٹ نہ بولو تو اور زیادہ غصہ آئے گا، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ سنا اور اپنی گردن جھکائی اور استغفر اللہ، استغفر اللہ کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔

یک طرفہ بات سن کر ڈانٹنا

آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کہ جب آپ نے اپنے نوکر کو ڈانٹا اور اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو، تو اس وقت فوراً ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں نے ایک طرف کی بات سن کر اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا اور میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ لوگ تمہاری یہ شکایت کر رہے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟

اس کا بیان سننے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہئے تھا اور یک طرفہ شکایت سن کر ڈانٹنا مناسب نہیں تھا، اس لئے بجائے اس کے کہ اپنی بات پر اڑتے آپ ''استغفر اللہ، استغفر اللہ'' کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔ یہ تھے ''كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ حُدُوْدِ اللهِ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود کے آگے رک جانے والے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ

یہ وصف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا بیان کیا گیا ہے:

''كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ حُدُوْدِ اللهِ''

یعنی اللہ تعالیٰ کی حدود کے آگے رک جانے والے تھے۔ ویسے آپ کے اندر غصہ تھا، مزاج میں تیزی تھی، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی حد سامنے آگئی تو اب مزاج کی ساری تیزی ختم ہوگئی اور سارا غصہ بھی فرو ہوگیا۔ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں تشریف لائے، دیکھا کہ ایک گھر کا پرنالہ مسجد نبوی کی طرف لگا ہوا ہے، آپ نے حکم دیا کہ اس پرنالے کو توڑ دو، اس لئے کہ اس کے پانی سے مسجد نبوی خراب ہوتی ہے، چنانچہ وہ پرنالہ توڑ دیا گیا، یہ غصہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے اور مسجد نبوی کے لئے تھا۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے میرے گھر کا پرنالہ توڑ دیا ہے تو آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ناراض ہوئے اور ان سے فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کر دیا کہ ہمارے گھر کا پرنالہ توڑ دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ پرنالہ مسجد میں گر رہا تھا اور مسجد نبوی کو خراب کر رہا تھا، اس لئے میں نے اس کو توڑ دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہیں یہ پتہ نہیں کہ اس پرنالے کو لگانے کی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اجازت دی تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اچھا! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تھی؟ چنانچہ آپ وہیں جھک کر کھڑے ہوگئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ میری کمر پر کھڑے ہو کر دوبارہ اس پرنالے کو اسی جگہ پر لگا دیں۔ پھر فرمایا کہ خطاب کے بیٹے کی یہ مجال نہیں کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگے ہوئے پرنالے کو توڑے، چنانچہ وہ پرنالہ دوبارہ اسی جگہ لگا دیا گیا اور آج تک وہ پرنالہ مسجد نبوی میں لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ترکی خلافت کے دور کے لوگوں کو یہ عشق عطا فرمایا تھا کہ اب وہ نہ گھر موجود ہے نہ کوئی اور چیز موجود ہے، لیکن چونکہ وہ پرنالہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لگوایا تھا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کا اس طرح سے اکرام کیا تھا، اس لئے وہ پرنالہ اسی جگہ لگا دیا، اب تک اس پرنالہ کی جگہ پر پرنالہ لگا ہوا ہے۔ (۱)

---

(۱) طبقات ابن سعد (۱۲/٤)، کنزالعمال (٦٦/٧)، مجمع الزوائد (٢٠٦/٤)، حياة الصحابة (٤٢٤/٢)

بہرحال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ وصف عطا فرمایا تھا کہ "كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ حُدُوْدِ اللّٰهِ"

یہ چیز صحبت سے حاصل ہوتی ہے

لیکن یہ بات صرف کتابیں پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ کسی کے سامنے رگڑے کھانے سے حاصل ہوتی ہے، جب کسی کے در پر آدمی رگڑے کھاتا ہے تب اللہ تعالیٰ یہ صفت عطا فرما دیتے ہیں، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو پہچان جاتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو یہ وصف عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اخوت، ایک اسلامی رشتہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
﴿وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾(۱)

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((اَلْمُسْلِمُ أَخُوا الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ، وَمَنْ كَانَ فِیْ حَاجَةِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))(۲)

ایک مسلمان کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ دے۔ اور اس پر ظلم اور زیادتی نہ کرے۔ اور اس کو ایذاء رسانی سے بچائے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کے کام آئے، اور اس کی ضرورت اور حاجت کو اپنی استطاعت کی حد تک پورا کرے، اور اگر کوئی مسلمان کسی مشکل یا پریشانی میں گرفتار ہے تو اس کو اس پریشانی سے نکالنے کی کوشش کرے، یہ بات بھی ایک مسلمان کے فرائض میں داخل ہے۔ چنانچہ جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی اس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''بھلائی کا کام کرو، تاکہ تم کو فلاح اور کامیابی حاصل ہو''۔ بھلائی کے اندر سب کچھ آجاتا ہے۔ مثلاً دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنا۔ اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، اس کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنا، اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کو پورا کرنا، یہ سب چیزیں خیر اور بھلائی کے اندر داخل ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۸/ ۱۹۸ تا ۲۰۹)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی۔

(۱) الحج: ۷۷

(۲) صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن...... الخ، رقم: ۴۸۶۷، سنن الترمذي، كتاب الحدود عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الستر على المسلم، رقم: ۱۳۴۵، مسند أحمد، مسند أبي هريرة، رقم: ۷۱۱۸

ایک جامع حدیث

جو حدیث میں نے تلاوت کی، وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہ تو مسلمان کسی دوسرے مسلمان پر ظلم کرتا ہے۔ اور نہ اس کو دشمنوں کے حوالے کرتا ہے۔ یعنی نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ، جو شخص اپنے کسی بھائی کی کسی ضرورت کے پورا کرنے میں لگا ہوا ہو، اس کا کوئی کام کر رہا ہو، تو جب تک وہ اپنے بھائی کا کام کرتا رہے گا، اللہ تعالیٰ اس کے کام بناتے رہیں گے۔ اور اس کی حاجتیں پوری کرتے رہیں گے۔ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، اور جو شخص کسی مسلمان سے کسی تکلیف یا مشقت کی بات دور کرے۔ یعنی وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے کسی مسلمان کی مشکل آسان ہو جائے۔ اور اس کی دشواری دور ہو جائے تو اس دور کرنے والے پر قیامت کے روز جو سختیاں آنے والی تھیں اللہ تعالیٰ ان سختیوں میں سے ایک سختی کو اس سختی کے مقابلے میں دور فرما دیتے ہیں۔ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے۔ مثلاً کسی مسلمان کا ایک عیب پتہ چل گیا کہ اس کے اندر فلاں عیب ہے، یا فلاں خرابی ہے، یا فلاں گناہ کے اندر مبتلا ہے۔ اب یہ شخص اس عیب کی پردہ پوشی کرے، اور دوسروں تک اس کو نہ پہنچائے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے اور اس کے گناہوں کو ڈھانپ دیں گے۔ یہ بڑی جامع حدیث ہے اور متعدد جملوں پر مشتمل ہے۔ جس میں سے ہر جملہ ہماری اور آپ کی توجہ چاہتا ہے۔ ان پر غور کرنے اور ان کو اپنی زندگی کا دستور بنانے کی ضرورت ہے۔

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے

اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جو جملہ ارشاد فرمایا، اس میں ایک اصول بیان فرما دیا:

((اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ))

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے''

لہٰذا انسان کا اپنے بھائی کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے، ہر مسلمان کے ساتھ وہی معاملہ ہونا چاہئے۔ خواہ وہ مسلمان اجنبی ہو۔ اور بظاہر اس کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہ ہو۔ بظاہر اس کے ساتھ دوستی کا کوئی تعلق نہ ہو۔ لیکن تم اس کو اپنا بھائی سمجھو۔ اس ایک جملے کے ذریعہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے امتیازات اور تعصبات کی جڑ کاٹ دی کہ یہ تو فلاں وطن کا رہنے والا

ہے، اور میں فلاں وطن کا رہنے والا ہوں، یہ فلاں زبان بولنے والا ہے، میں فلاں زبان بولنے والا، یہ فلاں خاندان اور قبیلے سے تعلق رکھنے والا، میں فلاں خاندان اور قبیلے سے تعلق رکھنے والا۔ اس ایک جملے نے ان امتیازات اور تعصّبات کی جڑ کاٹ دی جو آج ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی زبان بولتا ہو، کسی وطن کا باشندہ ہو، کسی بھی پیشے سے اس کا تعلق ہو، کسی بھی ذات یا نسل سے اس کا تعلق ہو۔ ہر حالت میں وہ تمہارا بھائی ہے۔

فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے

اسی بات کو قرآن کریم کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑے پیارے انداز میں بیان فرمایا کہ

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (۱)

اس آیت میں پوری انسانیت کا بڑا عجیب منشور بیان فرمایا، فرمایا کہ اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، یعنی تم سب کا سلسلۂ نسب ایک مرد اور ایک عورت یعنی حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ تم سب کے باپ ایک ہیں، یعنی حضرت آدم علیہ السلام، اور تم سب کی ماں ایک ہیں، حضرت حوا علیہا السلام۔ جب سب انسانوں کے باپ ایک، سب انسانوں کی ماں ایک، تو پھر کسی کو دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں۔ پھر ایک سوال پیدا ہوا کہ جب تمام انسان ایک باپ اور ایک ماں کی اولاد ہیں تو اے اللہ! پھر آپ نے مختلف خاندان اور مختلف قبیلے کیوں بنائے؟ کہ یہ فلاں قبیلے کا ہے، یہ فلاں خاندان کا ہے، یہ فلاں گروہ کا ہے، یہ فلاں نسل کا ہے، یہ فلاں زبان بولنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: "لِتَعَارَفُوْا" یعنی یہ الگ الگ خاندان قبیلے اس لئے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اگر سب انسان ایک زبان بولنے والے، ایک وطن ایک نسل ایک خاندان کے ہوتے تو ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ مثلاً تین آدمی ہیں، اور تینوں کا نام "عبداللہ" ہے، تو اب تم پہچان کرنے کے لئے ان کے ساتھ نسبتیں لگا دیتے ہو کہ یہ عبداللہ کراچی کا رہنے والا ہے، یہ لاہور کا اور یہ پشاور کا رہنے والا ہے۔ اس طرح ان قبیلوں ان نسبتوں اور شہروں کے اختلاف سے ایک دوسرے کی پہچان ہو جاتی ہے۔ بس اسی غرض کے لئے ہم نے مختلف شہر اور مختلف زبانیں بنائیں۔ ورنہ کسی کو کسی پر فوقیت اور فضیلت نہیں ہے۔ ہاں صرف ایک چیز کی وجہ سے فضیلت ہو سکتی ہے۔ وہ ہے

(۱) الحجرات: ۱۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لئے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم سب سے زیادہ متقی ہو"

''تقویٰ'' جس کے اندر تقویٰ زیادہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ کریم اور زیادہ شریف ہے۔ چاہے بظاہر وہ نچلے خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

اسلام اور کفر کا فرق

حضور اقدس ﷺ کی سنت دیکھئے کہ ابولہب جو آپ کا چچا تھا، اور آپ کے خاندان کا ایک بڑا سردار، اس کا تو یہ حال ہے کہ قرآن کریم کے اندر اس کے اوپر لعنت آئی۔ اور ایسی لعنت آئی کہ قیامت تک جو مسلمان بھی قرآن کریم کی تلاوت کرے گا وہ "تَبَّتْ يَدَآ أَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ"[1] کے ذریعہ ابولہب پر لعنت بھیجے گا کہ اس کے ہاتھ ٹوٹیں اور اس پر لعنت ہو۔ بدر کے میدان میں اپنے چچا اور تایوں کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے، ان کے خلاف تلواریں اُٹھائی جا رہی ہے۔

جنت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا مقام

دوسری طرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو حبشہ کے رہنے والے سیاہ فام ہیں، ان کو سینے سے لگایا جا رہا ہے۔ بلکہ آپ ان سے یہ پوچھتے ہیں کہ اے بلال! وہ عمل تو ذرا بتاؤ جس کی وجہ سے میں نے آج کی رات خواب کے اندر جنت دیکھی تو وہاں تمہارے قدموں کی چاپ اور آہٹ اپنے آگے آگے سنی۔ یہ سوال بلال حبشی سے کیا جا رہا ہے جو سیاہ فام ہیں، اور حبشہ کے رہنے والے ہیں۔ اور جن کو سارے عرب کے لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جواب میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یا رسول اللہ، اور کوئی خاص عمل تو میں نہیں کرتا، البتہ ایک عمل ہے جس پر میں شروع سے پابندی کرتا آ رہا ہوں، وہ یہ کہ جب بھی میں دن یا رات میں وضو کرتا ہوں تو اس وضو سے دو چار رکعت نفل ضرور پڑھ لیتا ہوں۔ (جس کو تحیۃ الوضو کہتے ہیں)۔ حضور اقدس ﷺ نے یہ جواب سن کر اس کی تصدیق فرمائی کہ شاید یہی بات ہوگی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنا بڑا مقام عطا فرمایا۔[2]

---

(۱) اللھب: ۱

(۲) صحيح البخاری، كتاب الجمعة، باب فضل الطهور بالليل والنهار وفضل الصلاة بعد الوضوء، رقم: ۱۰۸۱، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل بلال، رقم: ٤٤٩٧، سنن الترمذی، كتاب المناقب عن رسول الله، باب فی مناقب عمر بن الخطاب، رقم: ۳٦۲۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۵۲

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے کیوں؟

بعض اوقات خیال آتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جنت میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے کیسے نکل گئے؟ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے کوئی نہیں نکل سکتا۔ علماء کرام نے فرمایا کہ درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آگے اس لئے نہیں تھے کہ ان کا درجہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھا ہوا تھا، بلکہ دنیا میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جاتے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ راستہ دکھانے کے لئے آگے آگے چلتے، ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہوتی تھی۔ راستے میں اگر کوئی پتھر ہوتا تو اس کو ہٹا دیتے، اگر کوئی اور رکاوٹ ہوتی تو اس کو دور کر دیتے، سامنے سے آنے والے لوگوں پر نظر رکھتے، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سامنے سے کوئی دشمن آ جائے، اور آپ کو تکلیف پہنچا دے۔ چونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ وہ آپ کے آگے آگے چلتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے جنت میں بھی وہی منظر دکھا دیا کہ تم ہمارے حبیب کی دنیا میں اس طرح حفاظت کرتے تھے۔ چلو جنت میں بھی ہم تمہیں آگے رکھیں گے۔ اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت میں اپنے آگے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اسلام کے رشتے نے سب کو جوڑ دیا

یہ مقام اس شخص نے پایا جس کو غلام کہا جاتا تھا، سیاہ فام اور حقیر سمجھا جاتا تھا نسل اور خاندان کے اعتبار سے اس کی کوئی وقعت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں ''ابولہب'' پر قرآن کریم میں لعنت نازل ہو رہی ہے کہ تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ[1] روم کے رہنے والے ''حضرت صہیب'' تشریف لاتے ہیں، اور بڑا اُونچا مقام پاتے ہیں۔ ایران کے رہنے والے حضرت سلمان فارسی نے آکر اتنا اُونچا مقام پایا کہ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ"[2] یعنی سلمان فارسی ہمارے گھر والوں میں شامل ہیں۔ اس طرح آپ نے وطن کے، نسل کے، رنگ کے اور زبان کے بتوں کو توڑ دیا، اور یہ اعلان فرما دیا کہ ہم تو اس ایک اللہ کو ماننے والے ہیں جس نے سارے انسانوں کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا فرمایا۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ[3] اور فرمایا کہ

---

(۱) اللهب: ۱

(۲) المعجم الكبير (۶/۱۰) رقم: ۵۹۰۸، أسد الغابة (۱/۴۶۴)، مصنف ابن أبي شيبة (۷/۶۱۶)، المستدرك للحاكم (۳/۶۹۱) رقم: ۶۵۳۹، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (۳/۲۴)

(۳) الحجرات: ۱۰

تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

جب آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے اس وقت مدینہ طیبہ میں اوس اور خزرج کے قبیلوں کے درمیان لڑائی اور جنگ کی آگ سلگ رہی تھی۔ باپ جب مرتا تو بیٹے کو وصیت کر جاتا کہ بیٹا! اور سب کام کرنا، لیکن میرے دشمن سے انتقام ضرور لینا۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک لڑائی ہوئی ہے، جس کو ''حرب بسوس'' کہا جاتا ہے، چالیس سال تک یہ لڑائی جاری رہی۔ اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ایک شخص کی مرغی کا بچہ دوسرے شخص کے کھیت میں چلا گیا۔ کھیت کے مالک نے غصہ میں آکر مرغی کے بچے کو مار دیا، مرغی کا مالک نکل آیا۔ جس سے زبانی تو تکار شروع ہوئی۔ اور پھر ہاتھا پائی تک نوبت آگئی۔ اس کے نتیجے میں تلواریں نکل آئیں۔ اس کا قبیلہ ایک طرف اور دوسرے کا قبیلہ ایک طرف، دونوں قبیلوں کے درمیان لڑائی شروع ہوئی، اور ایک مرغی کے بچے پر چالیس سال تک متواتر یہ لڑائی جاری رہی۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے تشریف لانے کے بعد ان کو ایمان کی اور کلمہ لا الہ الا اللہ کی لڑی میں پرو دیا کہ ان کے درمیان عداوت کی آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ اور بعد میں ان کو دیکھ کر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے تھے۔ اور ان کے درمیان بھائی چارہ پیدا فرما دیا۔ قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ إِخْوَانًا﴾(۱)

یعنی اس وقت کو یاد کرو جب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ اب ایسا نہ ہو کہ یہ بھائی بھائی کا رشتہ ختم ہو جائے۔ اور پھر دوبارہ اسی جاہلیت کے طریقے کی طرف لوٹ جاؤ۔

آج ہم یہ اصول بھول گئے

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے اس حدیث کے ذریعہ سب سے پہلے یہ اصول بتا دیا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ خواہ وہ کوئی زبان بولتا ہو۔ خواہ وہ کسی بھی قبیلے سے، کسی بھی قوم سے اس کا تعلق ہو۔ لہٰذا اس کے ساتھ بھائی جیسا معاملہ کرو۔ یہ نہ سوچو کہ چونکہ یہ دوسری نسل کا، دوسری قوم کا، یا دوسرے وطن کا آدمی ہے، لہٰذا یہ میرا نہیں ہے، میرا وہ ہے جو میرے وطن میں پیدا ہوا ہو۔ یہ تصور ذہن سے نکالو، اور ہر مسلمان کو اپنا بھائی سمجھو۔ پوری تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ جب کبھی مسلمانوں کو شکست یا زوال کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلمان یہ اصول بھول گئے

(۱) آل عمران: ۱۰۳

کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اور کسی نے درمیان میں پھوٹ ڈال دی کہ یہ تو فلاں قوم کا ہے۔ وہ فلاں نسل کا ہے۔ بس لڑائی شروع ہوگئی اور اس کے نتیجے میں مسلمان تباہ و برباد ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ اس اصول کو ہمارے دلوں میں بٹھادے۔ ہم زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو کیا ہم اس مسلمان کے ساتھ بھائیوں جیسا برتاؤ کرتے ہیں؟ ہر مسلمان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لے، اور اپنا جائزہ لے۔ اگر ایسا برتاؤ نہیں کرتے تو پھر آج کے بعد یہ تہیہ کرلیں کہ ہم ہر مسلمان کے ساتھ اپنے بھائی جیسا سلوک کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ بات ہمارے اندر پیدا فرمادے۔

پھر حدیث کے اگلے جملے میں بھائی سمجھنے کی پہلی علامت یہ بیان فرمائی کہ لَا یَظْلِمُہٗ یعنی مسلمان چونکہ مسلمان کا بھائی ہے، لہٰذا وہ کبھی دوسرے مسلمان پر ظلم نہیں کرے گا۔ اور اس کی جان، اس کے مال، اس کی عزت اور آبرو پر کوئی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اس کے حقوق ضائع نہیں کرے گا۔

مسلمان دوسرے مسلمان کا مددگار ہوتا ہے

آگے فرمایا کہ وَلَا یُسْلِمُہٗ یعنی صرف یہ نہیں کہ اس پر ظلم نہیں کرے گا بلکہ اس کو بے یار و مددگار بھی نہیں چھوڑے گا۔ اگر مسلمان کسی مشکل میں مبتلا ہے، یا کسی پریشانی کے اندر مبتلا ہے، اور اس کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے تو کوئی مسلمان اس کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ وہ یہ نہیں سوچے گا کہ جو کچھ پیش آرہا ہے وہ اس کو پیش آرہا ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق؟ میرا تو کچھ نہیں بگڑ رہا ہے۔ اور یہ سوچ کر الگ ہوجائے۔ یہ کام مسلمان کا نہیں ہے۔ بلکہ مسلمان کے فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ اگر وہ کسی دوسرے مسلمان پر مصیبت ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہا ہے، یا کسی کو مشکل اور پریشانی میں گرفتار پا رہا ہے، تو دوسرے مسلمان کو چاہئے کہ حتی الامکان اس کی پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اور یہ نہ سوچے کہ اگر میں اس کے کام میں لگ گیا تو میرا وقت ضائع ہوجائے گا، یا میں پھنس جاؤں گا۔

موجودہ دور کا ایک عبرت آموز واقعہ

جس دور سے ہم گذر رہے ہیں، یہ دور ایسا آگیا ہے کہ اس میں انسانیت کی قدریں بدل گئیں، انسان انسان نہ رہا۔ ایک وقت وہ تھا کہ اگر کسی انسان کو چلتے ہوئے ٹھوکر بھی لگ جاتی اور وہ گر پڑتا تو دوسرا انسان اس کو اُٹھانے کے لئے اور کھڑا کرنے کے لئے اور سہارا دینے کے لئے آگے بڑھتا۔ اگر سڑک پر کوئی حادثہ پیش آجاتا تو ہر انسان آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن آج ہمارے اس دور میں جو صورت ہو چکی ہے، اس کو میں اپنے سامنے ہونے والے ایک واقعہ

کے ذریعے بیان کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ ایک گاڑی ایک شخص کو ٹکر مارتے ہوئے چلی گئی۔ اب وہ شخص ٹکر کھا کر چاروں شانے چت سڑک پر گر گیا۔ اس واقعہ کے بعد کم از کم بیس، پچیس گاڑیاں وہاں سے گذر گئیں۔ ہر گاڑی والا جھانک کر اس گرے ہوئے شخص کو دیکھتا، اور آگے روانہ ہو جاتا۔ کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ گاڑی سے اُتر کر اس کی مدد کرتا۔ اس کے باوجود آج کے لوگوں کو اپنے بارے میں مہذب اور شائستہ ہونے کا دعویٰ ہے۔ اسلام تو بہت آگے کی چیز ہے، لیکن ایسے موقع پر ایک انسانیت کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اُتر کر دیکھ تو لے کہ اس کو کیا تکلیف پہنچی ہے۔ اور اس کی جتنی مدد کر سکتا ہے کر دے۔ حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں فرمادیا کہ ایک مسلمان یہ کام نہیں کر سکتا کہ وہ دوسرے مسلمان کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا جائے۔ بلکہ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اگر وہ دوسرے مسلمان کو کسی مصیبت میں گرفتار پائے یا کسی پریشانی یا مشکل میں دیکھے تو حتی الامکان اس کی اس پریشانی اور مصیبت کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

حضور ﷺ کا معمول

حضور اقدس ﷺ کا زندگی بھر یہ معمول رہا کہ جب بھی کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہوتا کہ اس کو فلاں چیز کی ضرورت ہے، یا یہ مشکل میں گرفتار ہے تو آپ بے چین ہو جاتے۔ اور جب تک اپنی استطاعت کے مطابق اس کی مدد کی کوشش نہ فرما لیتے، آپ کو چین نہ آتا تھا۔ صرف صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کفار سے معاہدہ کر لیا، اور اس معاہدہ کے نتیجے میں آپ ان مسلمانوں کی مدد نہ کرنے پر اور ان کو واپس کرنے پر مجبور تھے جو مسلمان مکہ مکرمہ سے بھاگ کر مدینہ طیبہ آجاتے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ میں واپس کرنے پر مجبور ہوں۔ اس واقعہ کے علاوہ شاید کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے کسی مسلمان کو مشکل اور تکلیف میں دیکھ کر اس کی مدد نہ فرمائی ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

احسان کا بدلہ احسان ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ اُعْطِيَ عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْيَجْزِ بِهٖ، وَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُثْنِ فَإِنَّ مَنْ أَثْنٰى فَقَدْ شَكَرَ وَمَنْ كَتَمَ فَقَدْ كَفَرَ وَ مَنْ تَحَلّٰى بِمَا لَمْ يُعْطَهٗ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ))(۱)

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے ساتھ کوئی نیکی کی جائے اور اس کے پاس نیکی کا بدلہ دینے کیلئے کوئی چیز موجود ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس نیکی کا بدلہ دے، اور اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے وہ نیکی کا بدلہ دے سکے تو کم از کم یہ کرے کہ جو نیکی اس کے ساتھ کی گئی ہے، اس کا تذکرہ کر کے اس کی تعریف کرے کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ احسان اور یہ نیکی کی ہے، اس لئے کہ جس شخص نے اس کی تعریف کر دی تو گویا کہ اس نے اس کا شکریہ ادا کر دیا، اور اگر اس شخص نے اس نیکی اور احسان کو چھپا کر رکھا تو اس نے اس کی ناشکری کی۔ اور جو شخص اس چیز سے آراستہ ہوا جو اس کو نہیں دی گئی تو اس نے گویا جھوٹ کے دو کپڑے پہنے''

نیکی کا بدلہ

حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں دو باتوں کی تعلیم دی ہے۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، یا کوئی نیکی کرے، تو اس کو چاہئے کہ جس نے اس کے ساتھ نیکی کی

☆ اصلاحی خطبات (۵/۱۶۴ تا ۱۷۲)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی المتشبع بما لم یعطه، رقم: ۱۹۵۷، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی شکر المعروف، رقم: ٤١٧٩

ہے، اس کو اس کا کچھ نہ کچھ بدلہ دے۔ دوسری حدیث میں اسی بدلہ کو "مکافات" سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ بدلہ جس کا ذکر حضورِ اقدس ﷺ فرمارہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس احساس کے ساتھ دوسرے سے اچھا برتاؤ کرے کہ اس نے چونکہ میرے ساتھ نیکی کی ہے تو میں بھی اس کے ساتھ کوئی نیک سلوک کروں۔ یہ بدلہ دینا تو حضورِ اقدس ﷺ کی سنت ہے، اس لئے کہ حضورِ اقدس ﷺ کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی شخص آپ کے ساتھ اچھا معاملہ کرتا، یا کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ اس کو بدلہ دیا کرتے تھے، اور اس کے ساتھ بھی اچھائی کا معاملہ کیا کرتے تھے۔ اس لئے یہ بدلہ تو باعثِ اجر وثواب ہے۔

"نیوتہ" دینا جائز نہیں

ایک بدلہ وہ ہے جو آج ہمارے معاشرے میں پھیل گیا ہے، وہ یہ کہ کسی کو بدلہ دینے کو دل تو نہیں چاہ رہا ہے، لیکن اس غرض سے دے رہا ہے کہ اگر میں نہیں دوں گا تو معاشرے میں میری ناک کٹ جائے گی، یا اس نیت سے دے رہا ہے کہ اس وقت دے رہا ہوں تو میرے یہاں شادی بیاہ کے موقع پر یہ دے گا۔ جس کو "نیوتہ" کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر کوئی کسی کو دیتا ہے تو باقاعدہ اس کی فہرست بنتی ہے کہ فلاں شخص نے اتنے دیئے، فلاں شخص نے اتنے دیئے۔ پھر اس فہرست کو محفوظ رکھا جاتا ہے، اور پھر جب اس شخص کے یہاں شادی بیاہ کا موقع آتا ہے جس نے دیا تھا تو اس کو پوری توقع ہوتی ہے کہ میں نے اس کو جتنا دیا تھا، یہ کم از کم اتنا ہی مجھے واپس دے گا۔ اور اگر اس سے کم دے تو پھر گلے شکوے، لڑائیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ یہ "بدلہ" بہت خراب ہے۔ اور اسی کو قرآن کریم میں سورۃ روم میں "سود" سے تعبیر فرمایا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاْ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝﴾(۱)

یعنی تم لوگ جو سود دیتے ہو، تاکہ لوگوں کے مالوں کے ساتھ مل کر اس میں اضافہ ہوجائے، تو یاد رکھو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس میں اضافہ نہیں ہوتا، اور جو تم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر زکوٰۃ دیتے ہو، تو یہی لوگ اپنے مالوں میں اضافہ کرانے والے ہیں۔

اس آیت میں اس "نیوتہ" کو سود سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص دوسرے کو اس نیت سے دے کہ چونکہ اس نے مجھے شادی کے موقع پر دیا تھا، اب میرے ذمے فرض ہے کہ میں بھی اس کو ضرور دوں، اگر میں نہیں دوں گا تو معاشرے میں میری ناک کٹ جائے گی اور یہ مجھے مقروض سمجھے گا، یہ دینا

(۱) الروم: ۳۹

گناہ میں داخل ہے، اس میں کبھی مبتلا نہیں ہونا چاہئے، اس میں نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے، اور نہ ہی آخرت کا کوئی فائدہ ہے۔

محبت کی خاطر بدلہ اور ہدیہ دو

لیکن ایک وہ "بدلہ" جس کی تلقین حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں۔ یعنی دینے والے کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ جو میں دے رہا ہوں، اس کا بدلہ مجھے ملے گا بلکہ اس نے محض محبت کی خاطر اللہ کو راضی کرنے کے لئے اپنے بہن یا بھائی کو کچھ دیا ہو۔ جیسا کہ حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

((تَهَادَوْا تَحَابُّوْا))(۱)

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو، اس سے آپس میں محبت پیدا ہوگی۔ لہٰذا اگر آدمی حضورِ اقدس ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرنے کے لئے اپنے دل کے تقاضے سے دے رہا ہے، اور اس کے دل میں دُور دُور یہ خیال نہیں ہے کہ اس کا بدلہ بھی مجھے ملے گا، تو یہ دینا بڑی برکت کی چیز ہے۔ اور جس شخص کو وہ ہدیہ دیا گیا وہ بھی یہ سمجھ کر نہ لے کہ یہ "نیوتہ" ہے، اور اس کا بدلہ مجھے ادا کرنا ہے۔ بلکہ وہ یہ سوچے کہ یہ میرا بھائی ہے، اس نے میرے ساتھ ایک اچھائی کی ہے، تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ اچھائی کروں، اور میں بھی اپنی طاقت کے مطابق اس کو ہدیہ دے کر اس کا دل خوش کروں۔ تو اس کا نام ہے "مکافات" جس کی حضورِ اقدس ﷺ نے تاکید فرمائی ہے۔ یہ محمود ہے اور اس کی کوشش کرنی چاہئے۔

بدلہ دینے میں برابری کا لحاظ مت کرو

اس "مکافات" کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب دوسرا شخص تمہارے ہدیہ کا بدلہ دے گا تو اس بدلہ میں اس کا لحاظ نہیں ہوگا کہ جتنا قیمتی ہدیہ اس نے دیا تھا، اتنا ہی قیمتی ہدیہ میں بھی دوں۔ بلکہ مکافات کرنے والا یہ سوچے گا کہ اس نے اپنی استطاعت کے مطابق بدلہ دیا تھا، میں اپنی استطاعت کے مطابق بدلہ دوں۔ مثلاً کسی نے آپ کو بہت قیمتی تحفہ دے دیا تھا، اب آپ کی استطاعت قیمتی تحفہ دینے کی نہیں ہے تو آپ چھوٹا اور معمولی تحفہ دیتے وقت شرمائیں نہیں۔ اس لئے کہ اس کا مقصد بھی آپ کا دل خوش کرنا تھا، اور آپ کا مقصد بھی اس کا دل خوش کرنا ہے، اور دل چھوٹی چیز سے بھی خوش ہو جاتا ہے۔ یہ نہ سوچیں کہ جتنا قیمتی تحفہ اس نے مجھے دیا تھا، میں بھی اتنا ہی قیمتی تحفہ اس کو دوں، چاہے اس مقصد کے لئے مجھے قرض لینا پڑے، چاہے رشوت لینی پڑے، یا اس کے لئے مجھے ناجائز ذرائع آمدنی

---

(۱) مؤطا مالك، الكتاب الجامع، باب ما جاء في المهاجرة، رقم: ۱٤١٣

اختیار کرنے پڑیں، ہرگز نہیں، بلکہ جتنی استطاعت ہو، اس کے مطابق تحفہ دو۔

تعریف کرنا بھی بدلہ ہے

بلکہ اس حدیث میں یہاں تک فرمادیا کہ اگر تمہارے پاس ہدیہ کا بدلہ دینے کے لئے کچھ نہیں ہے تو پھر ''مکافات'' کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ تم اس کی تعریف کرو، اور لوگوں کو بتاؤ کہ میرے بھائی نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور مجھے ہدیہ میں یہ ضرورت کی چیز دے دی۔ یہ کہہ کر اس کا دل خوش کر دینا بھی ایک طرح کا بدلہ ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انداز

میرے حضرت جناب حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص محبت سے کوئی چیز ہدیہ کے طور پر لے کر آئے تو کم از کم اس پر خوشی کا اظہار کر کے اس کا دل خوش کرو، تاکہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ تمہیں اس ہدیہ سے خوشی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے حضرت والا کو دیکھا کہ جب کوئی شخص آپ کے پاس کوئی ہدیہ لے کر آتا تو آپ بہت خوشی سے اس کو قبول فرماتے، اور فرماتے کہ بھائی! یہ تو ہماری پسند کی اور ضرورت کی چیز ہے، آپ کا یہ ہدیہ تو ہمیں بہت پسند آیا، ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ بازار سے یہ چیز خرید لیں گے۔ یہ الفاظ اس لئے فرماتے تاکہ دینے والے کو یہ احساس ہو کہ ان کو میرے ہدیہ سے خوشی ہوئی ہے، اور اس حدیث پر عمل بھی ہو جائے۔ لہٰذا اس کی تعریف کرنی چاہئے۔ اور چھپا کر بیٹھنا اور اس پر اس کی تعریف نہ کرنا اور خوشی کا اظہار نہ کرنا، یہ اس ہدیہ کی ناشکری ہے۔

چھپا کر ہدیہ دینا

ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے، اور مصافحہ کرتے ہوئے چپکے سے کوئی چیز بطور ہدیہ کے دے دی، اس لئے کہ یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ چپکے سے مصافحہ کرتے ہوئے ہدیہ دے دیا جائے، تو ان صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ حضرت والا نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت ہدیہ پیش کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ اس طرح چھپا کر دینے کا کیا مطلب ہے، کیا تم چوری کر رہے ہو، یا میں چوری کر رہا ہوں؟ جب نہ تم چوری کر رہے ہو اور نہ میں چوری کر رہا ہوں، بلکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد پر عمل کرنا چاہتے ہو تو پھر اس کو اس طرح چھپانے کی کیا ضرورت ہے، یہ تو ایک محبت اور تعلق کا اظہار ہے، سب

کے سامنے پیش کر دو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہر حال، ہدیہ کے ذریعہ اصل میں دل کی محبت کا اظہار ہے، چاہے وہ چیز چھوٹی ہو یا بڑی ہو۔ اور جب کوئی شخص تمہیں کوئی چیز دے تو تم اس کا بدلہ دے دو، یا کم از کم اس کی تعریف کر دو۔

پریشانی میں درود شریف کی کثرت کیوں؟

ایک مرتبہ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی مشکل اور پریشانی میں ہو تو اس وقت درود شریف کثرت سے پڑھا کرو۔ پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے ذوق میں ایک بات آتی ہے وہ یہ کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا اُمتی جب بھی حضور ﷺ پر درود بھیجتا ہے تو وہ درود شریف حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں فرشتے پہنچاتے ہیں، اور جا کر عرض کرتے ہیں کہ آپ کے فلاں اُمتی نے آپ کی خدمت میں درود شریف کا یہ ہدیہ بھیجا ہے۔(۱)

دوسری طرف زندگی میں حضور اقدس ﷺ کی سنت یہ تھی کہ جب بھی کوئی شخص آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ اس کی ''مکافات'' ضرور فرماتے تھے، اس کے بدلے میں اس کے ساتھ کوئی نیکی ضرور فرماتے تھے۔ ان دونوں باتوں کے ملانے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جب تم حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں درود بھیجو گے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ اس کا بدلہ نہ دیں، بلکہ ضرور بدلہ دیں گے۔ اور وہ بدلہ یہ ہوگا کہ آپ اس اُمتی کے حق میں دعا کریں گے کہ اے اللہ! یہ میرا اُمتی جو مجھ پر درود بھیج رہا ہے، وہ فلاں مشکل اور پریشانی میں مبتلا ہے، اے اللہ! اس کی مشکل دور فرما دیجئے۔ تو اس دعا کی برکت سے انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ تمہیں اس مشکل سے نجات عطا فرمائیں گے۔ اس لئے جب بھی کوئی پریشانی آئے تو اس وقت حضور اقدس ﷺ پر درود شریف کی کثرت کریں

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں پہلی تعلیم یہ دی کہ جب کوئی شخص تمہارے ساتھ نیکی کرے، تو تم اس کو بدلہ دینے کی کوشش کرو، اور اس نیت سے بدلہ دو کہ چونکہ یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے کہ آپ بدلہ دیا کرتے تھے، اس لئے میں بھی بدلہ دے رہا ہوں۔ لیکن قرضہ والا بدلہ نہ ہو، ''نیوتہ'' والا بدلہ نہ ہو، بلکہ وہ بدلہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اور حضور اقدس ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کے لئے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

(۱) سنن النسائی، کتاب السهو، باب السلام علی النبی، رقم: ۱۲٦٥

ایثار وقربانی کی فضیلت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ الْمُهَاجِرِيْنَ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! ذَهَبَتِ الْأَنْصَارُ بِالْأَجْرِ كُلِّهِ قَالَ: ((لَا مَا دَعَوْتُمُ اللّٰهَ لَهُمْ وَأَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ))(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئے تو انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو مدینہ منورہ کے انصاری صحابہ ہیں، سارا اجر وثواب وہ لے گئے اور ہمارے لئے تو کچھ بچا ہی نہیں۔ جواب میں آپ نے فرمایا: نہیں، جب تک تم ان کے لئے دعا کرتے رہوگے اور ان کا شکر ادا کرتے رہوگے، اس وقت تک تم ثواب سے محروم نہیں رہوگے۔

جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے آکر مدینہ منورہ میں آباد ہونا شروع ہوئے تو اس وقت آبادکاری کا بہت بڑا مسئلہ تھا، اور لوگوں کا ایک سیلاب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ منتقل ہو رہا تھا، اور اس وقت مدینہ منورہ ایک چھوٹی سی بستی تھی، اب آباد ہونے والوں کو گھر کی ضرورت تھی، ان کے لئے روزگار چاہئے تھا، اور ان کے لئے کھانے پینے کا سامان اور ضرویاتِ زندگی چاہئے تھیں۔ یہ حضرات جب مدینہ منورہ آئے تو خالی ہاتھ آئے تھے، مکہ مکرمہ میں ان کی زمینیں تھیں، جائدادیں تھیں، سب کچھ تھا، لیکن وہ سب مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر آئے تھے۔

انصار کی ایثار وقربانی

اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کے انصار صحابہ کے دل میں ایسا ایثار ڈالا اور انہوں نے ایثار کی وہ مثال قائم کی کہ تاریخ میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ انصاری صحابہ نے اپنی دنیا کی ساری دولت مہاجرین کے لئے کھول دی۔ یہ سب خود اپنی طرف سے کیا، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم نہیں دیا تھا،

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/ ۲۷۸ تا ۲۹۰)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في شكر المعروف، رقم: ٤١٧٨

بلکہ انصاری صحابہ نے کہا کہ جو بھی مہاجر صحابی آرہے ہیں، ان کے لئے ہمارے گھر کے دروازے کھلے ہیں، وہ آکر ہمارے گھروں میں آباد ہو جائیں۔ وہ ہمارے مہمان ہیں، ان کے کھانے پینے کا انتظام ہم کریں گے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے ان کا یہ جذبہ دیکھ کر مہاجرین اور انصار کے درمیان "مواخات" (بھائی چارہ) قائم فرمادیا، یعنی ہر ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی بنادیا۔ اب وہ اس کے ساتھ رہنے لگا، اسی کے ساتھ کھانے پینے لگا، یہاں تک کہ بعض انصاری صحابہ نے فرمایا کہ میری دو بیویاں ہیں، میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ میں اپنی ایک بیوی سے دست بردار ہو جاؤں اور اس کو طلاق دے کر علیحدہ کردوں، پھر تمہارے ساتھ اس کا نکاح کردوں۔ اگرچہ ایسا واقعہ پیش نہیں آیا لیکن آمادگی ظاہر کی۔

انصار اور مہاجرین میں مزارعت

یہاں تک کہ ایک مرتبہ انصاری صحابہ حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے جو مہاجر بھائی ہیں، وہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں، اگرچہ ہم ان کو مہمان کے طور پر رکھے ہوئے ہیں، لیکن ان کے دل میں ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ ہم تو مہمان ہیں، اور یہاں ان کا باقاعدہ روزگار کا انتظام بھی نہیں ہے، اس لئے ہم نے آپس میں یہ طے کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں ہماری جتنی جائیدادیں ہیں، ہم آدھی آدھی آپس میں تقسیم کرلیں یعنی آدھی جائیداد مہاجر بھائی کو دے دیں اور آدھی جائیداد ہم رکھ لیں۔ تو اس پر حضورِ اقدس ﷺ نے مہاجر صحابہ سے مشورہ کیا کہ انصاری صحابہ یہ پیش کش کر رہے ہیں۔ آپ حضرات کا کیا خیال ہے؟ اس پر مہاجرین صحابہ نے فرمایا کہ نہیں، ہمیں یہ پسند نہیں کہ ہم ان کی آدھی زمینیں لے لیں۔ اس کے بعد حضورِ اقدس ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا تم انصاری صحابہ کی زمینوں پر کام کرو اور جو پھل اور پیداوار ہو وہ تم دونوں میں تقسیم ہو جایا کرے۔ چنانچہ مہاجر صحابہ انصاری صحابہ کی زمینوں پر کام کرتے تھے اور جو پھل اور پیداوار ہوتی وہ آپس میں تقسیم کرلیا کرتے تھے۔ اس طرح مہاجرین نے اپنا وقت گزارا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے جذبات دیکھئے

حضراتِ انصار نے ایثار کی وہ مثالیں پیش کیں جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ بہرحال، مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ دیکھا کہ سارے ثواب والے کام تو انصاری صحابہ کررہے ہیں، اور سارا ثواب تو وہ لے گئے، تو ایک مرتبہ یہ حضرات حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مدینہ منورہ کے جو انصاری صحابہ ہیں وہ سارا ثواب لے گئے، ہمارے لئے تو

کچھ بچا ہی نہیں۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ انصاری صحابہ کے جذبات کیا ہیں اور مہاجرین صحابہ کے جذبات کیا ہیں۔ ایک طرف انصاری صحابہ مہاجرین کے لئے دیدہ ودل فرشِ راہ کیے ہوئے ہیں اور دوسری طرح مہاجرین صحابہ کو یہ خیال ہو رہا ہے کہ سارا اجر وثواب تو انصاری صحابہ کے پاس چلا گیا، اب ہمارے اجر وثواب کا کیا ہوگا؟

تمہیں بھی یہ ثواب مل سکتا ہے

جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا مَا دَعَوْتُمُ اللّٰهَ لَهُمْ وَاَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ))

تم یہ جو کہہ رہے ہو کہ سارا ثواب انصاری صحابہ لے گئے تو ایک بات سن لو! وہ یہ کہ یہ مت سمجھو کہ تمہیں کچھ ثواب نہیں ملا، بلکہ یہ ثواب تمہیں بھی مل سکتا ہے۔ جب تک تم ان کے حق میں دعائیں کرتے رہو گے اور ان کا شکر ادا کرتے رہو گے، اس وقت تک تم ثواب سے محروم نہیں ہو گے اور اس عمل کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کے ثواب میں تم کو بھی شریک کرلیں گے۔

یہ دنیا چند روزہ ہے

وہاں یہ نہیں تھا کہ مہاجرین اپنے لئے ''انجمن تحفظ حقوق مہاجرین'' بنالیں، اور انصار اپنے لئے ''انجمن تحفظ حقوق انصار'' بنالیں، اور پھر دونوں انجمنیں اپنے اپنے حقوق کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوجائیں کہ انہوں نے ہمارے حقوق پامال کردیئے، بلکہ وہاں تو اُلٹا معاملہ ہو رہا ہے اور ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ میں اپنے بھائی کے ساتھ کوئی بھلائی کروں۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ اس لئے تھا کہ سب کے پیشِ نظر یہ ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے ساتھ کیا حالات پیش آنے والے ہیں۔ یہ دنیا تو چند روزہ ہے، کسی طرح گزر جائے گی۔ اچھی گزر جائے یا تھوڑی تنگی کے ساتھ گزر جائے لیکن گزر جائے گی۔ البتہ اصل بات یہ ہے کہ مرنے کے بعد جو حالات پیش آئیں گے، اس وقت ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ اس فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایک کے دل میں دوسرے بھائی کے لئے ایثار تھا۔

آخرت پیشِ نظر ہو تو

جب انسان کے پیشِ نظر آخرت نہیں ہوتی، دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس نہیں ہوتا، تو پھر آدمی کے پیشِ نظر صرف دنیا ہی دنیا ہوتی ہے، اور پھر ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ دوسرے شخص نے مجھ سے زیادہ دنیا حاصل کرلی، میرے پاس کم رہ گئی، تو آدمی

پھر اس وقت اس ادھیڑبن میں رہتا ہے کہ میں کسی طرح زیادہ کمالوں اور زیادہ حاصل کرلوں۔ لیکن اگر آدمی کے دل میں یہ فکر ہو کہ آخرت میں میرے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے، اور ساتھ میں یہ خیال ہو کہ حقیقی راحت اور خوشی روپے میں اضافہ کرنے اور بینک بیلنس زیادہ کرنے سے حاصل نہیں ہوگی، بلکہ حقیقی خوشی یہ ہے کہ انسان کے دل میں سکون ہو، انسان کا ضمیر مطمئن ہو، اس کو یہ خوف نہ ہو کہ جب میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جاؤں گا تو اپنے اس عمل کا کیا جواب دوں گا۔ اور حقیقی خوشی یہ ہے کہ آدمی اپنے مسلمان بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ لے، اس کا کوئی دکھ دور کردے، اس کی کوئی پریشانی رفع کردے۔ جب انسان کے دل میں اس قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں تو پھر انسان دوسروں کے ساتھ ایثار سے کام لیتا ہے۔

''سکون'' ایثار اور قربانی میں ہے

اسلام کی تعلیم صرف اتنی نہیں ہے کہ بس دوسرے کے صرف واجب حقوق ادا کردیئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تعلیم اسلام نے دی ہے کہ دوسروں کے لئے ایثار کرو، تھوڑی سی قربانی بھی دو۔ یقین کریں کہ جب آپ دوسرے مسلمان بھائی کے لئے قربانی دیں گے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں جو سکون، عافیت اور راحت عطا فرمائیں گے، اس کے سامنے بینک بیلنس کی خوشی ہیچ در ہیچ ہے۔ چونکہ ہم نے ایثار اور قربانی پر عمل چھوڑ رکھا ہے اور ہماری زندگی میں اب ایثار کا کوئی خانہ ہی نہیں رہا کہ دوسرے کی خاطر تھوڑی سی تکلیف اُٹھالیں، تھوڑی سی قربانی دے دیں، اس لئے اس قربانی کی لذت اور راحت کا ہمیں اندازہ ہی نہیں۔

ایک انصاری کے ایثار کا واقعہ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انصاری صحابہ کے ایثار کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿يُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾(۱)

یہ انصاری صحابہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے یہ خود حالتِ افلاس میں کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ وہ واقعہ آپ حضرات نے سنا ہوگا کہ حضور اقدس ﷺ کے ایک مہمان ایک انصاری صحابی کے پاس آگئے، کھانا کم تھا، بس اتنا کھانا تھا کہ یا تو خود کھالیں یا مہمان کو کھلادیں۔ لیکن یہ خیال ہوا کہ اگر مہمان کے ساتھ ہم بیٹھیں گے اور اس کے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے تو اس کو اشکال ہوگا، اس لئے چراغ گل کردیا تاکہ مہمان کو پتہ نہ چلے، اور ظاہر ایسا کیا کہ وہ بھی ساتھ میں کھانا کھا رہے

(۱) الحشر: ۹

ہیں۔اس پر قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی، یعنی یہ لوگ افلاس اور تنگ دستی کی حالت میں بھی دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔لہٰذا اس ایثار اور قربانی کی لذت سے بھی ہمکنار ہو کر دیکھئے۔دوسرے مسلمان بھائی کے لئے ایثار اور قربانی دینے میں جو مزہ اور راحت، لذت اور سکون ہے، وہ ہزار بینک بیلنس کے جمع کرنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ نے انصار صحابہ اور مہاجرین کے درمیان یہی ایثار اور قربانی کا رابطہ قائم فرمایا۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو دوسروں کے لئے ایثار اور قربانی کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

افضل عمل کونسا؟

اگلی حدیث حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا گیا:

"أَيُّ الْأَعْمَالِ خَيْرٌ؟"

''اللہ تعالیٰ کے یہاں کون سے اعمال سب سے بہتر ہیں؟''

جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا:

((إِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَجِهَادٌ فِيْ سَبِيْلِهِ))

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر عمل اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے، اور دوسرے اس کے راستے میں جہاد کرنا ہے''

یہ دونوں افضل الاعمال ہیں۔پھر کسی نے دوسرا سوال کیا:

"أَيُّ الرِّقَابِ أَفْضَلُ؟"

''کون سے غلام کی آزادی زیادہ افضل ہے؟''

اس زمانے میں غلام اور باندیاں ہوا کرتی تھیں، اور حضورِ اقدس ﷺ نے غلام اور باندیوں کو آزاد کرنے کی بہت فضیلت بیان فرمائی تھی۔تو کسی نے سوال کیا کہ غلام آزاد کرنا تو افضل ہے، لیکن کون سا غلام آزاد کرنا زیادہ افضل ہے اور زیادہ موجبِ ثواب ہے؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جو غلام زیادہ قیمتی اور زیادہ نفیس ہے، اس کو آزاد کرنا زیادہ موجبِ اجر و ثواب اور زیادہ افضل ہے۔پھر کسی نے سوال کیا کہ حضور! یہ بتایئے کہ اگر میں ان میں سے کوئی عمل نہ کر سکوں۔مثلاً کسی عذر کی بناء پر جہاد نہ کر سکوں، اور غلام آزاد کرنے کا عمل تو اس وقت کرے جب آدمی کے پاس غلام ہو یا غلام خریدنے کے لئے پیسے ہوں، لیکن میرے پاس تو غلام بھی نہیں ہے اور پیسے بھی نہیں ہیں تو پھر میں کس طرح اجر و ثواب زیادہ حاصل کروں؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ پھر اس صورت میں

تمہارے لئے اجر و ثواب حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص جو بگڑی ہوئی حالت میں ہو تو تم اس کی مدد کر دو۔

دوسروں کی مدد کر دو

مثلاً ایک شخص کسی مشکل میں مبتلا ہے، پریشانی کا شکار ہے، اس کی حالت بگڑی ہوئی ہے تو تم اس کی مدد کر دو، یا کسی اناڑی آدمی کا کوئی کام کر دو۔ آپ نے ''اناڑی'' کا لفظ استعمال فرمایا، یعنی وہ شخص جسے کوئی ہنر نہیں آتا، یا تو اس لئے کہ وہ معذور ہے یا اس کی دماغی صلاحیت اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال کر کے کوئی بڑا کام کر سکے، تو تم اس کی مدد کر دو اور اس کا کام کر دو، اس میں بھی تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا اجر و ثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نہ جانے کتنے بندے ایسے ہیں جو یا تو معذور ہیں، یا تنگدست ہیں، یا ان کے پاس کوئی ہنر نہیں ہے، کوئی ذہنی صلاحیت ان کے پاس نہیں ہے، تو اگر دوسرا شخص ان کی مدد کا کوئی کام کر دے تو اس پر بھی اجر و ثواب ملے گا۔ اور حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ اگر تم جہاد نہیں کر سکتے تو یہ کام کر لو۔ اس سے پتہ چلا کہ اس کا ثواب بھی اللہ تعالیٰ جہاد کے قریب قریب عطا فرمائیں گے۔ ان شاء اللہ۔

اگر مدد کرنے کی طاقت نہ ہو؟

ان صحابی نے پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر میں اتنا کمزور ہوں کہ اتنا عمل بھی نہ کر سکوں، یعنی میں خود ہی کمزور ہوں اور دوسرے کمزور کی مدد نہ کر سکوں تو پھر کیا کروں؟ اب آپ حضورِ اقدس ﷺ کے جوابات کا اندازہ لگایئے کہ آپ کے یہاں ناامیدی کا کوئی خانہ نہیں ہے، جو شخص بھی آ رہا ہے اس کو امید کا راستہ دکھا رہے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس مت ہو جاؤ، اگر یہ عمل نہیں کر سکتے تو یہ عمل کر لو، اگر یہ عمل نہیں کر سکتے تو یہ عمل کر لو۔

لوگوں کو اپنے شر سے بچا لو

بہرحال، آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر تم کمزور ہونے کی وجہ سے دوسروں کی مدد نہیں کر سکتے تو یہ ایک عمل کر لو:

((تَدَعُ النَّاسَ مِنَ الشَّرِّ))

''لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ کر لو۔''(۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب العتق، باب أی الرقاب أفضل، رقم: ۲۳۳۴، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

یعنی اس بات کا اہتمام کرلو کہ میری ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ اس لئے کہ دوسروں کو اپنے شر سے محفوظ کرنا یہ تمہارا اپنے نفس پر صدقہ ہوگا، کیونکہ اگر تم دوسرے کو تکلیف پہنچاتے تو تمہیں گناہ ہوتا، اب تم نے جب اپنے آپ کو دوسروں کو تکلیف دینے سے بچالیا تو گویا کہ تم نے اپنے نفس کو گناہ اور عذاب سے بچالیا۔ لہٰذا یہ بھی ایک صدقہ ہے جو تم اپنے نفس پر کر رہے ہو۔

حقیقی مسلمان کون ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے جو معاشرتی احکام اور معاشرتی تعلیمات ہیں، ان کی بنیاد یہی ہے کہ اپنی ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے صاف صاف ارشاد فرمادیا:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ))(۱)

''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں''

نہ زبان سے دوسرے کو تکلیف پہنچے، نہ ہاتھ سے دوسرے کو تکلیف پہنچے۔ لیکن یہ چیز اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کو اس کا اہتمام ہو اور جس کے دل میں یہ بات جمی ہوئی ہو کہ میری ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے کہ۔

تمام عمر اس احتیاط میں گزری
آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب فضل الجهاد والرباط، رقم: ۳۵۰۱، سنن الترمذی، كتاب فضائل الجهاد عن رسول الله، باب ما جاء أی الناس افضل، رقم: ۱۵۸۴، سنن النسائی، كتاب الجهاد، باب فضل من يجاهد فی سبيل الله بنفسه وماله، رقم: ۳۰۵۴، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب العزلة، رقم: ۳۹۶۸، مسند أحمد، رقم: ۱۰۷۰۱

(۱) صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ۹، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان تفاضل الإسلام وأی أموره أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذی، كتاب الإيمان عَنْ رسول الله، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ۲۵۵۱، سنن النسائی، كتاب الإيمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ۴۹۱۰، سنن أبی داؤد، كتاب الجهاد، باب فی الهجرة هل انقطعت، رقم: ۲۱۲۲

اپنی وجہ سے کسی پر بوجھ نہ پڑے، اپنی وجہ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کے بارے میں اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کم از کم آپ کی آدھی سے زائد تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے آپ سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچنے دو۔ اور پھر تکلیف صرف یہ نہیں ہے کہ کسی کو مار پیٹ دیا بلکہ تکلیف دینے کے بیشمار پہلو ہیں، کبھی زبان سے تکلیف پہنچ جاتی ہے، کبھی عمل سے تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے اپنے آپ کو اس سے بچاؤ۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ آپ کو پہلے بھی سنایا تھا کہ مرضِ وفات جس میں آپ کا انتقال ہوا، اسی مرضِ وفات میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا، اور رمضان المبارک میں بار بار آپ کو دل کی تکلیف اُٹھتی رہی اور اتنی شدت سے تکلیف اُٹھتی تھی کہ یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ آخری حملہ ثابت نہ ہو جائے۔ اسی بیماری میں جب رمضان المبارک گزر گیا تو ایک دن فرمانے لگے: ہر مسلمان کی آرزو ہوتی ہے کہ اس کو رمضان لمبارک کی موت نصیب ہو، میرے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کی موت عطا فرما دے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رمضان المبارک میں جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن میری بھی عجیب حالت ہے کہ میں بار بار سوچتا تھا کہ یہ دعا کروں کہ یا اللہ! رمضان المبارک کی موت عطا فرما دے، لیکن میری زبان پر یہ دعا نہیں آسکی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں اپنے لئے رمضان المبارک کی موت طلب تو کرلوں، لیکن مجھے اندازہ ہے کہ میری موت کے وقت میرے تیمار دار اور میرے جو ملنے جلنے والے ہیں، ان سب کو روزہ کی حالت میں شدید مشقت اُٹھانی پڑے گی، اور روزہ کی حالت میں ان کو صدمہ ہوگا، اور روزہ کی حالت میں تجہیز و تکفین کے سارے انتظامات کریں گے تو ان کو مشقت ہوگی۔ اس وجہ سے میری زبان پر یہ دعا نہیں آئی کہ رمضان المبارک میں میرا انتقال ہو جائے۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

تمام عمر اس احتیاط میں گزری
آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

چنانچہ رمضان المبارک کے ۱۱ دن کے بعد ۱۱/ شوال کو آپ کی وفات ہوئی۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ جو شخص مرتے وقت یہ سوچ رہا ہے کہ میرے مرنے سے بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچے، اس شخص کا زندگی میں لوگوں کے جذبات کا خیال رکھنے کا کیا عالم ہوگا؟

تین قسم کے جانور

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تین قسم کے جانور پیدا کیے ہیں۔ ایک قسم کے جانور وہ ہیں جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، تکلیف نہیں پہنچاتے، مثلاً گائے ہے، بھینس ہے، بکری ہے، تم ان کا دودھ استعمال کرتے ہو، اور بالآخران کو ذبح کر کے ان کا گوشت کھا جاتے ہو۔ گھوڑا ہے، گدھا ہے، تم ان پر سواری کرتے ہو۔ دوسری قسم کے جانور ایسے ہیں جو دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، جیسے سانپ بچھو ہیں، درندے ہیں۔ یہ جانور انسان کو تکلیف پہنچاتے ہیں، فائدہ نہیں پہنچاتے۔ تیسری قسم کے جانور وہ ہیں جو نہ تو انسان کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہ ہی تکلیف دیتے ہیں۔ اس کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ انسانوں سے مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں: اے انسان! اگر تم ایسے جانور نہیں بن سکتے جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں تو کم از کم ایسے جانور بن جاؤ جو نہ فائدہ دیتے ہیں نہ تکلیف دیتے ہیں۔ خدا کے لئے ایسے جانور مت بنو جو دوسروں کو تکلیف ہی پہنچاتے ہیں، فائدہ کچھ نہیں پہنچاتے۔ یعنی کم از کم تم اپنے شر سے لوگوں کو محفوظ کر لو۔ اور یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

امانت کی اہمیت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ المومنون کی ان ابتدائی آیتوں کا بیان کئی مہینوں سے چل رہا ہے۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فلاح پانے والے مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں۔ پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لغو اور بیہودہ کاموں اور باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔ تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اس کے دو معنی عرض کیے تھے، ایک یہ کہ وہ لوگ زکوٰۃ کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے اخلاق کا تزکیہ کرتے ہیں۔ چوتھی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، یعنی اپنی عفت اور عصمت کا تحفظ کرنے والے ہیں، اس صفت کا بیان پچھلے پانچ چھ جمعوں میں ہوتا رہا ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۲۱۶ تا ۲۲۶)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) المومنون: ۱ - ۸، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔ جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابلِ ملامت نہیں ہیں، ہاں جو اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو ایسے لوگ حد سے گذرے ہوئے ہیں، اور وہ جو اپنے امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں"

امانت اور عہد کا پاس رکھنا

اس سے اگلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں، آج اس آیتِ کریمہ کا بیان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ یعنی ایک مؤمن کی دنیا و آخرت دونوں کی فلاح کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی امانت کا پاس رکھے اور اپنے عہد کا پاس رکھے۔ قرآن کریم میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ بیان فرمائی ہیں، ایک امانت اور ایک عہد۔ مؤمن کی علامت یہ ہے کہ وہ امانتوں کا پاس کرنے والا ہے، اور اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہے۔

امانت قرآن وحدیث میں

ان میں سے پہلی چیز ''امانت'' ہے، اور فلاح کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ انسان امانت میں کوئی خیانت نہ کرے، بلکہ امانت کو ٹھیک ٹھیک اس کے اہل تک پہنچائے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ امانتوں کو ان کے مستحق لوگوں تک پہنچاؤ۔ قرآن وحدیث میں اس کی بڑی تاکید وارد ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))(۲)

یعنی تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی انسان میں پائی جائیں تو وہ خالص منافق ہے۔ پہلی یہ ہے کہ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، دوسری یہ کہ جب وہ کسی سے وعدہ کرے تو وعدے کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے یا جب اس کو کسی چیز کا امانت دار بنایا جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔ یہ منافق کی علامات ہیں، مؤمن کا کام نہیں۔ اس لئے اس کی بڑی تاکید وارد ہوئی ہے۔

---

(۱) النساء: ۵۸

(۲) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب علامة المنافق، رقم: ۳۳، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال المنافق، رقم: ۸۸، سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول الله، باب ما جاء فی علامة المنافق

امانت اُٹھ چکی ہے

آج ہمارے معاشرے میں یہ خیانت پھیل گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد ہمارے اس دور پر صادق آرہا ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت ایسا آجائے گا کہ امانت دنیا سے اُٹھ جائے گی، اور لوگ کہا کریں گے کہ فلاں ملک میں فلاں شہر میں فلاں بستی میں ایک شخص رہتا ہے، وہ امانت دار ہے۔ یعنی امانت دار لوگ ختم ہو جائیں گے، سب خائن ہو جائیں گے، اور اِکّا دُکّا لوگ ہوں گے جو امانت کا پاس رکھنے والے ہوں گے۔ ایک مؤمن کی خاصیت یہ ہے کہ وہ خیانت نہیں کرتا۔

حضور ﷺ کا امین ہونا

نبی کریم ﷺ نبوت سے پہلے بھی پورے مکہ میں ''صادق'' اور ''امین'' کے لقب سے مشہور تھے، یعنی آپ سچے تھے، آپ کی زبان پر کبھی جھوٹ نہیں آتا تھا، آپ امانت دار تھے، جو لوگ آپ کے پاس امانت رکھواتے تھے ان کو پورا بھروسہ ہوتا تھا کہ نبی کریم ﷺ اس امانت کا حق ادا کریں گے۔ چنانچہ جب آپ مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما رہے تھے، اس وقت یہ عالم تھا کہ کفار نے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ہوئے تھے، آپ کے خلاف قتل کے منصوبے بنائے جا رہے تھے، اس حالت میں رات کے وقت آپ کو اپنے شہر مکہ مکرمہ سے نکلنا پڑا۔ اس وقت بھی آپ کو یہ فکر تھی کہ میرے پاس لوگوں کی جو امانتیں رکھی ہوئی ہیں، ان کو اگر پہنچاؤں گا تو یہ راز کھل جائے گا کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساری امانتیں سپرد فرمائیں، اور ان کو اپنے بستر پر لٹایا، اور ان سے فرمایا کہ میں جا رہا ہوں، تم یہ امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچاؤ، اور جب اس کام سے فارغ ہو جاؤ تو پھر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجانا۔ اور وہ امانتیں صرف مسلمانوں کی نہیں تھیں، بلکہ کافروں کی بھی تھیں۔ وہ کافر جو آپ کے خون کے پیاسے تھے، جو آپ کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کر رہے تھے، ان کی امانتوں کو بھی ان تک واپس پہنچانے کا انتظام فرمایا۔

غزوۂ خیبر کا ایک واقعہ

غزوۂ خیبر کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ نے خیبر کے قلعوں کا محاصرہ کیا ہوا تھا، خیبر میں یہودی آباد تھے، اور ان کی خصلت شروع ہی سے سازشی ہے، مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال بنتے رہتے تھے، اور خیبر ان کی سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا، نبی کریم ﷺ نے ان کی سازشوں سے اُمتِ مسلمہ کو بچانے کے لئے خیبر شہر کا محاصرہ کیا۔ یہ شہر کئی قلعوں پر مشتمل تھا، یہودی اس محاصرے کے

دوران شہر کے اندر بند تھے، اور نبی کریم ﷺ کی فوجوں نے اس کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔

اسود چرواہا

جب محاصرے کو چند دن گزر گئے تو ایک چرواہا جس کا نام روایتوں میں ''اسود'' آتا ہے۔ جو لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ وہ بکریوں کو چرانے کی خاطر قلعے سے باہر نکلا، باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کا لشکر محاصرہ کیے ہوئے ہے، اس چرواہے کے دل میں خیال آیا کہ میں جا کر دیکھوں کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اور کیا ان کا پیغام ہے؟ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ ان کی دعوت کیا ہے؟ چنانچہ وہ اپنی بکریوں کو چراتے ہوئے لشکر کے قریب آ گیا۔ اور لشکر والوں سے پوچھنے لگا کہ آپ کا بادشاہ کہاں ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں بادشاہ تو کوئی نہیں ہے، البتہ نبی کریم ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور ان کی قیادت میں ہم لوگ یہاں آئے ہیں، وہ ہمارے قائد ہیں۔ اس چرواہے نے کہا کہ کیا میں ان کو دیکھ سکتا ہوں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا: کیوں نہیں دیکھ سکتے؟ چرواہے نے پوچھا کہ ان کا محل کہاں ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ ان کا کوئی محل نہیں ہے، وہ سامنے کھجور کے پتوں کا چھپر ہے، اس کے اندر وہ تشریف فرما ہیں، جاؤ، اور جا کر ان سے مل لو۔ اس چرواہے نے کہا کہ میں جا کر بادشاہ سے مل لوں؟ میں تو ایک غلام آدمی ہوں، سیاہ فام ہوں، میری رنگت کالی ہے، بکریاں چراتا ہوں، میں کسی بادشاہ سے کیسے مل سکتا ہوں؟ صحابہ کرام نے جواب دیا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو کسی سے ملنے میں کوئی عار نہیں ہے چاہے وہ کیسا بھی آدمی ہو۔

حضور ﷺ سے مکالمہ

چنانچہ وہ چرواہا حیرت کے عالم میں نبی کریم ﷺ کے خیمے میں پہنچ گیا، اور اندر جا کر سرکارِ دو عالم ﷺ جلوہ جہاں آرا کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔ اس چرواہے نے حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا کہ آپ کیوں آئے ہیں؟ آپ کی دعوت کیا ہے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید کا پیغام لے کر آیا ہوں کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لئے صرف اللہ کی عبادت کی جائے، یہی میری بنیادی دعوت ہے۔ اس چرواہے نے کہا کہ اگر میں اس دعوت کو قبول کر لوں اور اللہ کے سوا ہر معبود کا انکار کر دوں تو میرا انجام کیا ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے۔ اور یہ موجودہ زندگی تو عارضی ہے، ناپائیدار ہے، ہر ایک کو اس دنیا سے جانا ہے، اور مرنے کے بعد جو زندگی ملے گی وہ دائمی اور ابدی ہوگی، اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس ابدی زندگی میں اللہ تعالیٰ تمہیں بہت اعلیٰ مقام عطا فرمائیں گے۔

اور اسود مسلمان ہو گیا

پھر چرواہے نے سوال کیا کہ اچھا اگر میں مسلمان ہو گیا تو یہ مسلمان مجھے کیا سمجھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تمہیں اپنا بھائی سمجھیں گے، اور تمہیں اپنے سینے سے لگائیں گے۔ اس چرواہے نے حیرت سے پوچھا کہ مجھے سینے سے لگائیں گے؟ جبکہ میں سیاہ فام آدمی ہوں، اور میرے سینے سے بدبو اُٹھ رہی ہے، اس حالت میں کوئی مالدار آدمی مجھے سینے سے لگانے کے لئے تیار نہیں ہے، آپ فرما رہے ہیں کہ یہ مسلمان مجھے گلے لگائیں گے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اگر تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری بدبو کو خوشبو میں تبدیل کر دیں گے، اور تمہارے چہرے کی سیاہی کو تابناکی میں تبدیل کر دیں گے۔ اس اللہ کے بندے کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے پورا کلمہ پڑھا: "أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" اور ایمان لے آیا۔

پہلے بکریاں مالکوں تک پہنچاؤ

ایمان لانے کے بعد حضورِ اقدس ﷺ سے عرض کیا کہ میں ایمان لے آیا ہوں اور اب آپ کے ہاتھ میں ہوں، جو آپ حکم دیں گے اس کو بجا لاؤں گا۔ لہٰذا اب آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ پہلا کام یہ کرو کہ یہ بکریاں جو تم لے کر آئے ہو، یہ تمہارے پاس ان کے مالکوں کی امانت ہیں، تم اس معاہدے کے تحت یہ بکریاں لائے ہو کہ تم ان کو چَراؤ گے، اور چَرانے کے بعد ان کو واپس کرو گے۔ لہٰذا پہلا کام یہ کرو کہ ان بکریوں کو واپس لے جاؤ، اور خیبر کے اندر لے جا کر ان کے مالکوں تک پہنچا آؤ۔

سخت حالات میں امانت کی پاسداری

ذرا اندازہ لگایئے کہ حالتِ جنگ ہے، اور دشمن کے قلعے کا محاصرہ کیا ہوا ہے، اور جنگ کی حالت میں نہ صرف یہ کہ دشمن کی جان لینا جائز ہو جاتا ہے، بلکہ جنگ کی حالت میں اس کے مال پر بھی قبضہ کر لینا جائز ہو جاتا ہے، ساری دنیا کا یہی قانون ہے۔ اور اس وقت مسلمانوں کے پاس کھانے کی کمی تھی، اور کھانے کی کمی کا یہ عالم تھا کہ اس غزوہ خیبر کے موقع پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مجبور ہو کر گدھے ذبح کر کے ان کا گوشت پکا کر کھانے کی کوشش کی، بعد میں حضورِ اقدس ﷺ نے منع فرمایا کہ گدھے کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے، چنانچہ گدھے کے گوشت کی پکی ہوئی دیگیں اُلٹی گئیں۔ اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کس حالت میں تعالیٰ تھے، لیکن چونکہ وہ چرواہا ایک معاہدے کے تحت وہ بکریاں لے کر آیا تھا، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ پہلے وہ بکریاں واپس کرو۔ اس کے بعد میرے پاس آنا۔

تلوار کے سائے میں عبادت

چنانچہ وہ چرواہا قلعے کے اندر گیا، اور قلعے کے اندر بکریاں چھوڑیں، اور پھر حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ اب کیا کروں؟ اب صورت حال یہ تھی کہ نہ تو اس وقت کسی نماز کا وقت تھا کہ آپ اس کو نماز کا حکم دیتے، نہ رمضان کا مہینہ تھا کہ آپ اس کو روزے کا حکم دیتے۔ اور نہ وہ اتنا مالدار تھا کہ اس کو زکاۃ کا حکم دیتے، نہ حج کا موسم تھا کہ اس سے حج کرایا جاتا۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت تو ایک عبادت ہو رہی ہے، جو تلواروں کے سائے میں انجام دی جارہی ہے، وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ لہٰذا تم اس جہاد میں شامل ہو جاؤ۔ اس چرواہے نے کہا کہ اگر میں اس جہاد میں شامل ہوگیا تو اس میں امکان یہ بھی ہے کہ میں مرجاؤں۔ اگر میں مرگیا تو میرا کیا ہوگا؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم شہید ہوگئے تو اللہ تعالیٰ تمہارے چہرے کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل فرمادیں گے، اور تمہارے بدن کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل کردیں گے۔ چنانچہ وہ اللہ کا بندہ جہاد میں شامل ہوگیا، اور مسلمانوں کی طرف سے لڑا، اور شہید ہوگیا۔

جنت الفردوس میں پہنچ گیا

جب غزوۂ خیبر ختم ہوا تو رسول کریم ﷺ میدان جنگ کا جائزہ لینے کے لئے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ایک جگہ دیکھا کہ صحابہ کرام کا ہجوم ہے۔ آپ قریب پہنچے اور پوچھا: کیا بات ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ جو لوگ اس جہاد میں شہید ہوئے ہیں، اس میں ہمیں ایک لاش نظر آرہی ہے جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی، اس آدمی سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں، اس لئے سب آپس میں رائے زنی کر رہے ہیں کہ یہ کون آدمی ہے؟ اور کس طرح شہید ہوا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے دکھاؤ۔ آپ نے دیکھا تو یہ وہی اسود چرواہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ تم اس کو نہیں پہچانتے، لیکن میں اس کو پہچانتا ہوں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی زندگی میں اللہ کے واسطے ایک سجدہ بھی نہیں کیا، اور جس نے اپنی زندگی میں اللہ کے واسطے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا، لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سیدھا جنت الفردوس میں پہنچا دیا ہے، اور میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے جسم کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل فرمادیا ہے، اور اس کے جسم کی بدبو کو مشک وعنبر سے زیادہ

حسین خوشبو سے تبدیل کر دیا ہے۔[1]

امانت کی اہمیت کا اندازہ لگائیں

اب دیکھئے کہ نبی کریم ﷺ نے عین حالتِ جنگ میں جہاں میدانِ کارزار کھلا ہوا ہے، جہاں لوگ ایک دوسرے کے خلاف جانیں لینے کے لئے تیار ہیں، وہاں پر بھی نبی کریم ﷺ نے اس بات کو گوارا نہیں فرمایا کہ یہ چرواہا امانت میں خیانت کرے، اور مسلمان ان بکریوں پر قبضہ کرلیں۔ بلکہ ان بکریوں کو واپس فرمایا۔ یہ ہے امانت کی اہمیت اور اس کی پاسداری۔ جس کو نبی کریم ﷺ نے اپنے مبارک عمل سے ثابت کیا، لہٰذا امانت میں خیانت کرنا یہ مؤمن کا کام نہیں۔ اسی لئے حدیث شریف میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جب وہ کسی شخص میں پائی جائیں تو وہ پکا منافق ہے، ایک یہ کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب وعدہ کرے تو اس وعدے کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس کوئی چیز امانت رکھوائی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔ یہ تین اوصاف جس انسان میں پائے جائیں گے تو وہ مؤمن نہیں کہلائے گا، بلکہ منافق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو امانت کا پاس کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور خیانت سے ہر مسلمان کو بچائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) البدایہ والنہایۃ (۴/۶۰۹-۶۱۱)

امانت کا وسیع مفہوم ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کا بیان کافی عرصہ سے چل رہا ہے، ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مؤمنین کی ان صفات کو بیان فرمایا ہے، جن پر ان کی صلاح و فلاح کا دارومدار ہے، ان صفات میں سے اکثر کا بیان پہلے ہو چکا ہے، گذشتہ جمعہ کو ''امانت'' کا بیان شروع کیا تھا کہ مسلمان وہ ہے جو امانت کا پاس کرتا ہے۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ امانت میں خیانت کرنا کتنا بڑا جرم اور کتنا بڑا گناہ ہے۔ اور بہت سی امانتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں اکثر و بیشتر ہم لوگوں کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ بھی امانت ہے، اور ہم لوگ اس میں خیانت کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور دل میں کسی جرم اور گناہ کا شعور بھی نہیں ہوتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس گناہ سے توبہ اور استغفار کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/ ۲۲۹ تا ۲۴۹)

(۱) المؤمنون: ۱ - ۸، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔ جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آ چکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابل ملامت نہیں ہیں، ہاں جو اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو ایسے لوگ حد سے گذرے ہوئے ہیں، اور وہ جو اپنے امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں''

ہمارے ذہنوں میں امانت کا مفہوم

چنانچہ عام طور سے لوگ امانت کا جو مطلب سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ کسی شخص نے اپنے کچھ پیسے یا اپنی کوئی چیز ہمارے پاس لا کر رکھوا دی، اور ہم نے اس کو حفاظت سے رکھ دیا، اور اس چیز کو خود استعمال نہیں کیا، اور کوئی گڑبڑ نہیں کی، خیانت نہیں کی۔ بس امانت کا یہی مفہوم سمجھتے ہیں۔ بیشک امانت کا ایک پہلو یہ بھی ہے، لیکن قرآن و حدیث میں جہاں امانت کا لفظ آیا ہے اس کے معنی اور اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اور بہت کشادہ ہے، بہت ساری چیزیں اس کے اندر آ جاتی ہیں۔

یہ زندگی اور جسم امانت ہیں

سب سے پہلی چیز جو امانت کے اندر داخل ہے، وہ ہماری ''زندگی'' ہے، یہ ہماری زندگی جو ہمارے پاس ہے۔ اسی طرح ہمارا پورا جسم سر سے لے کر پاؤں تک یہ امانت ہے، ہم اس جسم کے مالک نہیں، اللہ جل شانہ نے یہ جسم جو ہمیں عطا فرمایا ہے، اور یہ اعضاء جو ہمیں عطا فرمائے ہیں، یہ آنکھیں جس سے ہم دیکھتے ہیں، یہ کان جس سے ہم سنتے ہیں، یہ ناک جس سے ہم سونگھتے ہیں، یہ منہ جس سے ہم کھاتے ہیں، یہ زبان جس سے ہم بولتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ بتاؤ! کیا تم یہ اعضاء کہیں بازار سے خرید کر لائے تھے؟ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی معاوضے کے اور بغیر کسی محنت اور مشقت کے پیدا ہونے کے وقت سے ہمیں دے دیئے ہیں، اور ہمیں یہ فرما دیا کہ ان اعضاء سے اور ان قوتوں سے لطف اُٹھاؤ۔ ان اعضاء کو استعمال کرنے کی تمہیں کھلی اجازت ہے۔ البتہ ان اعضاء کو ہماری معصیت اور گناہ میں مت استعمال کرنا۔

خودکشی کیوں حرام ہے

چونکہ یہ زندگی یہ جسم اور یہ اعضاء امانت ہیں، اسی وجہ سے انسان کے لئے خودکشی کرنا حرام ہے، اور اپنے آپ کو قتل کر دینا حرام ہے، کیوں حرام ہے؟ اس لئے کہ یہ جان اور یہ جسم ہماری اپنی ملکیت ہوتا تو ہم جو چاہتے کرتے، چاہے اس کو تباہ کرتے یا برباد کرتے یا آگ میں جلا دیتے۔ لیکن چونکہ یہ جان اور یہ جسم اللہ کی امانت ہے، اس لئے یہ امانت اللہ کے سپرد کرنی ہے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پاس بلائیں گے، اس وقت ہم جائیں گے، پہلے سے خودکشی کر کے اپنی جان کو ختم کرنا امانت میں خیانت ہے۔

اجازت کے باوجود قتل کی اجازت نہیں

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے سے یہ کہہ دے کہ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم مجھے قتل کردو، یا میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ میرا ہاتھ کاٹ لو، میرا پاؤں کاٹ لو۔ کوئی شخص چاہے کتنی ہی اجازت دیدے، اور اسٹامپ پیپر پر لکھ دے کہ میں اس سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔ لیکن دوسرے شخص کے لئے اس کی اس پیش کش کو قبول کرنا جائز نہیں، بلکہ حرام ہے، البتہ اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے یہ میرے پیسے ہیں تم لے لو اور تم ان پیسوں کو جو چاہو کرو، تو دوسرے شخص کو یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ پیسے لے لے اور جو چاہے کرے۔ لیکن جان لینے اور اعضاء کاٹنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ جسم اور جان ہمارے پاس اللہ تبارک وتعالیٰ کی امانت ہیں۔ اور جب امانت ہیں تو اس کو اس کام میں استعمال کرنا ہے جس کی مالک اجازت دے، اور اس کام سے ان کو بچانا ہے جس سے مالک ناراض ہو، اور جو مالک کو ناپسند ہو۔

اوقات امانت ہیں

اسی طرح زندگی کے یہ لمحات جو گزر رہے ہیں، اس کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ ان لمحات کو ایسے کام میں صرف کرنا ہے جو دنیا کے لحاظ سے یا آخرت کے لحاظ سے فائدہ مند ہو، اور جو کام اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہو، اگر ان لمحات کو اس کے خلاف کاموں میں خرچ کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہو جائے گی۔

قرآن کریم میں امانت

یہی وہ امانت ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ احزاب کے آخری رکوع میں فرمایا ہے:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ط إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾(۱)

اس امانت کو ہم نے آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا کہ یہ امانت تم اُٹھالو تو ان سب نے اس امانت کے اُٹھانے سے انکار کیا کہ نہیں یہ ہمارے بس کا کام نہیں ہے، اور اس امانت کے اُٹھانے سے ڈرے۔ وہ امانت کیا تھی؟ وہ امانت یہ تھی کہ ان سے کہا گیا کہ ہم تمہیں عقل دیں گے، اور سمجھ دیں گے، تمہیں زندگی دیں گے، اور یہ عقل، یہ سمجھ اور یہ زندگی تمہارے پاس ہماری امانت ہوگی،

(۱) الاحزاب: ۷۲

اور ہم تمہیں بتادیں گے کہ فلاں کام میں اس زندگی کو خرچ کرنا ہے، اور فلاں کام میں نہیں کرنا، اگر تم اس زندگی کو ہمارے احکام کے مطابق استعمال کرو گے تو تمہارے لئے جنت ہوگی، اور اگر ہمارے احکام کے خلاف استعمال کرو گے تو تمہارے لئے جہنم ہوگی، اور دائمی عذاب ہوگا۔

آسمان، زمین اور پہاڑ ڈر گئے

جب اس امانت کی پیش کش آسمانوں پہ کی گئی کہ تم یہ امانت اُٹھالو تو آسمانوں نے کہا کہ ہم موجودہ حالت میں بہتر ہیں۔ اگر یہ امانت ہم نے لے لی تو پتہ نہیں کہ اس کو سنبھال سکیں گے یا نہیں۔ اور اگر نہ سنبھال سکے تو آپ کے فرمان کے مطابق دائمی جہنم کے مستحق ہوں گے، اور ہمیشہ کے لئے ایک عذاب کھڑا ہوجائے گا، اس لئے یہ بہتر ہے کہ نہ ہمیں جنت ملے، اور نہ جہنم ملے، اس وقت عافیت سے تو ہیں۔ چنانچہ آسمانوں نے انکار کردیا۔

پھر اس امانت کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر پیش کیا کہ تو بہت بڑا اور ٹھوس کرہ ہے، تیرے اندر پہاڑ ہیں، سمندر ہیں، درخت، جمادات، نباتات تیرے اندر ہیں، تم یہ امانت لے لو، تو زمین نے کہا کہ میں اس کے اُٹھانے کے قابل نہیں ہوں، اگر یہ امانت میں نے اُٹھالی تو خدا جانے میرا کیا حشر بنے گا، لہٰذا اس نے بھی انکار کردیا۔

اس کے بعد پہاڑوں پر اللہ تعالیٰ نے اس امانت کو پیش کیا کہ تم سخت جان ہو، اور لوگ سخت جان ہونے میں پہاڑوں سے تشبیہ دیتے ہیں، تم یہ امانت اُٹھالو۔ انہوں نے بھی انکار کردیا کہ ہم یہ امانت نہیں لیتے، موجودہ حالت ہماری بہتر ہے، اور اگر اس آزمائش میں پڑ گئے تو پتہ نہیں کامیاب ہوں گے، یا ناکام ہوں گے، اور اگر ناکام ہوئے تو ہمارے اُوپر مصیبت آجائے گی۔

انسان نے امانت قبول کرلی

اس کے بعد ہم نے امانت انسان پر پیش کی کہ تم یہ امانت اُٹھالو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ ازل میں انسانوں کی تخلیق سے ہزارہا سال پہلے ان تمام روحوں سے جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھیں، ان سب روحوں کو جمع فرمایا، اور ہر روح ایک چھوٹی سی چیونٹی کی شکل میں سامنے آئی، اور اس وقت ان کے سامنے یہ امانت پیش کی کہ آسمان، زمین اور پہاڑ تو سب اس امانت کے اُٹھانے سے انکار کر گئے، تم یہ امانت لیتے ہو؟ اس انسان نے کہا کہ ہاں میں لیتا ہوں، جب انسان نے قبول کرلیا تو یہ امانت اس کے پاس آگئی۔

لہٰذا یہ زندگی امانت ہے، یہ جسم امانت ہے، یہ اعضا امانت ہیں، اور عمر کا ایک ایک لمحہ امانت

ہے۔ اب جو اس امانت کا پاس کرے وہ انسان دنیا اور آخرت دونوں جگہ فلاح یافتہ ہے۔ یہی وہ امانت ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾(۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو کہ تم نے اللہ تعالیٰ سے امانت لی تھی، اور اللہ کے رسول نے تمہیں اس امانت کے بارے میں بتادیا تھا، اس امانت کے خلاف خیانت نہ کرو، اور جو امانتیں تمہارے پاس موجود ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرو۔ امانت کا سب سے پہلا مفہوم یہ ہے۔

ملازمت کے فرائض امانت ہیں

امانت کا دوسرا مفہوم اس کے علاوہ ہے جس کو عام طور پر لوگ امانت نہیں سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ فرض کرو کہ ایک شخص نے کہیں ملازمت اختیار کی ہے، اس ملازمت میں جو فرائض اس کے سپرد کیے گئے ہیں وہ امانت ہیں، ان فرائض کو وہ ٹھیک ٹھیک بجالائے۔ اور جن اوقات میں اس کو ڈیوٹی دینے کا پابند کیا گیا ہے، ان اوقات کا ایک ایک لمحہ امانت ہے۔ لہٰذا جو فرائض اس کے سپرد کیے گئے ہیں، اگر وہ ان فرائض کو ٹھیک ٹھیک انجام نہیں دیتا، بلکہ کام چوری کرتا ہے تو ایسا شخص اپنے فرائض میں کوتاہی کررہا ہے، اور امانت میں خیانت کررہا ہے۔

وہ تنخواہ حرام ہوگئی

مثلاً ایک شخص سرکاری دفتر میں ملازم ہے، اور اس کو اس کام پر لگایا گیا ہے کہ جب فلاں کام کے لئے لوگ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کا کام کردینا۔ یہ کام اس کے ذمہ ایک فریضہ ہے جس کی وہ تنخواہ لے رہا ہے۔ اب کوئی شخص اس کے پاس اس کام کے لئے آتا ہے، وہ اس کو ٹلا دیتا ہے، اس کو چکر کھلا رہا ہے، تاکہ یہ تنگ آکر مجھے کچھ رشوت دیدے۔ آج کے سرکاری دفتر اس بلا سے بھرے پڑے ہیں، آج سرکاری ملازم جس عہدے پر بھی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو شخص میرے پاس آرہا ہے اس کی کھال اُتارنا اور اس کا خون نچوڑنا میرے لئے حلال ہے۔ یہ امانت میں خیانت ہے، اور وہ اس کام کی جو تنخواہ لے رہا ہے، وہ تنخواہ بھی حرام ہوگئی۔ اگر وہ اپنے فرائض ٹھیک ٹھیک انجام دیتا، اور پھر تنخواہ لیتا تو وہ تنخواہ اس کے لئے حلال ہوتی، اور برکت کا سبب ہوتی۔ لہٰذا اس کام کرنے پر جو رشوت لے رہا

(۱) الانفال: ۲۷

تھا وہ تو حرام ہی تھی، لیکن اس نے حلال تنخواہ کو بھی حرام کر دیا، اس لئے کہ اس نے اپنے فریضے کو صحیح طور پر انجام نہیں دیا۔

ملازمت کے اوقات امانت ہیں

اسی طرح ملازمت کے لئے یہ طے کیا تھا کہ میں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دوں گا، اب اگر اس آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں سے کچھ چوری کر گیا، اور کچھ وقت اپنے ذاتی کام میں استعمال کر لیا تو جتنا وقت اس نے اپنے ذاتی کام میں استعمال کیا، اس وقت میں اس نے امانت میں خیانت کی، کیونکہ یہ آٹھ گھنٹے اس کے پاس امانت تھے، اس کے لئے جائز نہیں تھا کہ اس میں اپنا کوئی ذاتی کام کرے، یہ اوقات بک چکے، اب اگر اس وقت میں دوستوں سے باتیں شروع کر دیں یہ امانت میں خیانت ہے۔ اور جتنی دیر یہ خیانت کی اتنی دیر کی تنخواہ اس کے لئے حلال نہیں۔

پسینہ نکلا یا نہیں؟

میں کہا کرتا ہوں کہ آج کل جب لوگ کہیں ملازمت کرتے ہیں یا مزدوری کرتے ہیں تو یہ حدیث بہت یاد رہتی ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو، مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ بھی تو دیکھو کہ پسینہ نکلا بھی یا نہیں؟ ہمیں پسینہ نکلنے کی تو کوئی فکر نہیں ہے کہ جس کام میں میرا پسینہ نکلنا چاہئے تھا وہ نکلا یا نہیں؟ اور واقعۃً ہم اُجرت کے حقدار بنے یا نہیں؟ اس کو تو کوئی نہیں دیکھتا، بس یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ مزدوری ادا کرو۔ بہر حال! یہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی، اور یہ اوقات کا چرانا یہ سب امانت میں خیانت ہے، اور اس کے عوض جو پیسے مل رہے ہیں وہ حرام ہیں، وہ انسان اپنے پیٹ میں آگ کے انگارے کھا رہا ہے۔

خانقاہ تھانہ بھون کا اصول

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ کی خانقاہ میں اور مدرسہ میں یہ طریقہ تھا کہ استادوں کے لئے گھنٹے مقرر تھے کہ فلاں وقت میں وہ استاد آئے گا، اور فلاں کتاب پڑھائے گا، اور مدرسہ کی طرف سے کوئی قانون اور ضابطہ مقرر نہیں تھا، مگر ہر شخص کا مزاج بنا دیا گیا تھا۔ اس لئے جب کوئی استاد تاخیر سے آتا تو وہ رجسٹر پر نوٹ لکھ دیتا کہ آج میں اتنی تاخیر سے آیا، اور اگر مدرسہ کے اوقات کے درمیان کوئی دوست یا کوئی عزیز رشتہ دار ملاقات کے لئے آ گیا، اور اس کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہو گئے تو اس وقت گھڑی دیکھ کر استاد وقت نوٹ کر لیتا کہ یہ دوست اس

وقت آیا، اور اس وقت واپس گیا، اور آدھا گھنٹہ دوست کے ساتھ بات چیت میں صرف ہوگیا، اور جب تنخواہ وصول کرنے کا وقت آتا تو وہ پورے مہینے کا گوشوارا پیش کرتا اور ایک درخواست پیش کرتا کہ ہم سے اس ماہ میں یہ کوتاہی ہوئی ہے، اور ہم نے اتنا وقت اپنی ذاتی مصروفیات میں خرچ کر دیا تھا، لہٰذا اتنے وقت کی تنخواہ ہماری کاٹ لی جائے۔ اس طرح ہر استاد مہینے کے ختم پر درخواست دے کر اپنی تنخواہ کٹواتا تھا۔

تنخواہ کاٹنے کی درخواست

الحمد للہ، ہم نے دارالعلوم میں بھی یہ طریقہ رکھا ہوا ہے، اور صدر سے لے کر چپڑاسی تک ہر ایک کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جاتا ہے کہ جتنا وقت ذاتی مصروفیات میں استعمال ہوا ہے، اس کی تنخواہ کٹوا دیتے ہیں۔ آج کے دور میں تنخواہ بڑھانے کی مثالیں تو بہت ملیں گی، لیکن کوئی درخواست آپ نے ایسی نہیں دیکھی ہوگی جس میں اس نے یہ درخواست دی ہو کہ میں نے ملازمت کے اوقات کے دوران اتنی دیر اپنا ذاتی کام کرلیا تھا، لہٰذا میری اتنی تنخواہ کاٹ لو، کیونکہ وہ حرام ہے، وہ میرے لئے حلال نہیں۔ آج اس کا کسی کو خیال نہیں۔

اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دو

اس کی وجہ یہ ہے کہ آج یہ نعرہ تو لگایا جاتا ہے کہ ہمارا حق ہمیں پورا ملنا چاہئے، لیکن ہم اپنا فریضہ پورا ادا کریں، اور ہمارے ذمہ جو واجبات ہیں ان کو ادا کریں، اس کی کسی کو فکر نہیں۔ قرآن و حدیث یہ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے فرائض بجالانے کی فکر کرے۔ جب ہر انسان اپنے فرائض صحیح طور پر بجالائے گا تو دوسروں کے حقوق خود بخود ادا ہو جائیں گے۔ بہر حال، اوقات میں چوری کرنا امانت میں خیانت ہے، اور اس کے نتیجے میں اچھی خاصی حلال ملازمت کی آمدنی کو حرام بنالیتے ہیں۔ اگر یہی سرکاری ملازم صبح کو صحیح وقت پر آئے، اور شام کو صحیح وقت پر جائے، اور اپنے فرائض کو صحیح طور پر بجالائے، اور دل میں یہ نیت کرے کہ یا اللہ! میں آپ کی مخلوق کی خدمت کے لئے یہاں بیٹھا ہوں، چونکہ اپنا پیٹ اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے تنخواہ ضروری ہے اس وجہ سے تنخواہ لیتا ہوں، لیکن میری نیت یہ ہے کہ میں مخلوق کی خدمت کروں، تو اس صورت میں یہ پورے آٹھ گھنٹے اس کے لئے عبادت اور اجر و ثواب کا باعث بن جائیں گے، اور تنخواہ بھی حلال ہوگی۔ لیکن اگر اوقات کی چوری کرلی، یا اپنے فرائض پورے طور پر انجام نہیں دیئے تو اس نے حلال آمدنی کو حرام بنالیا، اس تنخواہ کو آگ کے انگارے بنالیے۔

حلال اور حرام میں فرق

آج ان پیسوں میں فرق نظر نہیں آرہا ہے، بلکہ حلال اور حرام دونوں دیکھنے میں یکساں نظر آرہے ہیں، لیکن جب یہ ہماری ظاہری آنکھیں بند ہوں گی، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اس وقت پتہ چلے گا کہ یہ حرام آمدنی جو لے کر آیا تھا وہ آگ کے انگارے تھے، جو وہ اپنے پیٹ میں بھر رہا تھا، قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا﴾(۱)

یعنی جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔ آج ہماری پوری قوم عذاب میں مبتلا ہے، کسی کو سکون نہیں ہے، کسی کو چین نہیں ہے، کسی کو آرام نہیں ہے، کسی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، ہر ایک انسان بھاگ دوڑ میں مبتلا ہے، یہ سب اس لئے ہے کہ امانت میں خیانت کرنا اس قوم کی گھٹی میں پڑ گئی ہے، اور جس قوم کو حلال اور حرام کی پرواہ باقی نہ رہی ہو، وہ فلاح کہاں سے پائے گی۔ قرآن کریم کا فرمان یہ ہے کہ فلاح ان لوگوں کو ملے گی جو امانتوں کا اور عہد کا پاس کرنے والے ہیں۔

عاریت کی چیز امانت ہے

امانت کی ایک اہم قسم یہ ہے کہ کسی دوسرے کی کوئی چیز آپ کے پاس عاریتاً آگئی ہے، ''عاریت'' کا مطلب یہ ہے کہ جیسے کسی سے کوئی چیز استعمال کے لئے لے لینا، مثلاً کوئی کتاب دوسرے سے پڑھنے کے لئے لے لی، یا دوسرے کا قلم لے لیا، یا گاڑی لے لی، یہ چیزیں امانت ہیں، لہٰذا پہلی بات تو اس میں یہ ہے کہ جب ضرورت پوری ہو جائے اس کے بعد جلد از جلد اس چیز کو اس کے مالک تک پہنچانا ضروری ہے۔ آج لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے، چنانچہ ایک چیز وقتی ضرورت کے ساتھ آپ نے دوسرے سے لے لی تھی، اب ضرورت ختم ہوگئی، لیکن وہ چیز آپ کے پاس پڑی ہوئی ہے، واپس پہنچانے کی فکر نہیں ہے۔ اور اصل مالک بعض اوقات مانگتے ہوئے شرماتے ہیں کہ اگر میں نے مانگا تو اس کو برا لگے گا۔ لیکن اس کو ضرورت ہے اور اس کے دل پر ایک تشویش ہے کہ میری یہ چیز فلاں کے پاس ہے، اور آپ نے بے پرواہی میں وہ چیز ڈال رکھی ہے، تو جتنی دیر وہ چیز اس کے مالک کی خوشدلی کے بغیر آپ کے پاس رہے گی، اتنی دیر آپ امانت میں خیانت کے مرتکب ہوں گے۔

---

(۱) النساء: ۱۰

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور امانت کی فکر

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہٗ، جب آخری عمر میں بہت زیادہ بیمار ہوگئے تھے، اور صاحبِ فراش ہوگئے تھے، اور دل کی تکلیف تھی، چارپائی سے اُٹھ کر چلنا مشکل ہوتا تھا، اس لئے اپنی چارپائی پر ہی سارا کام انجام دیتے تھے، کھانا بھی چارپائی پر کھاتے تھے، اور جب کھانے سے فارغ ہوتے تو ہمیں حکم دیتے کہ یہ برتن فوراً باورچی خانے میں پہنچادو۔ بعض اوقات ہم کسی کام میں مشغول ہوتے اور برتن پہنچانے میں کچھ تاخیر ہوجاتی تو ناراض ہوجاتے۔ اسی طرح کوئی دوسری چیز دوسرے کمرے سے اس کمرے میں آجاتی تو ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً واپسی کا حکم دیتے کہ اس کو اپنی جگہ رکھ دو۔ ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ حضرت! یہ سب آخر گھر ہی کی چیزیں ہیں، اگر ان چیزوں کو اپنی جگہ رکھنے میں تھوڑی تاخیر ہوجائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ اور آپ تاخیر کی وجہ سے اتنے پریشان کیوں ہوجاتے ہیں؟

اس وقت جو جواب دیا اس سے اندازہ ہوا کہ یہ اللہ والے کتنی دور کی بات سوچتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے اپنے وصیت نامے میں یہ لکھ دیا ہے کہ جتنی اشیاء اس کمرے میں ہیں، وہ صرف میری ملکیت ہیں، اور باقی گھر کی ساری اشیاء میں اپنی اہلیہ کی ملکیت کرچکا ہوں، وہ میری ملکیت میں نہیں ہیں، اب اگر کوئی چیز باہر سے یہاں آجاتی ہے تو وہ ان کی ملکیت ہے، اور میرے پاس امانت ہے، اور امانت کا حکم یہ ہے کہ اسے اس کے اصل مالک تک جلد از جلد پہنچاؤ۔

موت کا دھیان ہر وقت

دوسری بات یہ ہے کہ اگر میرا اس حالت میں انتقال ہوجائے، اور وہ چیز میرے کمرے میں پڑی رہ جائے، اور جبکہ وصیت نامے میں میں نے یہ لکھ دیا ہے کہ جو چیزیں میرے کمرے میں ہیں، وہ سب میری ملکیت ہیں، تو اس وصیت کے اعتبار سے جو چیزیں میری ملکیت نہیں وہ میری ملکیت شمار ہوجائیں گی، اور اندیشہ ہے اس کے نتیجے میں حقدار کا حق فوت ہوجائے گا، اس وجہ سے میں یہ چاہتا ہوں کہ جو چیز باہر سے آئے وہ جلد از جلد اپنی جگہ پر پہنچ جائے۔ اب آپ امانت کی اہمیت کا اندازہ لگائیں۔ یہ سب شریعت کے احکام ہیں، جن کا شریعت نے حکم دیا ہے لیکن ہم لوگ دن رات ان احکام سے لاپرواہی میں مبتلا ہیں۔ دوسروں کی چیز ہمارے پاس پڑی ہوئی ہے، ہمیں اس کو واپس کرنے کی کوئی فکر نہیں۔ کسی بیچارے نے آپ کے پاس اپنے برتنوں میں کھانا بھیج دیا تھا، اب آپ کھانا کھا کر ختم کرچکے، لیکن برتن پڑے ہوئے ہیں، ان کو بھجوانے کا کوئی اہتمام نہیں، حالانکہ وہ برتن آپ کے پاس

امانت ہیں، اگر اس دوران وہ برتن آپ کے پاس ٹوٹ جائے تو اس کا وبال آپ کے ذمے ہوگا، چونکہ آپ نے بروقت واپس کرنے کا اہتمام نہیں کیا۔

دوسرے کی چیز کا استعمال

ایک بات یہ ہے کہ اگر دوسرے کی چیز ہمارے استعمال میں ہے تو اس چیز کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال کرنا بھی امانت میں خیانت ہے، مالک نے جس کام کے لئے دی، اس کام میں استعمال کرنا تو جائز ہے، کیونکہ اس کی مرضی اس میں شامل ہے، لیکن اس کی مرضی کے خلاف چوری چھپے استعمال کیا جائے گا تو یہ امانت میں خیانت ہوگی، اور بڑا گناہ ہے، مثلاً کسی نے آپ کو کسی خاص مقصد کے استعمال کے لئے گاڑی دے دی تو اب خاص مقصد میں استعمال کرنا تو جائز ہے، لیکن اس خاص مقصد کے علاوہ دوسرے کسی کام استعمال کر لی تو ناجائز، حرام اور امانت میں خیانت ہے۔

دفتری اشیاء کا استعمال

جو لوگ دفتر میں ملازم ہوتے ہیں، ان کو دفتر کی طرف سے بہت سی چیزیں استعمال کرنے کے لئے ملتی ہیں۔ اب دفتر کے قواعد اور ضوابط کے تحت تو ان اشیاء کو استعمال کرنا جائز ہے، اور اگر ان قواعد اور ضوابط کے خلاف استعمال کیا جائے تو یہ حرام ہے، اور امانت میں خیانت ہے۔ مثلاً دفتر کی طرف سے آپ کو پین ملا ہے، پیڈ ملا ہے، لفافے ملے ہیں، یا دفتر میں آپ کے فون لگا ہوا ہے، یا دفتر کی طرف سے آپ کو گاڑی ملی ہوئی ہے، یا موٹر سائیکل ملی ہوئی ہے۔ اور اب ان چیزوں کے استعمال کے بارے میں دفتر کے کچھ قواعد ہیں کہ ان قوعد کے تحت ان اشیاء کو استعمال کیا جائے، تو اب قواعد کے دائرے میں ان اشیاء کو استعمال کرنا جائز ہے، ان قواعد سے الگ ہٹ کر آپ نے ان اشیاء کو اپنے کسی ذاتی کام میں استعمال کر لیا تو خیانت ہے، اور اس کے نتیجے میں خیانت کا عظیم گناہ انسان کے ذمے لازم آجاتا ہے۔ کہاں تک شمار کیا جائے، ورنہ زندگی کے ہر شعبے میں کہیں نہ کہیں ہمارے پاس امانت موجود ہے۔

دواؤں کا غلط استعمال

ایک صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے علاج کرانا بہت آسان کر دیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیسے آسان کر دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب ہیں، وہ ہم پر بڑے مہربان ہیں، ان کو اپنے دفتر سے علاج کی سہولت ملی ہوئی ہے، وہ جو دوا

خریدتے ہیں، اس کا بل دفتر میں جمع کرادیتے ہیں، دفتر والے وہ رقم ان کو ادا کردیتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے کہہ دیا ہے کہ تمہیں جب بھی کوئی دوائی خریدنی ہو، تم خرید کر بل مجھے دے دیا کرو، میں دفتر سے اس کی رقم وصول کر کے تمہیں دے دیا کروں گا، اس طرح تمہیں یہ دوائیاں مفت مل جایا کریں گی۔

اب دیکھئے کہ ان صاحب کو دفتر والوں نے یہ سہولت دے رکھی تھی کہ ان کے گھر کا کوئی آدمی بیمار ہو جائے، اور اس کے علاج پر جو خرچہ آئے تو اس کا بل جمع کرادیں تو ان کو دفتر سے پیسے مل جائیں گے۔ لیکن انہوں نے یہ سخاوت شروع کردی کہ اپنے پڑوسیوں کو اور اپنے دستوں کو اس میں شامل کرلیا۔ اب جھوٹ اس کے اندر موجود ہے، دغابازی اس کے اندر موجود ہے، اور امانت میں خیانت اس میں موجود ہے، اس لئے کہ جو رقم تمہیں مل رہی ہے وہ امانت ہے، جہاں استعمال کرنے کی اجازت ہے بس وہیں پر استعمال کرنا آپ کے لئے حلال ہے، اس کے علاوہ حرام ہے۔ وہ صاحب یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نیکی کر رہے ہیں دوسروں کے ساتھ، لیکن حقیقت میں وہ بہت بڑا گناہ ہے، جس کے نتیجے میں آخرت میں گردن پکڑی جائے گی۔

حرام آمدنی کا ذریعہ

یہ تو صرف سخاوت کی حد تک بات تھی، جبکہ بہت سے لوگوں نے اس کو آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا ہے، مثلاً دوسرے سے کہہ دیا کہ تم دوا خرید کر بل ہمیں دے دو، جو پیسے ملیں گے، اس میں سے آدھے تمہارے، آدھے ہمارے۔ آج امانت کا لحاظ نہ رکھنے کے نتیجے میں معاشرہ تباہ ہو چکا ہے، اور یہ جو دن رات مصیبتیں، پریشانیاں، بیماریاں اور دشمنوں کے حملے، بدامنیاں اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، یہ سب کیوں نہ ہو، جبکہ ہم نے اپنے آپ کو ان کاموں کے لئے منتخب کرلیا ہے جو کافروں کے تھے، ان کافروں نے کم از کم اپنی حد تک امانت اور دیانت کو اپنا لیا ہے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں عروج دے دیا۔ اور ہم نے قرآن کریم کی ہدایات کو ترک کردیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہر جگہ پست اور ذلیل ہو رہے ہیں۔

باطل مٹنے کے لئے آیا ہے

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ ایک بڑی خوبصورت بات فرمایا کرتے تھے، جو ہر مسلمان کو یاد رکھنی چاہئے، فرمایا کرتے تھے کہ باطل میں اُبھرنے کی صلاحیت ہی نہیں، قرآن کریم تو یہ کہتا ہے:

﴿إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾(۱)

(۱) بنی اسرائیل: ۸۱

یعنی باطل تو دبنے کے لئے اور مٹنے کے لئے آیا ہے، اُبھرنے کے لئے نہیں آیا، لیکن اگر کسی باطل قوم کو تم دیکھو کہ وہ دنیا کے اندر اُبھر رہی ہے اور ترقی کر رہی ہے تو سمجھ لو کہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے، جس نے اس کو اُبھارا ہے۔ باطل میں اُبھرنے کا دم نہیں تھا۔

حق صفات نے اُبھار دیا ہے

لہٰذا یہ ہمارے دشمن جن کو ہم روزانہ برا بھلا کہتے ہیں، چاہے وہ امریکہ ہو، یا برطانیہ ہو، انہوں نے دنیا کے اندر جو مقام حاصل کیا ہے وہ باطل کی وجہ سے حاصل نہیں کیا، بلکہ کچھ حق کی صفات ان کے ساتھ لگ گئی ہیں، جو انہوں نے ہم سے لی ہیں، وہ یہ کہ انکے اندر آپس کے معاملوں میں امانت داری ہے، اور خیانت سے حتی الامکان اکثر و بیشتر لوگ پرہیز کرتے ہیں۔ وہاں بھی سب لوگ ایک جیسے نہیں ہیں، وہاں پر بھی بڑے بڑے دھوکہ باز پڑے ہوئے ہیں، لیکن عام طور پر آپس کے معاملات میں انہوں نے امانت اور دیانت کو اپنایا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر یہ قانون بنایا ہے کہ جو شخص صحیح راستہ اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں عروج دیں گے، آخرت میں اگرچہ ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، لیکن دنیا میں ان کو ترقی دے دی جائے گی، اور مسلمانوں نے یہ چیزیں چھوڑ دیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ آج دنیا کے اندر ذلیل ہو رہے ہیں۔

مجلس کی باتیں امانت ہیں

ایک اور چیز ہے جس کی طرف نبی کریم ﷺ نے وضاحت کے ساتھ توجہ دلائی، چنانچہ آپ نے فرمایا:

((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ))(۱)

یعنی انسانوں کی مجلسوں میں کہی گئی بات بھی "امانت" ہے، مثلاً دو چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے، ان میں سے کسی ایک نے کوئی بات کہی، تو آپ کے لئے جائز نہیں کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی بات کو کہیں اور جا کر نقل کر دیں، اس لئے کہ جو بات اس کے منہ سے نکل کر آپ کے کان میں پڑی ہے، وہ آپ کے پاس اس کی امانت ہے، لہٰذا اگر وہ بات کسی اور سے بیان کرنی ہے تو پہلے اس سے اجازت لو کہ میں تمہاری یہ بات فلاں سے نقل کرنا چاہتا ہوں، آپ کی اجازت ہے یا نہیں؟ اس کی اجازت کے بغیر اس بات کو کہیں اور جا کر بیان کرنا امانت میں خیانت ہے۔

---

(۱) سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی نقل الحدیث، رقم: ٤٢٢٦، مسند أحمد، رقم: ١٤١٦٦

راز کی بات امانت ہے

اسی طرح کسی نے آپ کو اپنے راز کی کوئی بات کہہ دی، اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اس کو اپنی حد تک رکھنا، تو جب تک اس کی مرضی نہ ہو، اس بات کو کہیں اور جا کر نقل کرنا یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق امانت میں خیانت ہے۔ آج ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر دوسرے کے راز کی کوئی بات معلوم ہوگئی تو اب اس کو ساری دنیا میں گاتے پھر رہے ہیں، یہ سب امانت میں خیانت کے اندر داخل ہے۔

اعضاء امانت ہیں

اگر ذرا گہری نظر سے دیکھو تو انسان کا اپنا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، یہ جسم سر سے لے کر پاؤں تک ہماری ملکیت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے استعمال کے لئے ہمیں دیا ہوا ہے، یہ ہمارے ہاتھ، یہ ہمارے پاؤں، یہ ہماری آنکھیں، یہ ہمارے کان، کیا ہم ان کو کہیں بازار سے خرید کر لائے تھے؟ یا خود ہم نے بنائے تھے؟ بلکہ یہ سب اللہ جل جلالہ کی عطا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں مفت دیئے ہیں۔ یہ آنکھیں بھی امانت ہیں، ہمارے کان بھی امانت ہیں، ہمارے ہاتھ بھی امانت، ہمارے پاؤں بھی امانت، لہٰذا جب امانت ہیں تو اگر ان کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف استعمال کیا جائے گا وہ امانت میں خیانت ہوگی۔

آنکھ کی خیانت

مثلاً اگر آنکھ سے ان چیزوں کو دیکھا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہیں، اور نامحرم پر لذت لینے کے لئے نگاہ ڈالی جا رہی ہے، ایسی فلمیں دیکھی جا رہی ہیں جن کا دیکھنا حرام ہے، تو یہ آنکھ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت میں استعمال ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہ آنکھ تمہیں اس لئے دی تھی کہ تم اس سے نفع اُٹھاؤ، دنیا کے حسین مناظر اس کے ذریعے دیکھو، اس کے ذریعے اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہو، اس کے ذریعے اپنے والدین کو دیکھ کر خوش ہو، اس کے ذریعے اپنے بھائی، بہن اور دوست احباب کو دیکھ کر خوش ہو، اور اس کے ذریعے دنیا کے کام چلاؤ۔ لیکن تم نے اس آنکھ کو فساد میں استعمال کرلیا، گناہ اور معصیت میں استعمال کرلیا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت ہوئی۔

کان اور ہاتھ کی خیانت

یہ کان تمہیں اس لئے دے گئے تھے کہ اس کے ذریعے ضرورت کی باتیں سنو، اچھی باتیں بھی سنو، اور تفریح کی باتیں بھی سنو، لیکن معصیت کی باتیں سننے سے تمہیں روکا گیا تھا۔ لیکن تم نے اس کان کو معصیت کی باتیں سننے میں استعمال کیا، یہ اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت ہوئی۔

یہ ہاتھ اللہ تعالیٰ نے اس لئے دیئے تھے تاکہ تم اس کے ذریعے جائز مقاصد حاصل کرسکو، کماؤ، محنت کرو، جدو جہد کرو۔ لیکن تم نے یہ ہاتھ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے پھیلا دیئے، جہاں پھیلانا تمہارے لئے جائز نہیں تھا، یہ ہاتھ کا غلط استعمال ہے، جو امانت میں خیانت ہے۔ یا ان ہاتھوں سے ایسی چیز پکڑ لی جس کا پکڑنا تمہارے لئے جائز نہیں تھا، یہ امانت میں خیانت ہے۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے

ہر انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دہ ہے، لوگ کیا کر رہے ہیں، ان کو دیکھ کر میں بھی ان جیسا بن جاؤں، اس کا کوئی جواز نہیں۔ اگر ہر انسان کے دل میں ضمیر کی شمع روشن ہو جائے، تقوے کی شمع روشن ہو جائے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔ اگر ایک آدمی کے دل میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا ہے، اور دوسرے سے تیسرا چراغ جلتا ہے، اور اس طرح ماحول میں اُجالا ہو جاتا ہے، لہٰذا ہر انسان اپنی جگہ پر امانت کا پاس کرنے کی فکر کرے، یہ نہ سوچے کہ ساری دنیا ایک طرف جارہی ہے، میں اکیلا کیا کروں گا۔ بات یہ ہے کہ دنیا میں جب بھی کوئی کام ہوا ہے وہ اکیلے ہی انسان سے ہوا ہے۔ پیغمبر جب دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو وہ تنہا ہوتے ہیں، کوئی ان کے ساتھ نہیں ہوتا، لیکن جب کام شروع کر دیتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مدد ہوتی ہے۔

میں تو تنہا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور امانتوں کا پاس رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

عہد اور وعدہ کی اہمیت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ ۝ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُونَ ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں، ان کی تشریح کا سلسلہ کافی عرصہ سے چل رہا ہے، اور ہم اس آیتِ کریمہ تک پہنچے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے والے مؤمنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُونَ﴾

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی امانتوں کا لحاظ کرتے ہیں، اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔ امانتوں کی رعایتوں سے متعلق میں نے گزشتہ دو جمعوں میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس کی مختلف صورتیں بیان کی تھیں کہ امانت میں کیا کیا چیزیں داخل ہوتی ہیں، اور امانت میں خیانت کرنا، اور امانت کا پاس نہ رکھنے کی کیا کیا صورتیں ہمارے معاشرے میں رائج ہو چکی ہیں، اور ان سب سے بچنے کی ضرورت ہے۔

قرآن وحدیث میں عہد

دوسری چیز جو اس آیتِ کریمہ میں بیان کی گئی ہے، وہ ''عہد کا لحاظ'' رکھنا، یعنی مؤمن کا کام یہ

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۲۵۳ تا ۲۶۷)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) المؤمنون: ۱ تا ۸

ہے کہ وہ جو عہد کرلیتا ہے یا جو وعدہ کرلیتا ہے وہ اس کا پورا پاس کرتا ہے، پورا لحاظ کرتا ہے، اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ''وعدہ'' اور ''عہد'' کی پاسداری کا حکم دیا ہے، ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾(۱)

یعنی جو عہد کرو اس کو پورا کرو، کیونکہ اس عہد کے بارے میں تم سے آخرت میں سوال ہوگا۔ کہ تم نے فلاں وعدہ کیا تھا، اس کو پورا کیا یا نہیں کیا؟ فلاں عہد کیا تھا، پورا کیا یا نہیں کیا؟ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾(۲)

اے ایمان والو! تم آپس میں کسی کے ساتھ عہد و پیمان باندھ لو تو اس کو پورا کرو۔

بہر حال! قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کی تاکید آئی ہے، اور یہ بھی مسلمان کے مسلمان ہونے کی علامت قرار دی گئی کہ مسلمان کبھی عہد شکنی نہیں کرتا، جو وعدہ کرتا ہے اس کو پورا کرتا ہے۔ اور وعدہ کو پورا نہ کرنا یہ منافق کی علامت قرار دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

((ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))(۳)

''منافق کی تین علامتیں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدے کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کرے''

وعدہ کرنے سے پہلے سوچ لو

اس سے معلوم ہوا کہ ان تینوں میں سے کوئی کام بھی مؤمن کا کام نہیں، مسلمان کا کام نہیں کہ وہ جھوٹ بولے، یا وعدہ خلافی کرے، یا امانت میں خیانت کرے۔ آدمی وعدہ کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچ لے کہ میں اس وعدے کو پورا کرسکوں گا یا نہیں، وعدہ کرنے میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن جب سوچ سمجھ کر مشورہ کرکے تمام نتائج کو سامنے رکھنے کے بعد جب ایک وعدہ کرلیا تو اب

---

(۱) بنی اسرائیل: ۳٤ (۲) المائدۃ: ۱

(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب علامة المنافق، رقم: ۳۳، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال المنافق، رقم: ۸۸، سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول اللہ، باب ما جاء فی علامة المنافق، رقم: ۲۵۵٦

مسلمان کا کام یہ ہے کہ اس وعدے پر قائم رہے۔ صرف ایک صورت ہے جو شریعت نے جائز قرار دی ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن کوئی حقیقی عذر پیش آ گیا، اور عذر کی حالت اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ فرمائی ہے، اس صورت میں دوسرے آدمی کو بتادے کہ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا، لیکن مجھے کچھ عذر پیش آ گیا ہے، جس کی وجہ سے میں یہ وعدہ پورا کرنے سے قاصر ہوں۔

عذر کی صورت میں اطلاع دے

مثلاً فرض کریں کہ آپ نے کسی سے وعدہ کرلیا کہ میں کل تمہارے گھر آؤں گا، اور ارادہ بھی تھا کہ کل اس کے گھر جائیں گے، لیکن بعد میں تم بیمار ہو گئے، یا گھر میں کوئی اور بیمار ہو گیا، اور اس کی دیکھ بھال کے لئے اس کے پاس رہنا ضروری ہے، اور جانا ممکن نہیں ہے، تو یہ ایک عذر ہے اور عذر کی صورت میں اگر کوئی شخص وعدہ پورا نہ کرے تو شریعت میں اس کی گنجائش ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادیتے ہیں۔ البتہ اس صورت میں حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ سامنے والے کو ایسے وقت میں بتادیا جائے کہ وہ کسی اُلجھن اور پریشانی میں مبتلا نہ ہو۔ بہرحال، وعدہ پورا کرنا ایمان کی علامت ہے، اور وعدے کی خلاف ورزی کو حضورِ اقدس ﷺ نے نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کے سامنے ایک صحابی کسی بچے کو اپنے پاس بلانا چاہتے تھے، اور وہ بچہ ان کے پاس نہیں آرہا تھا، اور آنے سے انکار کر رہا تھا۔ ان صحابی نے اس بچے کو ترغیب دینے کے لئے یہ کہہ دیا کہ آؤ بیٹا! ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمہیں ایک چیز دیں گے۔ جب حضورِ اقدس ﷺ نے ان کے یہ الفاظ سنے کہ ''ہم تمہیں ایک چیز دیں گے'' تو آپ نے ان صحابی سے پوچھا کہ یہ بتاؤ تمہارا واقعی اس بچے کو چیز دینے کا ارادہ تھا یا ویسے ہی بہلانے کے لئے آپ نے اس سے یہ کہہ دیا تھا؟ ان صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس ایک کھجور تھی، اور میرا ارادہ تھا کہ جب وہ آئے گا تو اس کو کھجور دے دوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر واقعی تمہارا کھجور دینے کا ارادہ تھا، تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر تمہارا دل میں اس کو کچھ دینے کا ارادہ نہیں تھا، بلکہ محض اس کو اپنے پاس بلانے کے لئے اس کو یہ کہہ دیا کہ ہم تمہیں ایک چیز دیں گے تو یہ تمہاری طرف سے وعدہ خلافی ہوگی۔ (۱)

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم: ۴۳۳۹، مسند أحمد، رقم: ۱۵۱۴۷

بچے سے وعدہ کر کے پورا کریں

اور بچے کے ساتھ وعدہ خلافی کرنے میں دوہرا نقصان ہے، ایک نقصان تو وعدہ خلافی کے گناہ کا ہے، اور دوسرا نقصان یہ ہے کہ پہلے دن سے ہی بچے کے ذہن میں آپ یہ بات ڈال رہے ہیں کہ وعدہ کر کے مکر جانا کوئی خرابی کی بات نہیں۔ بچہ کا ذہن ایسا صاف ہوتا ہے جیسے سادہ پتھر، اس پر جو چیز نقش کر دی جائے تو ہمیشہ کے لئے وہ چیز نقش ہو جاتی ہے۔ گویا کہ پہلے دن سے آپ نے وعدہ خلافی کا بیج بچے کے ذہن میں بو دیا۔ اب اگر وہ بچہ آئندہ کبھی بھی وعدہ خلافی کرے گا تو اس وعدہ خلافیوں کے گناہ میں آپ بھی حصہ دار ہوں گے، اس لئے کہ آپ نے اپنے طرزِ عمل سے اس کو وعدہ خلاف بنایا، اس لئے بچے کے ساتھ خاص طور پر اس بات کا اہتمام کرنا چاہئے کہ یا تو بچہ سے وعدہ کرو نہیں، اگر وعدہ کرو تو اس کو پورا کرو، تاکہ بچے کو یہ احساس ہو کہ جب کوئی وعدہ کیا جاتا ہے تو اس کو پورا کیا جاتا ہے۔

بچے کے اخلاق بگاڑنے میں آپ مجرم ہیں

ہمارے معاشرے میں اس معاملے کے اندر غفلت اور بے احتیاطی بہت عام ہے، کہ بچے کو تعلیم دلانے کے لئے اچھے سے اچھے اسکول میں داخل کر دیا، لیکن گھر کا ماحول ایسا بنایا ہوا ہے جس سے اس بچے کا مزاج و مذاق اس کے اخلاق و کردار خراب ہو رہے ہیں۔ مثلاً آپ گھر سے باہر کہیں جا رہے ہیں، اور بچہ ضد کر رہا ہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ اب آپ نے اس بچے سے جان چھڑانے کی خاطر کوئی وعدہ کر لیا کہ میں تمہارے لئے ایک چیز لے کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ چلے گئے۔ آپ نے اس بچے کو بہلا تو دیا، لیکن جو وعدہ آپ نے اس بچے کے کیا تھا، وہ پورا نہیں کیا تو ایک طرف تو آپ وعدہ خلافی کے مجرم بنے، دوسرے یہ کہ اس بچے کی تربیت خراب کرنے کے مجرم بنے، اس بچے کا ذہن پہلے دن سے آپ نے خراب کر دیا۔ لہٰذا بچے کے ساتھ معاملات کرنے میں بہت احتیاط کرنی چاہئے۔

بچوں کے ذریعے جھوٹ بلوانا

ہمارے معاشرے میں یہ بات بھی بکثرت عام ہے کہ ایک شخص آپ کے گھر پر آپ سے ملنے کے لئے آیا، یا کسی کا فون آیا، اور بچے نے آکر آپ کو اطلاع دی کہ فلاں صاحب آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں، یا فلاں صاحب آپ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ اب آپ کا ان صاحب سے بات کرنے کو اور ملنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، اس لئے آپ نے بچے سے کہہ دیا کہ جاؤ ان سے کہہ دو کہ

ابو گھر پر نہیں ہیں۔ اب بچہ تو یہ دیکھ رہا ہے کہ ابا جان گھر پر موجود ہیں، لیکن میرے ابا گھر پر موجود ہونے کے باوجود مجھ سے کہلوار ہے ہیں کہ جا کر جھوٹ بول دو کہ گھر پر موجود نہیں ہیں، تو آج جب آپ اس سے جھوٹ بلوائیں گے تو کل جب وہ جھوٹ بولے گا تو کس منہ سے آپ اس کو جھوٹ بولنے سے روکیں گے۔ اس لئے کہ آپ نے تو خود اس کو جھوٹ بولنے کا عادی بنا دیا، اپنے ذرا سے مفاد کی خاطر جھوٹ کی سنگینی اس بچے کے دماغ سے مٹادی تو اب اگر وہ بچہ جھوٹ بولے گا، اور اس بچے کو جھوٹ کی عادت پڑ جائے گی تو اس گناہ میں آپ بھی برابر کے شریک ہوں گے، اور آپ نے اس بچے کی زندگی تباہ کر دی۔ اس لئے کہ جو آدمی جھوٹ بولنے کا عادی ہوتا ہے تو دنیا میں کہیں بھی اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا، اس پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ اس لئے بچوں کے ساتھ معاملات کرنے میں خاص طور پر بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بچوں کو سچائی سکھائی جائے، ان کو امانت داری سکھائی جائے، ان کو وعدے کی پابندی سکھائی جائے۔

حضور ﷺ کا تین دن انتظار کرنا

روایات میں ایک واقعہ آتا ہے، جو نبوت کے عطا ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کا کسی شخص کے ساتھ معاملہ ہوا، اور آپس میں یہ طے ہوا کہ فلاں جگہ پر کل کو آپس میں ملاقات کریں گے۔ دن، جگہ اور وقت سب طے ہو گیا۔ جب وقتِ مقررہ آیا تو رسول کریم ﷺ اس جگہ پر پہنچ گئے۔ اب آپ وہاں جا کر کھڑے ہو گئے، مگر وہ شخص جس سے وعدہ کیا ہوا تھا، وہ اس جگہ نہیں آیا، انتظار کرتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے، مگر وہ شخص نہیں آیا۔ رسول کریم ﷺ وہاں کھڑے رہے۔ روایات میں آتا ہے کہ تین دن تک متواتر حضورِ اقدس ﷺ نے اس شخص کا انتظار کیا۔ صرف ضرورت کے لئے گھر جاتے، پھر واپس اس جگہ آجاتے۔ تین دن بعد جب وہ صاحب آئے تو آپ نے صرف اتنا کہا کہ تم نے وعدے پر نہ آکر مجھے تکلیف پہنچائی ــــ تو صرف وعدے کو پورا کرنے کے لئے کہ کہیں اس وعدے کی خلاف ورزی نہ ہو جائے، تین دن تک متواتر آپ نے وہاں انتظار فرمایا۔(۱)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ابوجہل سے وعدہ

حضورِ اقدس ﷺ نے ایسے ایسے وعدوں کو نبھایا کہ آج اس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، اور حضور ﷺ کے راز دار ہیں۔ جب یہ اور ان کے والد یمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، تو مسلمان ہونے کے بعد حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں مدینہ طیبہ

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في العدة، رقم: ٤٣٤٤

آ رہے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل اور اس کے لشکر سے ہوگئی۔ اس وقت ابوجہل اپنے لشکر کے ساتھ حضورِ اقدس ﷺ سے لڑنے کے لئے جا رہا تھا۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی تو اس نے پکڑ لیا، اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں مدینہ طیبہ جا رہے ہیں۔ ابوجہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لئے کہ تم مدینہ جا کر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لو گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد تو صرف حضور ﷺ سے ملاقات اور زیارت ہے۔ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ ابوجہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جا کر صرف ملاقات کرو گے، لیکن جنگ میں حصہ نہیں لو گے۔ انہوں نے وعدہ کر لیا۔ چنانچہ ابوجہل نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ جب حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں پہنچے، اس وقت حضورِ اقدس ﷺ اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوۂ بدر کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہو چکے تھے، اور راستے میں ملاقات ہوئی۔

حق اور باطل کا پہلا معرکہ ''غزوۂ بدر''

اب اندازہ لگایئے کہ اسلام کا پہلا حق و باطل کا معرکہ (غزوۂ بدر) ہو رہا ہے۔ اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے ''یوم الفرقان'' فرمایا، یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والا معرکہ، وہ معرکہ ہو رہا ہے جس میں جو شخص شامل ہو گیا، وہ ''بدری'' کہلایا، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ''بدری'' صحابہ کا بہت اونچا مقام ہے۔ اور ''اسمائے بدریین'' بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں۔ انکے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ وہ ''بدریین'' جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یہ پیشین گوئی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہلِ بدر کی، جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا، بخشش فرما دی، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ

بہرحال! جب حضورِ اقدس ﷺ سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سارا قصہ سنا دیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابوجہل نے پکڑ لیا تھا۔ اور ہم نے وعدہ کر کے بمشکل جان چھڑائی کہ ہم لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے، اور پھر درخواست کی کہ یا رسول اللہ! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں، اور جہاں تک اس وعدے کا تعلق ہے، وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، اور اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لئے ہم نے وعدہ

کرلیا، لیکن آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصہ لے لیں، اور فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہوجائے۔

تم وعدہ کرکے زبان دے کر آئے ہو

لیکن سرکارِ دوعالم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم وعدہ کرکے آئے ہو، اور زبان دے کر آئے ہو، اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جاکر محمد ﷺ کی زیارت کروگے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لوگے، اس لئے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ وہ مواقع ہیں جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے۔ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کرلیتا، مثلاً یہ تاویل کرلیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں۔ یا یہ تاویل کرلیتا کہ یہ حالتِ عذر ہے، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے۔ جبکہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں۔ جن کے پاس صرف ۷۰ اُونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں۔ باقی افراد میں سے کسی نے لاٹھی اُٹھالی ہے، کسی نے ڈنڈے، اور کسی نے پتھر اُٹھالیے ہیں، یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے جارہا ہے، اس لئے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے۔ لیکن محمد ﷺ نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے، اور جو وعدہ کرلیا گیا ہے، اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ (۱)

جہاد کا مقصد حق کی سربلندی

یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کے لئے نہیں ہورہا ہے، کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لئے نہیں ہورہا ہے، بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لئے ہورہا ہے۔ اور حق کو پامال کرکے جہاد کیا جائے، گناہ کا ارتکاب کرکے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔ آج ہم لوگوں کی یہ ساری کوششیں بیکار جارہی ہیں، اور ساری کوششیں بے اثر ہورہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کرکے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کرکے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل و دماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضہ ہے، چلو، شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کردو، اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے۔ چلو، یہ کام کرلو۔

---

(۱) الإصابة (۳۱۶/۱)

یہ ہے وعدہ کا ایفاء

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا۔ نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے، نہ بہادر کہلانا مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کر لیا جائے، اس کو نبھاؤ۔ چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما دونوں کو غزوۂ بدر جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لئے کہ یہ دونوں جنگ میں شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے۔ یہ ہے وعدہ کا ایفاء۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ایفائے عہد

اگر آج اسکی مثال تلاش کریں تو اس دنیا میں ایسی مثالیں کہاں ملیں گی؟ ہاں! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں ایسی مثالیں مل جائیں گی۔ انہوں نے یہ مثالیں قائم کیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط قسم کے پروپیگنڈے کیے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے۔ آمین۔ لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ ان کا ایک قصہ سن لیجئے۔

فتح حاصل کرنے کے لئے جنگی تدبیر

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ شام میں تھے اس لئے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی، ان کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے تھے، اور روم اس وقت کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا، اور ایک تاریخ متعین کر لی کہ اس تاریخ تک ہم ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے۔ ابھی جنگ بندی کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے لیکن اس مدت کے اندر میں اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لے جا کر ڈال دوں، تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو اس وقت میں فوراً حملہ کر دوں، اس لئے کہ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگی، پھر کہیں جا کر لشکر روانہ ہوگا، اور یہاں آنے میں وقت لگے گا، اس لئے معاہدے کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہوگا، اس لئے وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اگر میں اپنا لشکر سرحد پر ڈال دوں گا، اور مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کر دوں گا تو جلدی فتح حاصل ہو جائے گی۔

یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندران کے علاقے میں ڈال دیا، اور حملے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، فوراً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا، چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی، اس لئے کہ وہ لوگ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شہر کے شہر، بستیاں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اب فتح کے نشے کے اندر پورا لشکر آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ پیچھے سے ایک گھوڑ اسوار دوڑتا چلا آرہا ہے، اس کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے انتظار میں رک گئے کہ شاید یہ امیر المؤمنین کا کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہو، جب وہ گھوڑ اسوار قریب آیا تو اس نے آوازیں دینا شروع کر دیں:

"اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، قِفُوْا عِبَادَ اللّٰهِ قِفُوْا عِبَادَ اللّٰهِ"

اللہ کے بندو، ٹھہر جاؤ، اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ۔ جب وہ اور قریب آیا تو حضرت معاویہ نے دیکھا کہ وہ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا:

"وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ، وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ"

مؤمن کا شیوہ وفاداری ہے، غداری نہیں، عہد شکنی نہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے۔ میں نے تو اس وقت حملہ کیا ہے جب جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگرچہ جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی، لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کے دوران ہی سرحد پر ڈال دیں۔ اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر بھی داخل کر دیا تھا۔ اور یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی، اور میں نے اپنے کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

((مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحِلَّنَّهُ وَلَا يَشُدَّنَّهُ اِلٰى اَنْ يَّمْضِيَ اَجَلٌ لَّهُ اَوْ يَنْبِذَ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ))(۱)

یعنی جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو، تو اس وقت تک عہد نہ کھولے، اور نہ باندھے، یہاں تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے۔ یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان کر دے کہ ہم نے وہ عہد

(۱) سنن الترمذي، كتاب السير عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الغدر، رقم: ۱۵۰۶، سنن ابي داؤد، كتاب الجهاد، رقم: ۲۵۷۸، مسند احمد، مسند الشاميين، رقم: ۱۶۴۰

ختم کردیا۔لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر ان کے علاقے کے پاس لے جا کر فوجوں کو ڈال دینا حضورِ اقدس ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لئے جائز نہیں تھا۔

سارا مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا

اب آپ اندازہ لگایئے کہ ایک فاتح لشکر ہے، جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جارہا ہے، اور بہت بڑا علاقہ فتح کر چکا ہے، اور فتح کے نشے میں چُور ہے۔ لیکن جب حضورِ اقدس ﷺ کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے عہد کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے، اسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے، وہ سب واپس کردو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کردیا، اور اپنی سرحد میں دوبارہ واپس آگئے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی کہ اس نے صرف عہد شکنی کی بنا پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کردیا ہو۔ لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ حاصل کرنا پیشِ نظر نہیں تھا، کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی، بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، اس لئے جب اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم ہوگیا کہ وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہو رہا تھا، اس لئے واپس لوٹ گئے۔ یہ ہے وعدہ، کہ جب زبان سے بات نکل گئی، تو اب اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور معاہدہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے، ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، تمہاری جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کے معاوضے میں تم ہمیں جزیہ ادا کروگے۔ ''جزیہ'' ایک ٹیکس ہوتا ہے، جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب معاہدہ ہوگیا تو وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں کے ساتھ معرکہ پیش آگیا، جس کے نتیجے میں وہ فوج جو بیت المقدس میں متعین تھی ان کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ ہیں، اس لئے وہاں سے ان کو محاذ پر بھیج دیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مشورہ اور تجویز تو بہت اچھی ہے، اور فوجیں وہاں سے اُٹھا کر محاذ پر بھیج دو، لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو۔ وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے عیسائی اور یہودی ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرو، اور ان سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، اور یہ معاہدہ کیا تھا کہ آپ کی جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کام کے لئے ہم نے وہاں فوج ڈالی ہوئی تھی، لیکن اب

ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آگئی ہے، اس لئے ہم آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے، لہٰذا اس سال آپ نے ہمیں جو جزیہ بطور ٹیکس کے ادا کیا ہے، وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں، اور اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لے جائیں گے۔ اور اب آپ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں۔ یہ مثالیں ہیں، اور میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی کہ کسی نے اپنے مخالف مذہب والوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا ہو۔

بہرحال! مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ عہد اور وعدے کی پابندی کرے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وعدے کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے، اور ہر طرح کی عہد شکنی اور خلاف ورزی سے محفوظ رکھے۔ اس کی مزید تفصیل اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی دی تو اگلے جمعہ کو عرض کروں گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

عہد اور وعدہ کا وسیع مفہوم ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ جمعہ کو سورۃ المؤمنون کی اس آیت کا بیان کیا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے والے مؤمنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ﴾

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہد کا پاس کرتے ہیں، اس کی رعایت رکھتے ہیں۔

قرآن کریم و حدیث شریف میں عہد اور وعدہ کی پابندی کی کتنی تاکید آئی ہے، اور رسول کریم ﷺ نے اپنی سیرت اور سنت میں اس کی کیسی عظیم مثالیں قائم فرمائی ہیں، اس کے بارے میں کچھ روایات اور واقعات گذشتہ جمعہ کو عرض کیے تھے۔ آج اس عہد کو پورا کرنے کے سلسلے میں ایک ایسی بات کی طرف توجہ دلانی ہے، جس کی طرف سے ہم لوگ بکثرت غفلت میں رہتے ہیں، یعنی بعض عہد ایسے ہیں جو ہم نے باندھے ہیں، لیکن دن رات اس کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ خیال بھی دل میں نہیں آتا کہ ہم عہد کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اور کوئی گناہ ہم سے سرزد ہو رہا ہے۔

ملکی قانون کی پابندی لازم ہے

اس کی مثال یہ ہے کہ جو کوئی شخص جس ملک کا باشندہ ہوتا ہے، اور اس کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ عملاً اس بات کا عہد کرتا ہے کہ میں اس ملک کے قانون کی پابندی کروں گا، اب اگر آپ کسی ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور درخواست دیتے ہوئے یہ کہہ دیں کہ میں آپ کے ملک کی

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۲۷۰ تا ۲۸۲)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی (۱) المؤمنون: ۱ تا ۸

شہریت تو چاہتا ہوں، لیکن آپ کے قانون پر عمل نہیں کروں گا، تو کیا دنیا کا کوئی ملک ایسا ہے جو آپ کو شہریت دینے پر تیار ہو جائے؟ لہٰذا جب کوئی انسان کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ یا تو زبان سے یا عملاً یہ معاہدہ کرتا ہے کہ میں اس ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا۔ جیسے ہم اس ملک کے اندر پیدا ہوئے ہیں، تو شہریت حاصل کرنے کے لئے ہمیں زبانی درخواست دینے کی ضرورت تو پیش نہیں آئی، لیکن عملاً یہ معاہدہ کرلیا کہ ہم اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، لہٰذا شہری ہونے کے ناطے ہم اس ملک کے قانون کی پابندی کرنے کا عہد کر چکے ہیں۔

خلافِ شریعت قانون کی مخالفت کریں

البتہ مسلمان کا جو عہد ہوتا ہے، چاہے وہ کسی شخص سے ہو، یا کسی ادارے سے ہو، یا حکومت سے ہو، وہ ایک بنیادی عہد کا پابند ہوتا ہے، یہ بنیادی عہد وہ ہے جو ایک مسلمان نے کلمہ شہادت "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھتے ہوئے کیا، اس عہد کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود مانتا ہوں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا، اور جناب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سچا رسول مانتا ہوں، لہٰذا آپ کے ہر حکم کی اطاعت کروں گا۔ یہ سب سے پہلا عہد ہے جو انسان نے مسلمان ہوتے ہی کرلیا ہے، یہ عہد تمام عہدوں پر بالا ہے، اس کے اوپر کوئی اور عہد نہیں ہوسکتا ہے، لہٰذا اگر اس کے بعد آپ کسی سے کوئی عہد کرتے ہیں مثلاً کسی حکومت سے یا کسی ادارے سے یا کسی شخص سے کوئی عہد کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تک آپ کا قانون مجھے اللہ کے کسی قانون کے خلاف کام کرنے پر مجبور نہ کرے اس وقت تک میں آپ کی اطاعت کروں گا۔ اگر کوئی قانون ایسا ہے جو مجھے اللہ کی نافرمانی پر مجبور کرتا ہے، تو اس قانون کی اطاعت واجب نہیں۔ بلکہ اس قانون کی مخالفت واجب ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قانون

اس کی مثال میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ملک میں رہتے تھے، اور نبی بننے سے پہلے ایک قبطی کو مُکا مار کر قتل کر دیا تھا، جس کا واقعہ مشہور ہے، اور قرآن کریم نے بھی اس واقعہ کو ذکر کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قتل پر استغفار کیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے:

﴿لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ﴾ (۱)

(۱) الشعراء: ۱۴

یعنی میرے اوپر ان کا ایک گناہ ہے اور میں نے ان کا ایک جرم کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو جرم اور گناہ قرار دیتے تھے اور اس پر استغفار فرمایا کرتے تھے، اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ قتل جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، بلکہ ایک مظلوم کی مدد فرمائی تھی اور یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایک مُکّا مارنے سے وہ مر جائے گا، اس لئے یہ حقیقۃً گناہ نہیں تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصمت کے منافی بھی نہیں تھا، لیکن چونکہ صورت گناہ کی سی تھی، اس لئے آپ نے اسے گناہ سے تعبیر فرمایا، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قبطی جس کو موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا تھا وہ تو کافر تھا، اور کافر بھی حربی تھا، لہٰذا اگر اسے جان بوجھ کر بھی قتل کرتے تو اس حربی کافر کو قتل کرنے میں کیا گناہ ہوا؟ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اس لئے گناہ ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے شہر میں رہ رہے ہیں تو عملاً اس بات کا وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، اور ان کا قانون یہ تھا کہ کسی کو قتل کرنا جائز نہیں، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو قتل کیا، وہ اس قانون کی خلاف ورزی میں کیا، لہٰذا ہر حکومت کا ہر شہری، چاہے حکومت مسلمان ہو یا غیر مسلم حکومت ہو، عملاً اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس ملک کے قوانین کی پابندی کرے گا، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے۔

ویزا لینا ایک معاہدہ ہے

لیکن جو قانون مجھے اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر مجبور نہیں کر رہا ہے، بلکہ کوئی ایسا حکم مجھ پر عائد کر رہا ہے جس سے کوئی معصیت اور کوئی گناہ لازم نہیں آتا تو اس قانون کی پابندی بحیثیت اس ملک کے شہری ہونے کے مجھ پر واجب ہے۔ اس میں مسلمان ملک ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ اگر آپ کسی غیر مسلم ملک کا ویزا لے کر وہاں جاتے ہیں تو ویزا لینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس ملک سے درخواست کی ہے کہ میں آپ کے ملک میں آنا چاہتا ہوں، اور آپ کے ملک کے قانون کی پابندی کروں گا جب تک وہ قانون مجھے کسی گناہ پر مجبور نہیں کرے گا۔ یہ ایک عہد ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس ملک میں انسان رہتا ہے، اس ملک کے قانون کی پابندی بھی اس پر اس کے عہد کی پابندی کی وجہ سے لازم ہوگی۔

اس وقت قانون توڑنے کا جواز تھا

آج ہمارے معاشرے میں یہ فضا عام ہوگئی ہے کہ قانون شکنی کو ہنر سمجھا جاتا ہے، قانون کو علانیہ توڑا جاتا ہے، اور اس کو بڑی ہوشیاری اور چالاکی سمجھا جاتا ہے، یہ ذہنیت درحقیقت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ جب ہم ہندوستان میں رہتے تھے، اور وہاں انگریز کی حکومت تھی، انگریز غاصب تھا، اس

نے ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا، اور مسلمانوں نے اس کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی، ۱۸۵۷ء کے موقع پر اور بعد میں بھی اس کے ساتھ لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، اور انگریز کی حکومت کو مسلمانوں نے کبھی دل و جان سے تسلیم نہیں کیا، لہٰذا ہندوستان میں انگریز کی حکومت کے خلاف علماء کرام نے یہ فتویٰ بھی دیا کہ قانون توڑو، کیونکہ انگریز کی حکومت جائز حکومت نہیں ہے، اگرچہ بعض علماء اس فتویٰ کی مخالفت کرتے تھے، بہر حال، اس وقت قانون توڑنے کا ایک جواز تھا۔

اب قانون توڑنا جائز نہیں

لیکن انگریز کے چلے جانے کے بعد جب پاکستان بنا، تو یہ ایک معاہدے کے تحت وجود میں آیا، اس کا ایک دستور اور قانون ہے، اور پاکستان کے قانون پر بھی یہی حکم عائد ہوتا ہے کہ جب تک وہ قانون ہمیں کسی گناہ پر مجبور نہ کرے اس وقت تک اس کی پابندی واجب ہے، اس لئے کہ ہم نے عہد کیا ہے کہ ہم اس ملک کے شہری ہیں، اس لئے ہم اس کے قانون کی پابندی کریں گے۔

ٹریفک کے قانون کی پابندی

اب آپ ٹریفک کے قوانین لے لیجئے۔ قانوناً بعض مقامات پر گاڑی کھڑی کرنا جائز ہے، اور بعض مقامات پر ناجائز ہے۔ جہاں گاڑی کھڑی کرنا قانوناً منع ہے وہاں گاڑی کھڑی کرنے میں قانون کی بھی خلاف ورزی ہے، اور عہد کی بھی خلاف ورزی ہے، اس لئے کہ آپ نے یہ عہد کیا ہے کہ میں اس قانون کی پابندی کروں گا۔ بعض مقامات پر گاڑی کی رفتار متعین کر دی جاتی ہے کہ اس رفتار پر گاڑی چلا سکتے ہیں، اس سے زیادہ رفتار پر گاڑی چلانے میں قانون کی خلاف ورزی تو ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عہد کی خلاف ورزی ہونے کی وجہ سے شرعاً بھی گناہ ہے۔ یا مثلاً سگنل بند تھا، مگر آپ سگنل توڑ کر نکل گئے۔ آپ اس کو بڑی دلاوری اور بہادری سمجھ رہے ہیں کہ ہم سگنل توڑ کر نکل گئے۔ لیکن یہ بھی درحقیقت گناہ ہے۔ گناہ اس لئے ہے کہ آپ ایسے قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جو ہمیں کسی گناہ پر مجبور نہیں کر رہا ہے، بلکہ فلاحِ عامہ سے متعلق ایک قانون ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنا معاہدے کی خلاف ورزی ہے، اور اس آیت کی خلاف ورزی ہے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے تلاوت کی۔

ویزے کی مدت سے زیادہ قیام کرنا

اسی طرح جب آپ دوسرے کسی ملک میں ویزا لے کر جاتے ہیں تو گویا کہ آپ نے معاہدہ کیا ہے کہ ویزے کی جو مدت ہے اس مدت تک میں وہاں ٹھہروں گا، اس کے بعد واپس آجاؤں گا۔

اب اگر آپ مدت گزرنے کے بعد مزید وہاں قیام کر رہے ہیں تو معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اور جتنے دن آپ وہاں قیام کر رہے ہیں وعدہ کی خلاف ورزی کا گناہ آپ پر لازم آ رہا ہے۔

آج ہماری پاکستانی قوم ساری دنیا میں بدنام ہے، لوگ پاکستانی کا نام سن کر بدکتے ہیں، پاکستانی پاسپورٹ دیکھ کر شک میں پڑ جاتے ہیں کہ معلوم نہیں یہ کیا دھوکہ دے رہا ہوگا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں سے گئے، اور وہاں جا کر ان کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ ہمارے ویزے کی مدت ختم ہو چکی ہے، پھر ذلیل وخوار ہو کر نکالے جاتے ہیں، بعض اوقات جیلوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں، تکلیفیں بھی اُٹھاتے ہیں۔ اس طرح دنیا کا بھی خسارہ اور آخرت کا بھی خسارہ، دنیا کے اندر یہ ذلت حاصل ہو رہی ہے، اور آخرت میں عہد شکنی کا گناہ ہو رہا ہے۔

ظالم حکومت کے قوانین کی پابندی بھی لازم ہے

بعض لوگ آج کل یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ آج کل ہمارے ملک میں جو حکومتیں ہیں، وہ خود ظالم حکومتیں ہیں، رشوت خور ہیں، بدعنوان ہیں، مفاد پرست ہیں، اپنے مفاد کی خاطر پیسے لوٹ رہے ہیں، لہٰذا ایسی حکومت کے قوانین کی پابندی ہم کیوں کریں؟

خوب سمجھ لیجئے! جیسا کہ پچھلے جمعہ میں عرض کیا تھا کہ حضور اقدس ﷺ نے تو ابوجہل سے کیے ہوئے معاہدے کا بھی احترام کیا۔ کیا ابوجہل سے زیادہ گمراہ کوئی ہوگا؟ کیا ابوجہل سے بڑا کافر کوئی ہوگا؟ لیکن وہ وعدہ جو حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور ان کے والد نے ابوجہل سے کیا تھا، اور ابوجہل نے زبردستی ان سے وعدہ لیا تھا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم چونکہ ابوجہل سے وعدہ کر چکے ہو، لہٰذا اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ معلوم ہوا کہ جس شخص سے آپ عہد کر رہے ہیں وہ چاہے کافر ہی کیوں نہ ہو، چاہے وہ فاسق ہو، بدعنوان ہو، رشوت خور ہو، لیکن جب آپ نے اس سے عہد کیا ہے تو اب اس عہد کی پابندی آپ کے ذمے لازم ہوگی۔ ان کے ظلم اور ان کے فسق وفجور کا گناہ ان کے سر ہے، ان کی بدعنوانیوں کا بدلہ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں دیں گے، وہ جانیں ان کا اللہ جانے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم نے جو معاہدہ کیا ہے، ہم اس کی پابندی کریں۔

خیانت کرنے والے سے خیانت مت کرو

حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ))(۱)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی النھی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

دو لفظوں کا جملہ ہے، لیکن رسول کریم ﷺ نے کیسا عظیم اور سنہرا اصول ان دو لفظوں میں بیان فرمادیا، فرمایا کہ جو تم سے خیانت کرے، تم اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ مت کرو، وہ اگر خیانت کر رہا ہے، وہ اگر دھوکہ باز ہے، وہ اگر بدعنوان ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بھی بدعنوانی شروع کر دو، تم بھی اس کے ساتھ خیانت کرو، تم بھی اس کے ساتھ عہد شکنی کرو، تم بھی گناہ کا ارتکاب کرو۔ بلکہ ان کا عمل ان کے ساتھ ہے، تمہارا عمل تمہارے ساتھ ہے، لہٰذا حکومت چاہے کتنی ہی بری کیوں نہ ہو، لیکن اگر آپ نے اس کے ساتھ کوئی معاہدہ کرلیا ہے تو اس معاہدے کی پابندی تمہارے اوپر لازم ہے۔

صلح حدیبیہ

آپ نے سنا ہوگا کہ "صلح حدیبیہ" کے موقع پر رسول کریم ﷺ نے مشرکین مکہ سے ایک صلح نامہ لکھا تھا، اس صلح نامہ کی ایک شرط یہ تھی کہ اگر مکہ مکرمہ سے کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ منورہ جائے گا تو مسلمانوں پر اس شخص کو واپس کرنا واجب ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ آجائے گا تو مکہ والوں پر یہ واجب نہیں ہوگا کہ اس کو واپس کریں۔ یہ ایک امتیازی قسم کی شرط تھی جو مشرکین مکہ نے رکھی تھی، لیکن حضور اکرم ﷺ نے اس وقت مصلحت کے لحاظ سے اس شرط کو بھی قبول کرلیا تھا، اس لئے کہ آپ جانتے تھے کہ انشاء اللہ تعالیٰ مدینہ منورہ سے تو کوئی شخص مرتد ہو کر مکہ مکرمہ نہیں جائے گا، اس وجہ سے آپ نے یہ شرط قبول کرلی تھی، لیکن یہ شرط کہ اگر کوئی شخص ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے گا تو اس کو واپس مکہ مکرمہ بھیجا جائے گا، یہ شرط بھی مصلحتاً آپ نے قبول فرمائی تھی۔

حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کی التجاء

ابھی صلح نامہ لکھا جارہا تھا، اور ابھی بات چیت ہو رہی تھی کہ اس دوران حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ جو ایک صحابی تھے، اور مکہ مکرمہ میں مسلمان ہو گئے تھے، اور ان کا باپ کافر تھا، اس نے ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں، اور روزانہ ان کو مارتا تھا، یہ بیچارے روزانہ اسلام کی خاطر اپنے باپ کے ظلم و ستم کا سامنا کرتے تھے، جب ان کو پتہ چلا کہ حضور اقدس ﷺ حدیبیہ کے مقام پر آئے ہوئے ہیں، اور وہاں ان کا لشکر ٹھہرا ہوا ہے تو وہ کسی طرح ان بیڑیوں کے ساتھ مکہ مکرمہ سے حدیبیہ پہنچ گئے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ وہ کس طرح وہاں پہنچے ہوں گے جبکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) للمسلم أن يدنع الى الذمى الخمر، رقم: ١١٨٥، سنن أبى داؤد، كتاب البيوع، باب فى الرجل يأخذ حقه من تحت يده، رقم: ٣٠٦٧، مسند أحمد، رقم: ١٤٨٧٧، سنن الدارمى، كتاب البيوع، باب فى أداء الأمانة واجتناب الخيانة، رقم: ٢٤٨٤

''حدیبیہ'' کا مقام مکہ مکرمہ سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ کس مشقت اور تکلیف کے ساتھ پاؤں میں بیڑیاں ہونے کے باوجود وہاں پہنچے ہوں گے۔ اور آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری زندگی اجیرن ہو چکی ہے، باپ نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی ہوئی ہیں، وہ صبح شام مجھے مارتا ہے، خدا کے لئے مجھے اس ظلم سے بچایئے، میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔

ابو جندل کو واپس کرنا ہوگا

وہ شخص جس کے ساتھ معاہدہ ہو رہا تھا، وہ اس وقت وہاں موجود تھا، اس شخص سے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص بہت ستم رسیدہ ہے، کم از کم اس کی اجازت دے دو کہ میں اس شخص کو اپنے پاس رکھ لوں۔ اس شخص نے کہا کہ اگر آپ اس کو اپنے پاس رکھیں گے تو آپ سب سے پہلے غداری کے مرتکب ہوں گے، کیونکہ آپ نے عہد کر لیا ہے کہ جو شخص بھی مکہ مکرمہ سے آپ کے پاس آئے گا آپ اس کو واپس کریں گے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص مظلوم ہے، اس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، اور ابھی معاہدہ مکمل بھی نہیں ہوا ہے، اس پر ابھی دستخط ہونا باقی ہے۔ اس لئے اس شخص کو تم چھوڑ دو۔ اس شخص نے کہا کہ میں کسی قیمت پر اس شخص کو نہیں چھوڑوں گا، اس کو واپس بھیجنا ہوگا۔ اب اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جوش و خروش کا ایک عجیب عالم تھا کہ ایک شخص مسلمان ہے، کافروں کے ہاتھوں ظلم و ستم کی چکی میں پس رہا ہے، وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پناہ چاہتا ہے۔ لیکن اس کو پناہ نہیں ملتی۔

میں معاہدہ کر چکا ہوں

چونکہ معاہدہ ہو چکا تھا، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابو جندل! میں نے تمہیں اپنے پاس رکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن میں معاہدہ کر چکا ہوں، اور اس معاہدے کی وجہ سے مجبور ہوں، اور میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ تمہیں واپس بھیجوں۔ انہوں نے فرمایا: یا رسول اللہ! آپ مجھے درندوں کے پاس واپس بھیجیں گے؟ جو صبح شام میرے ساتھ درندگی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں مجبور ہوں، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کوئی راستہ نکالیں گے۔ میں چونکہ عہد کر چکا ہوں، اس عہد کی پابندی کرنی ضروری ہے۔

عہد کی پابندی کی مثال

آپ اندازہ لگایئے، اس سے زیادہ عہد کی پابندی کی کوئی مثال شاید دنیا نہ پیش کر سکے کہ

ایسے ستم رسیدہ شخص کو واپس کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی رہائی کے لئے اور اسباب پیدا کر دیئے، جس کا لمبا واقعہ ہے۔[1] بہر حال، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رسول کریم ﷺ نے کافروں کے ساتھ بھی عہد کی کس قدر پابندی فرمائی۔ لہٰذا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ جس کے ساتھ ہم نے عہد کیا ہے، وہ کافر ہے، یا فاسق ہے، یا بدعنوان ہے، یا رشوت خور ہے، جب عہد کر لیا تو اب اس کی پابندی ضروری ہے۔ ہاں، یہ ضروری ہے کہ ایسے رشوت خور کرپٹ حکام کو ہٹا کر ان کی جگہ دوسرے عادل حکمران لانے کی کوشش اپنی جگہ لازم اور ضروری ہے، لیکن جہاں تک عہد کا تعلق ہے، اگر ان حکام کے ساتھ کوئی عہد کیا ہے تو اس عہد کی پابندی ضروری ہے۔

جیسے اعمال ویسے حکمران

یاد رکھئے! ہم ہر وقت یہ جو حکومت کا رونا روتے رہتے ہیں، اس بارے میں حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد سن لیں۔ کاش کہ ہماری سمجھ میں آجائے، اور ہمارے دل میں اُتر جائے۔ آپ نے فرمایا:

"أَعْمَالُكُمْ عُمَّالُكُمْ"(۲)

یعنی تمہارے حکمران تمہارے اعمال کا عکس ہیں۔ اگر تمہارے اعمال درست ہوں گے تو تمہارے حکمران بھی درست ہوں گے، اگر تمہارے اعمال خراب ہوں گے تو تمہارے حکام بھی خراب ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے۔ لہٰذا اگر ہم اپنے معاملات، اپنی عبادات، اپنی معاشرت، اپنے اخلاق کو دین کے مطابق کر لیں تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کرپٹ اور بدعنوان اور خطا کار حکمران جو ہم پر مسلط ہو رہے ہیں، انشاء اللہ ثم انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی جگہ عادل حکمران عطا فرمائیں گے۔ لیکن پہلے ہم اپنے حصے کا کام کریں اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگیں، اللہ تعالیٰ ضرور فضل فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے عہد کی پابندی کی جتنی اقسام ہیں، ان سب پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ان آیاتِ کریمہ میں ہماری فلاح کے جو طریقے بتائے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ہماری زندگیوں کے اندر پیوست فرما دے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب، رقم: ۲۵۲۹، مسند أحمد، رقم: ۱۸۱۵۲

(۲) المقاصد الحسنة للسخاوی (۱/۵۲۰) پوری حدیث یوں ہے: أَعْمَالُكُمْ عُمَّالُكُمْ كَمَا تَكُونُونَ يُوَلّٰى عَلَيْكُمْ" ایک شاعر کہتا ہے۔

بذنوبنا دامت بلیتنا والله یکشفها اذا تبنا

مصیبت پر صبر کریں☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾(۱)

ہمارے اُردو محاورے میں صبر کا مفہوم بہت ہی محدود ہے کہ انسان پر کوئی مصیبت آ جائے تو رونے دھونے کی بجائے خاموشی سے وقت گزار لے اسی کو صبر کہتے ہیں جبکہ شریعت کی اصطلاح میں صبر کا مفہوم بہت عام اور وسیع ہے۔ اسی بات کو واضح کرنے کے لئے صبر کی اقسام اور درجات مقرر کر لیے گئے ہیں، صبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱)صبر علی الطاعة (۲) صبر عن المعصية (۳) صبر علی المصيبة

۱۔ صبر علی الطاعة

صبر علی الطاعۃ کا یہ مطلب ہے کہ احکام خداوندی کی فرمانبرداری اور پیروی میں اپنے نفس کو مجبور کر کے نیکی پر آمادہ کرے چاہے وہ کام نفس پر کتنا ہی گراں گزرے مگر نفس کو مجبور کرتے ہوئے اس کام میں لگ جائے۔

۲۔ صبر عن المعصية

گناہ اور معصیت کرنے کو دل چاہ رہا ہے مگر اس گناہ اور برائی سے اپنے نفس کو روکے رکھنا صبر عن المعصیت ہے۔

۳۔ صبر علی المصيبة

یہ ہے کہ کوئی بھی مصیبت یا پریشانی پیش آئے تو اس پر کوئی شکوہ شکایت نہ کرے بلکہ اللہ کے

☆ اصلاحی مواعظ (۱/۹۰ تا ۱۱۱)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) البقرة: ۱۵۳

فیصلے پر راضی رہے۔ پہلی دونوں قسموں کو مختصراً ان الفاظ میں سمجھا جاسکتا ہے کہ اپنے نفس کو اللہ کے احکامات میں باندھنا اور اپنی خواہشات کو اللہ کے احکام کے آگے پامال کرنا۔ چاہے یہ کام کسی گناہ سے بچنے کے لئے ہو یا کسی نیکی کے لئے ہو، آدمی اس بات کا ارادہ کرے خواہ میرے ارمانوں کا خون ہوجائے یا میری خواہشات پامال ہوجائیں لیکن اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو صبر عن المصیبۃ اور صبر علی الطاعۃ عطا فرمائے۔

صبر کی تیسری قسم یعنی صبر علی المصیبۃ کا بیان بقدرِ ضرورت مقصود ہے، اللہ اس پر ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

صبر پر اجر

اگر انسان کو کوئی مشکل پریشانی یا تکلیف پیش آجائے اور اس پر صبر کیا جائے تو اس پر بھی اللہ کی طرف سے بے حد وحساب اجر کے وعدے کیے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندۂ مؤمن بیمار ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے طرزِ عمل کا معائنہ کرنے کے لئے دو فرشتوں کو مقرر فرماتے ہیں آیا وہ بندہ اس بیماری اور مصیبت کی حالت میں اللہ سے اچھی اُمید رکھتا ہے یا اس کے خلاف طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جب کوئی صبر سے کام لیتا ہے تو فرشتے جاکر عرض کرتے ہیں کہ پروردگارِ عالم! وہ آپ سے ثواب کا طلبگار ہے اور آپ سے اچھی اُمیدیں رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میں تمہیں گواہ بناکر کہتا ہوں کہ اس بیماری کے بعد میں اس کو ایسا خون دوں گا جو اس کے پہلے خون سے بہتر ہوگا اور ایسا گوشت عطا کروں گا جو پہلے گوشت سے بہتر ہوگا اور اس کے تمام گناہ معاف کردوں گا اور اگر اسی بیماری میں اس کی موت کا فیصلہ کروں گا تو ایسی موت دوں گا کہ وہ سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔

بے صبری ذریعۂ جہنم ہے

اگر بیمار آدمی اللہ کی تقدیر پر شکایت کرتا ہے، جزع فزع کا معاملہ کرتا ہے یا اُلٹی سیدھی باتیں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر میں اس کی بیماری دور کروں گا تو اس حالت میں کہ پہلے سے موجود خون اور گوشت سے بدتر گوشت اور خون عطا کروں گا اور بے صبری کی سزا بھی دوں گا اور اسی بے صبری کی حالت میں اگر موت کا فیصلہ کرلیا تو اسے جہنم میں داخل کروں گا۔ اس حدیث مبارک میں صبر علی المصیبۃ کی اہمیت بیان فرمائی اور اس صبر کو چھوڑنے پر جو وعیدیں ہیں وہ کھول کھول کر بیان فرمائیں۔ دراصل صبر کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ صبر کے بارے میں لوگوں کے ذہن

میں عجیب وغریب باتیں پائی جاتی ہیں۔کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صبر اس چیز کا نام ہے کہ کسی بھی تکلیف کا بالکل اظہار ہی نہ کیا جائے۔نہ روئے اور نہ آنسو بہائے۔اور اگر کبھی بے اختیار رونا آ گیا تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بے صبری ہوئی، جبکہ اللہ تعالیٰ بندے پر کسی بھی ایسے کام کو فرض نہیں کرتے جو اس کے اختیار سے باہر ہو، اس لئے اگر کسی موقع پر رونا آ جائے یا آنسو بہہ نکلیں تو اس پر بے صبری کا اطلاق نہیں ہوگا، اس لئے کہ بے صبری اللہ کی تقدیر پر شکوہ اور شکایت کرنے کا نام ہے۔

رونے کا نام بے صبری نہیں ہے

مثلاً اگر کوئی شخص یوں کہے کہ میں ہی رہ گیا تھا اس مصیبت کے لئے میرے علاوہ اللہ کو کوئی نظر نہیں آتا۔گویا یہ اعتراض ہے کہ میرے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہوا؟ کسی اور کے ساتھ کیوں نہ ہوا؟ یہ بے صبری کا جملہ ہے، یا مثلاً کسی کا انتقال ہو جائے تو یوں کہے کہ بڑی بے وقت موت آئی ہے (معاذ اللہ) اللہ کو اپنے بندے کی روح قبض کرنے کا صحیح وقت معلوم نہیں ہے، یہ انتہائی خطرناک جملہ ہے جو اکثر لوگوں کی زبان پر آ جاتا ہے کہ فلاں کو بے وقت موت آ گئی۔یاد رکھیں کہ دنیا کا کوئی کام بھی بے وقت نہیں ہوتا۔اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ کس کام میں کس وقت میں کیا حکمت اور بہتری ہے۔وہ اس کے مطابق فیصلے فرماتے ہیں۔ایک اصولی بات اور سمجھ لیں کہ تکلیف کے اظہار میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ تکلیف کے اظہار میں اعتراض نہ ہو۔اگر یوں کہے کہ اللہ میاں یہ کام میرے ساتھ ہی کرنا تھا دوسرے سب بڑے مزے کی زندگی گزار رہے ہیں۔یہ ایسا اظہار ہے جس میں اعتراض بھی شامل ہے اور اس سے بچنا ضروری ہے۔

صبر کرنے کا طریقہ

اگر اسی بات کو اس پیرائے میں ادا کرے کہ اے اللہ حکم اور مشیت تو آپ ہی کی چلتی ہے، آپ وہی کریں گے جو میرے حق میں بہتر ہوگا لیکن میں بہت کمزور بندہ ہوں، اس مصیبت کی وجہ سے مجھے بہت صدمہ پہنچا ہے اس لئے رونا آ رہا ہے، یہ رونا آپ کے فیصلے پر نہیں اپنی بے بسی اور کمزوری پر ہے تو یہی جملہ صبر ہوگا اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف اظہار ہے اعتراض نہیں ہے، چاہے دل میں ایک آگ سلگ رہی ہو مگر زبان پر یہی ہونا چاہئے کہ اے اللہ آپ حکیم وعلیم ہیں، فیصلہ آپ کا ہی چلے گا، میں تو نہیں جانتا اس میں یقیناً میری ہی کوئی بہتری ہوگی۔یہ عمل حضور اکرم ﷺ نے خود کر کے دکھایا کہ صبر اس چیز کا نام ہے۔

حضور ﷺ کا عمل

رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے جناب ابراہیم رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہوا تو آپ ﷺ نے بیٹے کو گود میں اُٹھا کر فرمایا:

((إِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ))(۱)

''اے ابراہیم تمہاری جدائی پر ہم بہت غمزدہ ہیں''

اظہارِ غم اپنی جگہ مگر دل میں مضبوطی سے یہ بات رچی بسی ہے کہ اے اللہ! آپ نے جو فیصلہ فرمایا اسی میں خیر اور بہتری ہے، ہم اپنی بہتری آپ سے زیادہ نہیں جانتے۔ حضور اکرم ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ایک نومولود صاحبزادے تھے، ان پر نزع کا عالم طاری ہوگیا تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے حضور سرورِ دوعالم ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ بچہ بہت بیمار ہے، اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ سرورِ دوعالم ﷺ تشریف لے گئے۔ دیکھا تو بچے پر نزع کی کیفیت طاری تھی اور روح پرواز کر رہی تھی، اور پھر یہ صرف بچہ ہی نہیں تھا نواسہ بھی تھا۔ اس سارے منظر کو دیکھ کر رحمتِ عالم ﷺ کی پاکیزہ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ وہاں موجود ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ بھی روتے ہیں۔ سرورِ دوعالم ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو وہ رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرمائی ہے، اسی لئے جب کسی کا کوئی پیارا اس سے جدا ہو اور وہ اس کی جدائی پر غم کرے یا روئے تو یہ رونا بے صبری میں داخل نہیں بلکہ یہ تو رحمت ہے، اور اظہارِ غم بے صبری نہیں بلکہ بے صبری یہ ہے کہ گریبان چاک کر کے ماتم کرے، نوحہ خوانی کرے یا تقدیرِ خداوندی پر شکوہ کرے تو یہ چیز گناہ بن جائے گی۔(۲)

بے اختیار رونا گناہ نہیں

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال ہوتا ہے کہ مرنے والے کے عزیز جو روتے ہیں اس سے گناہ ہوتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیں کہ غیر اختیاری طور پر رونا کوئی گناہ نہیں، البتہ رونے کے لئے

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب في قول النبي إنا بك لمحزونون، رقم: ۱۲۲۰، صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب رحمة الصبيان والعيال وتواضعه وفضل ذلك، رقم: ۴۲۷۹، سنن ابن ماجه، كتاب ما جاء في الجنائز، باب ما جاء في البكاء على الميت، رقم: ۱۵۷۸

(۲) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب البكاء على الميت، رقم: ۱۵۳۰، مسند أحمد، رقم: ۲۰۷۹۰

اہتمام سے مصنوعی طریقے اختیار کرنا، ماتم ہو رہا ہے، سینہ کوبی ہو رہی ہے، سروں میں خاک ڈال کر گریبان چاک کیے جارہے ہیں اور اہتمام کے ساتھ ایسے الفاظ اختیار کیے جارہے ہیں کہ جسے رونا نہیں بھی آرہا وہ بھی رو دے تو یہ تمام کام حرام اور گناہ بن جاتے ہیں لیکن اگر کسی شخص کو غیر اختیاری طور پر رونا آگیا تو اس سے گناہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو چیز بھی انسان کی قدرت و اختیار سے باہر ہے اس پر گرفت نہیں ہوتی۔ قرآن خود کہتا ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (۱)

گویا انسان کو اللہ تعالیٰ نے کسی بھی ایسی چیز کا مکلف نہیں بنایا جو اس کی طاقت سے باہر ہو اور اگر رونے کے ساتھ یہ کہہ دیا جائے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہ ہم تو اللہ کی ملکیت ہیں، اس نے جو فیصلہ کیا وہ بالکل برحق ہے، جس میں کسی شکوے شکایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہی الفاظ عبادت بن جائیں گے۔

صابرین کے لئے خوشخبری

ہمارے حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جتنا رنج اور صدمہ زیادہ ہوگا اتنا ہی صبر کا ثواب بھی بڑھتا جائے گا۔ اس لئے کہ تکلیف کے بڑھنے سے اجر بڑھتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ قرآن کریم میں آتا ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ﴾ (۲)

اے بندو! ہم تمہیں کبھی خوف سے آزمائیں گے، کبھی بھوک سے آزمائیں گے، کبھی مال اور جانوں میں کمی کے ذریعے سے آزمائیں گے اور کبھی پیداوار میں کمی سے آزمائیں گے اور اس آزمائش کے بعد

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْآ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (۳)

خوشخبری سنا دیں انہیں جو ان آزمائش کے موقع پر صبر کرتے ہیں۔ کہ جب بھی کوئی مصیبت پہنچی تو انہوں نے کہا کہ ہم تو اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

﴿أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ (٤)

ایسے لوگوں پر اللہ کی طرف سے رحمتیں ہی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے۔

---

(۱) البقرة: ۲۸٦ (۲) البقرة: ۱۵۵ (۳) البقرة: ۱۵٦ (٤) البقرة: ۱۵۷

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نکتہ

میرے مرشد حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیتِ مبارکہ سے ایک عجیب نکتہ سمجھایا کہ اللہ نے یوں ذکر کیا: قَالُوٓا اِنَّا لِلّٰهِ الخ کہ جب مصیبت آپہنچے تو اِنَّا لِلّٰهِ کہہ دو، یہ نہیں فرمایا کہ رومت یا مصیبت پر اظہارِ غم نہ کرو۔ بس اپنی تمام تکلیفوں کو برداشت کر کے چپکے سے کہہ دیا کرو کہ اِنَّا لِلّٰهِ (الآیۃ) تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں ہی رحمتیں نازل ہوں گی۔ اللہ نے صبر کو اور اس کے اجر کو کس قدر آسان فرمادیا کہ ہر ایک مصیبت زدہ اس سے فائدہ اُٹھا سکے بلکہ بعض اوقات بندے کا رونا اور آنسو بہانا بھی اللہ کو پسند آتا ہے کہ کبھی بندہ اظہارِ تکلیف بھی کرے۔ اس لئے کہ بالکل اظہارِ غم نہ کرنا کوئی کمال کا درجہ نہیں ہے، اس لئے کہ یہ سنت طریقہ نہیں ہے بلکہ سنت طریقہ یہی ہے کہ اظہارِ غم بھی ہو اور رضا بالقضا بھی ہو۔

کس کا مقام اُونچا ہے

ایک بزرگ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہیں بیٹے کی موت کی خبر ملی تو جواب میں رونے دھونے کے بجائے فرمایا ''الحمدللہ'' اللہ تیرا شکر ہے۔ کوئی اظہارِ صدمہ اور غم نہیں۔ یعنی اللہ کی نعمتوں کا اس قدر استحضار ہے کہ مصیبت کو بھی نعمت سمجھ کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے کہ نواسہ گود میں ہے، نزع کی کیفیت طاری ہے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں ان بزرگ کا مقام زیادہ نظر آتا ہے جو بیٹے کی موت پر بھی شکر ادا کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بلند کام وہی ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور یہ صاحب جو بیٹے کی موت پر ''الحمدللہ'' کہتے ہیں، وہ کوئی فرشتے ہوں تو معلوم نہیں البتہ کسی انسان میں یہ درجہ کمال کی بات نہیں۔ البتہ اللہ والوں کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ ان بزرگوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا غلبۂ حال تھا اس لئے انہیں تکلیف میں بھی نعمت نظر آئی اس لئے کہہ دیا کہ الحمدللہ اور غلبۂ حال کا مقام پیروی کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔

غلبۂ حال کی مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مثال یوں دی کہ ایک شخص کی ٹانگ کا آپریشن ہونا ہے۔ ڈاکٹر نے بیہوش کر کے ٹانگ کاٹ دی، اسے معلوم ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے، نہ تکلیف، نہ صدمہ، نہ رنج اور نہ غم، اس لئے کہ تکلیف کا احساس ہی ختم ہو چکا ہے۔ اور ایک وہ آدمی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے بیہوش

مت کرو، میرے سامنے میری ٹانگ کاٹو۔ چنانچہ ٹانگ بھی کٹوا رہا ہے اور ساتھ ساتھ سسکیاں اور آہیں بھی بھر رہا ہے۔ بتائیں کس کا مقام زیادہ اونچا ہے؟ ایک تو وہ ہے جسے معلوم ہی نہیں کہ تکلیف کسے کہتے ہیں، اور دوسرا وہ ہے جسے تکلیف ہورہی ہے اور صبر کررہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی کی بہادری قابلِ داد ہے، جو جیتے جاگتے آنکھوں کے سامنے ٹانگ کٹوا رہا ہے۔ لہٰذا جنہوں نے موت کی خبر سن کر الحمدللہ کہا وہ ایسے ہی ہیں جیسے بیہوشی کی حالت میں ٹانگ کٹوالی۔ اور وہ جو اپنے بیٹے اور نواسے کی موت پر آنسو بہا رہے ہیں وہ ایسے ہی ہیں جیسے بیہوشی کے بغیر ٹانگ کٹوائی ہے اور تکلیف کے باوجود اللہ کے فیصلے پر راضی ہیں۔ اور یہی بندگی کا اعلیٰ ترین مقام ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تکلیف دینا چاہ رہے ہیں تو اس تکلیف کا تھوڑا سا اظہار بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری کا اظہار کرنا یہ کوئی اعلیٰ مقام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے تو اپنی شکستگی اور عاجزی کا اظہار کرنا ہی کمالِ بندگی ہے۔

اللہ کے سامنے بہادری مت دکھاؤ

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ بیمار تھے، دوسرے بزرگ ان کی عیادت کو گئے تو بیمار بزرگ الحمدللہ، الحمدللہ کا ورد کرتے رہے لیکن بیماری کے ازالے کی دعا نہیں کررہے۔ دوسرے بزرگ جو عیادت کے لئے گئے تھے انہوں نے کہا کہ جب تک یہ عمل کرتے رہو گے شفا نہیں ہوگی۔ اگر شفا چاہتے ہو تو اللہ سے مانگو۔ یا اللہ یہ تکلیف ہورہی ہے اسے دور فرمادے۔ میرے بڑے بھائی محمد زکی کیفی مرحوم بڑے اچھے شاعر تھے، ان کا ایک شعر یاد آیا جس میں اسی بات کو سمجھایا گیا ہے۔

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا

یہ کمال نہیں کہ اللہ تو غم دئے جائیں میں اظہار نہیں کروں گا۔ لیکن بندگی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جب غم ہو تو اظہارِ غم بھی کرے۔ لیکن اظہارِ غم کی حالت میں بھی اگر اللہ کی مشیت کو سامنے رکھے تو پھر اللہ کی طرف سے انعامات و ہدایت کی بارش ہوتی ہے۔ اللہ کی مصیبتوں کے سامنے بہادری کا اظہار نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ بندگی کے منافی ہے۔

ایک سبق آموز قصہ

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا قصہ سنایا کہ غلبۂ حال میں یوں کہہ بیٹھے "اے اللہ! مجھے آپ کی یاد کے علاوہ کسی چیز میں مزہ نہیں آتا آپ جیسے چاہیں مجھے آزما کر دیکھ لیں" (معاذ اللہ) اور تو کچھ نہیں ہوا صرف پیشاب بند ہوگیا، جان پر بن آئی مگر تکلیف کم نہیں ہوتی تھی، کئی

دن اسی کیفیت میں رہے، اللہ کی طرف سے تنبیہ ہوئی کہ بڑی غلطی ہوئی، بندہ تو ایک ایک چیز میں اللہ کی نعمتوں کا محتاج ہے۔ پھر یہ بزرگ بہت توبہ استغفار کرتے تھے، بچوں کو پڑھاتے تھے، بچوں کو بلا کر کہتے کہ اپنے ''جھوٹے'' چچا کے لئے دعا کرو۔ لہٰذا اللہ کے سامنے کبھی بھی بہادری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جب بھی آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو کام لائے جاتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ آسان راستہ اختیار فرماتے تھے۔(۱)

حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون صاحبِ عزیمت ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ مشکل راستہ اختیار کرنے میں اپنی بہادری اور مردانگی کا ایک قسم کا دعویٰ ہے کہ میں اس مشکل کو سر کرسکتا ہوں، اللہ کی بارگاہ میں دعویٰ نہیں بلکہ عاجزی اور بندگی پسند ہے۔ صاف اور سادہ اقرار کرلے کہ یا اللہ میں تو کمزور ہوں، اس لئے آسان راستہ اختیار کرتا ہوں۔ آپ کی مدد اور توفیق کا طلب گار ہوں۔ کیونکہ انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں، ایک تو یہ کہ تکلیف پر صبر کرے۔ اور دوسرا یہ کہ تقدیر کا شکوہ کرے اور اللہ سے ناراضگی کا اظہار کرے۔ عقلمند خود سوچ سکتا ہے کہ کیا شکوہ شکایت کرنے سے مصیبت ٹل سکتی ہے؟ جو نقصان ہو چکا وہ پورا ہوسکتا ہے؟ جو ہونا تھا سو ہو چکا، اب اس شکوے کے ذریعے اجر کے راستے کو بند کرکے دوہرا نقصان کررہا ہے، دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی۔

روئیں بھی اور بے صبری نہ ہو!

بعض ذہنوں میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ ہم مصیبت پر روئیں بھی اور اللہ کی مرضی پر راضی بھی رہیں اور دونوں کام بیک وقت کیسے ہوسکتے ہیں؟ اس کی مثال ایسے سمجھیں کہ دانت میں تکلیف ہے، ڈاکٹر کے پاس جاکر اسے ''فیس'' بھی ادا کرتے ہیں، اس کے کام سے روتے چلاتے بھی ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے کام پر راضی بھی ہیں کہ آپ کی بڑی مہربانی آپ نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائی۔ گویا ہم پیسے دے کر ڈاکٹر سے کہتے ہیں کہ ہمیں تکلیف پہنچاؤ اس لئے کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ یہ تکلیف درحقیقت فائدے کا سبب ہے۔ اور اگر تکلیف نہ دی گئی تو صحت کے فائدے سے محروم رہیں گے۔ لہٰذا صحت کے فائدے سے لطف اندوز ہونے کے لئے پیسے خرچ کرکے اور خوشامد کرکے اپنے بدن کو چیر پھاڑ کے لئے خود پیش کرتے ہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی، رقم: ۳۲۹۶، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب مباعدته للآثام واختیاره من المباح أسهله وانتقامه، رقم: ۴۲۹۴، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی التجاوز فی الأمر، رقم: ۴۱۵۳، مسند أحمد ، رقم: ۲۳۴۱۰

رحمتِ الٰہی کی مختلف شکلیں

دراصل دنیا میں جتنی بھی پریشانیاں اور مصیبتیں آتی ہیں یہ اللہ کی طرف سے آپریشن ہے، بظاہر نقصان نظر آتا ہے لیکن درحقیقت اسی میں ہمارا فائدہ ہے۔ اس کائنات کا کوئی ذرّہ اللہ کی مشیت کے بغیر حرکت نہیں کرتا اور کوئی بھی حرکت حکمت کے بغیر نہیں ہوتی۔ اگر اللہ تعالیٰ دیکھنے والی آنکھ عطا فرمادے تو معلوم ہوگا کہ یہ مصائب بھی درحقیقت اللہ کی رحمت ہی ہیں۔ کہیں رحمتِ الٰہی ہنسا کر آتی ہے اور کہیں رلا کر آتی ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ کی رحمت راحت کی شکل میں آتی ہے، اور کبھی تکلیف کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ اس تکلیف میں اللہ نے ہمارے لئے کتنا اجر مخفی رکھا ہے؟ دنیا میں یہ چند روزہ تکالیف تو سب کو نظر آتی ہیں مگر ان پر صبر کرنے کے عوض جو سرمدی خوشیاں، دائمی مسرتیں اور ہمیشہ ہمیشہ کا سکون چھپا ہوا ہے وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ حضور اکرم ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ جب اللہ کی طرف سے آخرت میں مصائب پر صبر کرنے والوں کو ان کا بدلہ اور اجر دیا جائے گا، تو اس وقت لوگ تمنا کریں گے کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچی سے کاٹی جاتیں اور ہم اس پر صبر کرتے اور اجر کے مستحق بنتے۔(۱) کوئی چھوٹی بڑی تکلیف ایسی نہیں جس پر اللہ کی طرف سے اجر مقرر نہ ہو، یہاں تک کہ بندۂ مؤمن کو کانٹا چبھنے پر بھی اجر ملتا ہے۔(۲) دراصل ہر تکلیف نعمت ہے، چونکہ ہم کمزور اور جلد باز ہیں اس لئے ہم تکلیف کا پہلو دیکھتے ہیں اور نعمت کو بھلا بیٹھتے ہیں۔

بیماری بھی نعمت ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہی مضمون بیان فرمارہے تھے کہ کوئی مصیبت ایسی نہیں جو حقیقت میں نعمت نہ ہو۔ اسی دوران دیکھا کہ مجلس میں ایک کوڑھی شخص آیا جس کے ہاتھ پاؤں جذام کی وجہ سے گل سڑ کر جھڑ رہے تھے۔ ایسی تکلیف دہ حالت میں آیا اور کہنے لگا: حضرت میرے لئے دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مصیبت اور تکلیف سے نجات عطا فرمائے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء فی ذهاب الصبر، رقم: ۲۳۲٦

(۲) صحیح البخاری، کتاب المرضی، باب ما جاء فی كفارة المرض، رقم: ٥٢٠٩، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب ثواب المؤمن فيما يصيبه من مرض أو حزن، رقم: ٤٦٦٤، سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول الله، باب ما جاء فی ثواب المريض، رقم: ۸۸۸، مسند أحمد، رقم: ۳۲۹۸٥

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم سب اس سوچ میں پڑ گئے اور اپنے کانوں کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف متوجہ کرلیا کہ کیا جواب ارشاد ہوتا ہے؟ اس لئے کہ ابھی تو حضرت یہ فرمارہے تھے کہ ہر مصیبت نعمت ہے اور بیماری بھی ایک مصیبت ہے۔ اب اگر یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ اس کی بیماری کو دور کردے تو گویا یہ زوالِ نعمت کی دعا کررہے ہیں۔ ان ہی سوالوں اور تجسس کے ساتھ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جواب کے منتظر تھے۔ حضرت نے عجیب الفاظ میں دعا فرمائی اور سب سے کہا کہ ہاتھ اُٹھا کر اس کوڑھی کے لئے دعا کرو کہ "یا اللہ! یہ تکلیف اور بیماری حقیقت میں تو نعمت ہے لیکن ہم بہت کمزور اور لاغر ہیں، اس نعمت کو برداشت نہیں کرسکتے، لہٰذا اے اللہ! اس بیماری کی نعمت کو صحت کی نعمت سے تبدیل فرمادیں"

اب ذہن میں ایک اور شبہ ہوتا ہے کہ مصیبت اتنی بڑی نعمت ہے تو اس سے محرومی کیوں؟ لہٰذا سب مل کر اللہ سے مصیبت کو مانگیں۔ اسی شبہ کا ازالہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ مصیبت کو طلب نہ کرو اس لئے مصیبت کا مانگنا اظہارِ جرات کرنا ہے جو اللہ کو بہت ناپسند ہے۔ اور اگر کوئی مصیبت آجائے تو شکوہ شکایت نہ ہو بلکہ یہ کہو کہ اے اللہ میں کمزور ہوں، یہ مصیبت میری طاقت سے باہر ہے اس لئے اسے دور فرمادیں۔ لیکن جب تک یہ مصیبت رہے تو یہ سمجھتے رہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔

تین قسم کے حالات

اگر یوں کہا جائے کہ دنیا میں کوئی دکھ، پریشانی، رنج اور خوف نہیں ہوسکتا تو یہ ناممکن ہے، اس لئے کہ عالم کل تین ہیں۔

۱۔ جنت ــــ جو عالمِ راحت ہے وہاں کوئی رنج وغم نہیں ہوگا۔

۲۔ جہنم ــــ جو عالمِ مصیبت ہے جہاں کوئی راحت نہیں ہوگی۔

۳۔ دنیا ــــ جہاں راحت بھی ہے اور رنج بھی، صدمہ بھی ہے اور مسرت بھی، آنسو بھی ہیں اور خوشیاں بھی۔ لہٰذا اب اگر کوئی چاہے کہ مجھے صرف خوشیاں ہی خوشیاں ملیں تو اس دنیا میں یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ کسی انسان کی قدرت میں نہیں ہے کہ وہ صرف خوشیوں کو سمیٹ لے اور مصائب کو جھاڑ پھینکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر مصائب اور صدمے نہ آئیں تو انسان بندہ نہ رہے بلکہ فرعون اور ہامان بن کر زندگی گزارے۔ خدا کا بندہ بننے کی بجائے بندوں کا خدا بن بیٹھے۔ صدمے اور مصیبت کا نقد فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہوجاتا ہے۔ جب بھی مصیبت آتی ہے چاہے وقتی طور پر ہو انسان فوراً اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی کہ ایک لمحہ کے لئے ہی سہی، مگر اللہ سے تعلق قائم کرنے کا موقع تو ہاتھ آگیا، اور بندے نے اپنے اللہ کی عظمت کو دل میں بسالیا۔

چنانچہ جتنی مرتبہ بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ ''اے اللہ مصیبت بہت بڑی ہے نا قابلِ برداشت ہے، آپ قوتِ برداشت دیں'' تو ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوگا۔ کیا تعلق مع اللہ کوئی معمولی چیز ہے؟ اگر چہ ہم اسے بڑی چیز نہ سمجھیں۔ لیکن درحقیقت تعلق مع اللہ ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ قیمتی شی ہے۔ یہ نعمت جو صدیوں کے مجاہدوں سے حاصل نہیں ہوتی وہ ان تکالیف اور مصائب کی وجہ سے پل بھر میں حاصل ہو جاتی ہے۔

نفس ایک کاغذ کی مانند ہے

بزرگوں نے ایک بات بڑے کام کی بتائی کہ دنیا میں اللہ کے حکموں کے مطابق زندگی گزارنا مجاہدے کے بغیر ناممکن ہے۔ قطبِ عالم، فقیہ الامت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی رضا کے حصول کے لئے بعض اوقات بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک مثال سے سمجھایا کہ ایک کاغذ کو موڑ دیں پھر اسے سیدھا کرنا چاہیں تو وہ بالکل سیدھا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں ایک سلوٹ پڑ چکی ہے اور اسے سیدھا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے اُلٹی طرف موڑ دیا جائے کیونکہ اُلٹی طرف موڑنے سے کاغذ سیدھا ہو جائے گا۔ بالکل یہی حال مجاہدے کا ہے کہ نفسِ انسانی گناہوں کا خوگر اور عادی بن چکا ہے، اسے سیدھے رخ پر لانا چاہیں تو وہ نہیں آتا۔ لہٰذا اسے سیدھا کرنے کے لئے اُلٹے رخ پر موڑنا پڑے گا، اب اس سے کچھ جائز کام بھی چھڑوانے پڑیں گے۔ جب اس سے کھانا پینا اور جائز خواہشات کی تکمیل چھڑائی جائے گی تو انشاء اللہ اُلٹا مڑنے سے خود بخود سیدھا ہو جائے گا۔ لہٰذا نفس کے سرکش گھوڑے کو قابو کرنے کے لئے مجاہدہ بہت ضروری ہے، لیکن بعض اوقات اپنی فطرتی کمزوری کی وجہ سے آدمی مجاہدہ نہیں کرنا چاہتا اور اگر کرنا بھی چاہے تو نہیں کر پاتا، جیسے ہم لوگ آج کل مجاہدے اور ریاضتیں نہیں کر سکتے۔ لیکن یاد رکھیں! یہ مصائب غیر اختیاری مجاہدے ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنے نفس کو گناہوں کی طرف موڑ رکھا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس غیر اختیاری مجاہدے کے ذریعے اپنی طرف موڑ دیا تاکہ گناہوں سے بچنا آسان ہو جائے۔ بعض اوقات اس غیر اختیاری مجاہدے کے ذریعے باطنی طور پر اتنی زیادہ ترقی ہوتی ہے جو اختیاری مجاہدے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

مصائب پر صبر کریں

یہ مصائب دراصل ہماری روح کے فاسد مادے ہوتے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ روحانی آپریشن کے ذریعے صاف کرتے ہیں، انسان خواہ لاکھ چیخے چلائے لیکن اللہ تعالیٰ روحانی ترقی کے لئے اپنی

ذات کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اسی لئے فرمایا گیا کہ بخار آئے تو سمجھو کہ گناہ معاف ہو رہے ہیں۔ حضور ﷺ کی یہ تعلیم ہے کہ جب کسی بیمار کے پاس خصوصاً کسی بخار والے کے پاس جاؤ تو کہو

((لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ إِنْشَاءَ اللّٰهُ))(۱)

''کوئی حرج نہیں انشاء اللہ یہ بیماری تمہارے لئے پاکی کا ذریعہ ہوگی''

یعنی یہ بخار گناہوں اور گندگیوں سے پاکیزگی کا ذریعہ ہے، اسے مصیبت یا پریشانی سمجھ کر اپنے اوپر طاری نہ کرلینا۔ دنیا میں جتنے بھی خلافِ طبیعت امور پیش آئیں تو سمجھیں کہ یہ سب غیر اختیاری مجاہدات ہیں۔ لیکن زندگی میں کبھی بھی مصائب کو طلب نہ کریں، آجائیں تو اضافہ نہ چاہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ان کا ازالہ طلب کریں۔ اور اس بات کا یقین بھی ہو کہ ان مصائب میں میری دنیا و آخرت کا نفع پوشیدہ ہے۔ اسی کا نام صبر ہے اور اسی پر اللہ تعالیٰ انعامات کی بارش فرماتے ہیں۔ اس بات کا تجربہ کرکے دیکھ لیں کہ مصائب میں صبر کرنے سے اس مصیبت کے دور ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ سے تعلق میں کتنا اضافہ ہوتا ہے؟ اور یہی چیز اس بات کی علامت بھی ہے کہ آیا یہ مصیبت اللہ کی طرف سے رحمت ہے یا اس کی طرف سے عذاب ہے، اس لئے کہ بعض اوقات مصائب رحمت ہوتے ہیں، جبکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے عذاب اور زحمت کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ جس مصیبت میں اللہ کی طرف رجوع کی توفیق میسر ہوجائے اور اللہ کی قدرت اور مشیت پر راضی بھی ہو تو سمجھ لیں کہ یہ مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے اور اگر کسی مصیبت میں اللہ سے شکوہ ہو یا اللہ کی طرف رجوع میں کمی واقع ہوجائے تو اس چیز کی علامت ہے کہ یہ تکلیف وبال اور مصیبت ہے۔

صبر ایوب علیہ السلام

انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگیوں میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کا نمونہ عمل رکھا ہے، حضرت ایوب علیہ السلام پر کیسی خطرناک بیماری مسلط کردی گئی کہ تمام چاہنے والے اعزاء و اقارب نے ساتھ چھوڑ دیا، ایسے وقت میں شیطان آکر بہکاتا ہے کہ ''ایوب یہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر عذاب ہے''، جواباً حضرت ایوب علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ نہیں یہ بیماری عذاب نہیں بلکہ نعمت ہے اس لئے کہ اس حالت میں بھی مجھے اللہ سے شکوہ کرنے کی نہیں بلکہ اسے پکارنے کی توفیق مل رہی ہے۔

﴿إِنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ﴾(۲)

(۱) صحیح البخاری، کتاب المرضیٰ، باب ما یقال للمریض وما یجیب، رقم: ۵۲۳۰

(۲) الأنبیاء: ۸۳

اے اللہ! اس بیماری نے مجھے پریشان کر دیا ہے، آپ رحم کرنے والے ہیں مجھ پر رحم فرمائیے۔

مصائب میں دعا نہ چھوڑیں

اسی لئے بزرگوں نے تجویز فرمایا کہ بیماری یا تکلیف میں اپنے معمولات کو بالکل ترک کرنے کے بجائے کچھ کم کر لینا چاہئے، تعداد میں کمی کر دے یا کیفیت میں کمی کر دے، لیکن مکمل طور پر ترک نہ کرے اس لئے کہ اگر مکمل طور پر ترک کر دیا تو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ مصیبت باعثِ وبال نہ بن جائے۔ بعض اوقات لوگ کہہ دیتے ہیں کہ دعا کرتے کرتے تھک گئے لیکن معاملہ تو جوں کا توں ہے کوئی فرق نہیں پڑا۔ یاد رکھیں کہ دعا کرتے کرتے کبھی تھکنا نہیں چاہئے اس لئے کہ دعا کبھی رائیگاں اور بیکار نہیں جاتی۔ کبھی تو وہی مل جاتا ہے جو طلب کیا تھا اور کبھی اس سے بہتر مل جاتا ہے اور کبھی دنیا میں کچھ نہیں ملتا بلکہ آخرت میں مل جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ دعا سے تھک کر بیٹھ گئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ تکلیف عذاب میں داخل تھی یہ خدا کی رحمت نہ تھی۔ اس بات سے بالکل بے پرواہ ہو کر کہ کیا مل رہا ہے، اور کتنا مل رہا ہے، بس دعا مانگتے ہی رہیں۔ مانگنے میں بالکل شرم اور جھجک محسوس نہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اے اللہ! آپ آقا ہیں اور میں بندہ ہوں، آپ دیں گے تب بھی مانگوں گا، نہیں دیں گے تب بھی مانگوں گا۔ اے میرے مالک! اس در کے سوا کوئی در نہیں ہے، جاؤں تو کہاں جاؤں؟ تیرے سوا کوئی آستانہ دکھائی نہیں دیتا، اپنی پیشانی کو ٹیکوں تو کہاں ٹیکوں؟ اپنے سر کو جھکاؤں تو کہاں جھکاؤں؟ جو بھی اس بات کی عادت بنالیتا ہے کہ مانگتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا خواہ ملے یا نہ ملے بس مانگتا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ مقام عطا فرما دیتے ہیں جو اس کے وہم و گمان سے بھی باہر ہوتا ہے۔

صبر کا خلاصہ

لہٰذا صبر کا خلاصہ یہ نکلا کہ اظہارِ تکلیف یعنی رونا وغیرہ صبر کے منافی نہیں البتہ اللہ کے فیصلے پر شکوہ اور شکایت کرنا بے صبری ہے۔ اظہارِ تکلیف بھی ہو اور ازالۂ تکلیف یعنی اللہ کے سامنے اپنی عاجزی کا اقرار ہو، کوئی جرأت اور بہادری کا مظاہرہ نہ ہو، اے اللہ میں کمزور ہوں، اس بات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے کہ دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں انسان کو تکلیف کے ازالے کے لئے دعا مانگتے رہنا چاہئے۔ جس سے انشاء اللہ یہ تکلیف باعثِ اجر بنے گی اور اُخروی راحت کا ذریعہ بن سکے گی۔ اور یہ مصائب جس نوعیت کے بھی ہوں، چھوٹے ہوں یا بڑے، بیماری ہو یا آزاری ہو، تنگ دستی ہو یا بے روزگاری، خواہ کوئی بھی تکلیف ہو ہر تکلیف کے بارے میں یہی اصول ہے، جس پر عمل کرنے سے

انسان مستحق اجر و ثواب بنتا ہے، اور صوفیائے کرام نے اپنی پوری زندگی کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے یہ بات بتائی کہ باطنی ترقی کے لئے صبر کی عبادت جس قدر مفید ہوتی ہے کوئی دوسری عبادت اس قدر اثر انداز نہیں ہو سکتی، جیسے ایک شاعر نے کہا۔

وادی عشق بسے دور و دراز است ولے

طے شود جادہ صد سالہ با آہے گاہے

عشق کی وادی یوں تو بہت دور دراز ہے لیکن کبھی یہ فاصلہ صرف ایک آہ میں طے ہو جاتا ہے۔

صابر نام نہ رکھیں

لیکن مصائب اور صبر وغیرہ کو کبھی طلب نہ کریں یہاں تک کہ میرے والد ماجد حضرت مفتی اعظمؒ کبھی بھی یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ کسی بچے کا نام صابر یا بچی کا نام صابرہ رکھا جائے۔اس لئے نہیں کہ یہ نام رکھنا ناجائز ہے بلکہ وہ فرماتے تھے کہ ان ناموں میں ایک قسم کا دعویٰ ہے کہ مجھ پر مصائب آئیں اور میں ان پر صبر کرنے کو تیار ہوں اور بندے کا کام مصائب کو دعوت دینا نہیں بلکہ ان سے پناہ مانگنا ہے۔

نام کے اثرات

اس نام رکھنے کے اور اسے بدلنے کے اثرات ہم نے خود دیکھے ہیں۔ ہماری ایک عزیز صابرہ نامی تھیں، بہت پریشانی اور تنگ دستی اور فقر و فاقے میں زندگی گزار رہی تھیں۔ایک مرتبہ حضرت والد صاحبؒ کے پاس آئیں۔حضرت نے دعا بھی فرمائی اور کہا کہ تم اپنا نام بدل لو اور صابرہ کی جگہ شاکرہ رکھ لو۔اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چند دنوں میں ہی ان خاتون کی تمام تکالیف اور پریشانیاں دور ہو گئیں۔اس لئے مصائب خود طلب نہ کریں، آجائیں تو اللہ کی مشیت سمجھتے ہوئے راضی رہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں صبر کی تینوں اقسام صبر علی الطاعۃ، صبر عن المعصیۃ اور صبر علی المصیبۃ پر اپنے اپنے مواقع پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس اجر کا مستحق بنائے جو صابرین کو عطا فرماتے ہیں۔آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

صدقہ وخیرات ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ))(۱)

گذشتہ جمعہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ ایک سفر درپیش ہے جس کی وجہ سے شاید حاضری نہ ہوسکے لیکن بعض وجوہات کی بناء پر سفر ملتوی ہوگیا تو سوچا کہ حسبِ معمول حاضری کی سعادت حاصل کی جائے۔ جو حدیث آپ کے سامنے پڑھی گئی چونکہ اس کا بیان گذشتہ جمعہ کو شروع کیا گیا تھا اس لئے اس کی تکمیل کا بھی خیال آیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى))

جو کہ حدیث کے کئی جملوں میں سے ایک جملہ ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر والے ہاتھ سے مراد دینے والا اور نیچے والے ہاتھ سے مراد لینے والا ہے۔ چونکہ آدمی جب کسی کو کوئی چیز دیتا ہے تو اس کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے اور لینے والے کا ہاتھ نیچے ہوتا ہے، لیکن یہاں مراد محض اوپر اور نیچے والا نہیں بلکہ یہ لینے اور دینے سے کنایہ ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

بعض پیر ایسے بھی ہوتے ہیں

مشہور ہے کہ بعض جاہل قسم کے پیروں نے اپنے مریدوں کو تاکید کی ہوتی ہے کہ جب کوئی ہدیہ

☆ اصلاحی مواعظ (۲/۹۵۔۱۱۸)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غني، رقم: ۱۳۳۸، مسند أحمد، رقم: ۱۵۰۲۶

آئے تو دینے والا ہاتھ نیچے رکھے اور پیر صاحب اوپر سے اُٹھائیں تاکہ مذکورہ بالا حدیث کا مصداق نہ بننا پڑے، حالانکہ حقیقت میں مراد اوپر اور نیچے ہونا نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے، اور اشارہ اس طرف کرنا مقصود ہے کہ انسان کو چاہئے کہ حتی الامکان اپنی حاجت کسی دوسرے کے سامنے پیش نہ کرے اور اس سے سوال نہ کرے بلکہ اس بات کے مواقع پیدا کرے کہ خود دے۔

سوال کرنا کس کے لئے جائز ہے؟

حدیث میں ہے کہ جس شخص کے پاس ایک دن اور ایک رات کی غذا موجود ہو تو اس کے لئے سوال کرنا حرام ہے۔ دیکھیں شریعت میں سوال کے بارے میں اس قدر سخت حکم رکھا گیا ہے نیز حدیث میں ہے کہ "جس شخص کے لئے سوال کرنا حلال نہ ہو اور وہ پھر بھی لوگوں سے سوال کرے تو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر خراشوں اور زخموں کے نشان ہوں گے"(۱)

یعنی وہ سوال جو اس نے لوگوں سے کیا وہ چہرے کی خراشوں اور زخموں کی صورت میں اس کے سامنے آئے گا۔ اور سوال میں صرف یہ داخل نہیں کہ آدمی پیالہ لے کر بھیک مانگے بلکہ کسی بھی شخص سے پیسے، کھانے کی چیز مانگنا خواہ وہ خفیہ طریقے ہی سے ہو سوال میں داخل ہے اور اس کا حکم بھی یہی ہے کہ یہ حرام ہے۔

گداگری سے متعلق ایک اہم مسئلہ

اس کے ساتھ ہی فقہاء کرام نے یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ جس شخص کے لئے سوال کرنا حرام ہو اس کو دینا بھی ناجائز ہے۔ اس لئے کہ جب وہ سوال کر رہا ہے تو حرام کا ارتکاب کر رہا ہے، اور اگر آپ نے اس کو دے دیا تو یہ گناہ میں معاونت اور امداد شمار ہوگی، لہٰذا ایسے شخص کو دینا بھی ناجائز ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں معلوم نہ ہو تو محض بدگمانی سے یا اس کے ظاہر حال سے اندازہ لگانا کہ یہ تو پیشہ ور آدمی ہے، دینے سے نہیں رکنا چاہئے۔

صدقہ کرنے کے بارے میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

مجھے یاد آیا کہ جب ہم نئے نئے دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے تو ایک مرتبہ میں اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا ہوا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے گاڑی سگنل پر رکی۔ ایسی

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزکاۃ عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء من تحلّ له الزکوۃ، رقم: ۵۸۸، سنن أبی داؤد، کتاب الزکاۃ، رقم: ۱۳۸۵

جگہوں پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ بھکاری بہت زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں۔ایسے ہی ایک بھکاری آگیا اور اس نے کچھ مانگا۔حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ نے اسے کچھ نکال کر دے دیا۔ہم نے چونکہ اس وقت تازہ تازہ پڑھ رکھا تھا کہ جس شخص کے لئے سوال کرنا حرام ہو، اس کو دینا بھی ناجائز ہے تو میں نے اپنے اس تازہ مسئلے کی یاد کی وجہ سے حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ سے پوچھا کہ حضرت! یہ تو سب پیشہ ور قسم کے بھکاری ہوتے ہیں اور ان کو تو سوال کرنا ہی حلال نہیں ہوتا اور علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے تو لکھا ہے کہ اس کو دینا بھی جائز نہیں ہوتا لہٰذا یہ مستحق بھی نہیں ہے۔تو حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ نے جو جملہ ارشاد فرمایا وہ انہی کے مقام کی بات ہے۔فرمایا کہ بھئی! یہ کہاں کا استحقاق اور مستحق لیے پھرتے ہو، ذرا یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں ہی مستحق ہونے کی بناء پر دینے کا فیصلہ کرلیں تو ہمارا اور تمہارا کیا حق بنتا ہے؟ یہ جو رزق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل رہا ہے، اور اس کی نعمتیں تم پر نچھاور ہوکر بارش کی طرح برس رہی ہیں، کیا تم اس کے مستحق ہو؟ اگر تم اپنے اعمال اور اپنے خیالاتِ زندگی کو دیکھو تو کوئی استحقاق دُور دُور سے بھی نظر نہیں آتا بلکہ اس بات کے مستحق ہیں کہ رزق کے دروازے بند کردیئے جائیں۔

تو اگر اللہ تعالیٰ مستحق اور غیر مستحق کی بنیاد پر دینے لگے تو پھر ہمارا کیا حال بنے گا؟ اصل بات یہ تھی کہ فقہاء کرام نے یہ مسئلہ اسی شخص کے بارے میں کہا تھا جس کے بارے میں متعین طور پر معلوم ہو کہ اس کے لئے سوال کرنا حلال نہیں ہے اور اس کو دینے سے گناہ میں مزید ابتلاء کا اندیشہ ہو، لیکن اگر کوئی بھکاری آجائے تو اگرچہ قرائن سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ پیشہ ور ہے لیکن چونکہ یقینی طور پر معلوم نہیں اس لئے اس کو جھڑکنے کے بجائے دے دینا بہتر ہے۔اور اسی کو قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَأَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (۱)

کہ سائل کو مت جھڑکیے کیونکہ اس کے استحقاق کی حقیقت کا تو یقینی علم نہیں، ہاں اپنے نہ دینے کے عوامل میں اپنی حاجت و موقع اور حوصلہ دیکھا جاسکتا ہے مگر جھڑکنے سے ہر حال پر پرہیز کیا جائے۔

اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا بہترین صدقہ ہے

شروع میں تلاوت کی گئی حدیث کا دوسرا جملہ ہے:

((وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ))

''جب خرچ کرنے کا موقع آئے تو اس کی ابتداء ان لوگوں سے کرو جو تمہاری زیرِ کفالت ہیں''

(۱) الضحیٰ: ۱۰

مثلاً بیوی، بچے اور اگر والدین معذور ہوں تو ان کو اور دوسرے اعزا و اقرباء کو دینے سے پہل کریں، ان کو دینا بھی ثواب ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ سب سے بہترین صدقہ وہ ہے جو انسان اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے۔(۱)

صدقہ کرنے میں اعتدال کی تعلیم

آنحضرت ﷺ نے حدیث کا تیسرا جملہ ارشاد فرمایا:

((وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى))

یعنی ایسا نہ ہو کہ پہلے تو دے دیا اب دوسروں سے مانگتے پھر رہے ہیں تو اس صدقہ کا کوئی حاصل نہیں۔ صدقہ بہترین وہی ہے کہ اتنا دو کہ اس کے بعد تمہیں احتیاج نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین عطا فرمایا ہے کہ جو ہر چیز میں اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ اب دیکھیں! صدقہ کے بیشمار فضائل ہیں لیکن فرمایا کہ اس حد تک دو کہ اس میں بھی اعتدال کو مدِنظر رکھو کہ خود تمہیں پریشانی نہ پیش آجائے، کیونکہ زکوٰۃ ہم پر فرض ہے وہ مال کا چالیسواں حصہ ہے اور اس کے علاوہ جو ہے وہ مستحب ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ آج تو جوش میں آکر سب دے دیا جائے اور پھر بعد میں حسرت اور افسوس کریں تو ایک نیک کام کرنے کے بعد اس پر حسرت میں مبتلا ہو جاؤ گے جو اتنا برا ہے کہ اس سے نہ کرنا بہتر ہے۔ اسی لئے قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ إِذَآ أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا﴾(۲)

''جو لوگ خرچ کرتے ہیں وہ نہ تو بہت اسراف کرتے ہیں اور نہ بہت بخل سے کام لیتے ہیں اور صحیح اعتدال کا راستہ ان دونوں کے درمیان ہے''

لہٰذا خرچ میں اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ انسان اعتدال سے کام لے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ﴾(۳)

''لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ تو آپ فرما دیجئے کہ جو زائد ہو وہ خرچ کرو''

صدقہ کرنے کے بارے میں ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے بارے میں بعض روایات ایسی آتی ہیں کہ

(۱) صحيح مسلم، كتاب الوصية، باب الوصية بالثلث، رقم: ۳۰۷۹

(۲) الفرقان: ۶۷ (۳) البقرة: ۲۱۹

جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ ایک طرف اس بات کا حکم ہے کہ صدقہ اتنا کرو کہ تمہیں پریشانی نہ ہو اور دوسری طرف خود اپنے گھر تین تین مہینے تک آگ نہیں جلتی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم بعض اوقات متواتر تین مہینے تک ایسے رہتے تھے کہ ہمارے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ پھر کس طرح گزارا ہوتا تھا؟ تو فرمایا:

"اَلْأَسْوَدَانِ اَلتَّمْرُ وَالْمَاءُ"

''دو چیزوں پر گزارا ہوتا تھا کھجور اور پانی''(۱)

ایک روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ مصلے پر نماز پڑھانے کے لئے تشریف لائے تو ابھی اقامت ہی کہی گئی تھی کہ ایک دم کوئی خیال آیا اور آپ ﷺ گھر تشریف لے گئے اور گھر سے پھر واپس تشریف لائے۔ بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آج آپ نے ایسا عمل فرمایا جو پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ مصلے پر کھڑے ہونے کے بعد گھر تشریف لے گئے اور پھر واپس تشریف لائے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب میں مصلے پر کھڑا ہوا تو مجھے خیال آیا کہ میرے گھر میں سات دینار پڑے رہ گئے ہیں، مجھے اللہ کے سامنے حاضر ہوتے ہوئے شرم آئی کہ اس حال میں سورج غروب ہو کہ میرے پاس سات دینار ہوں، لہٰذا پہلے جا کر ان کو صدقہ کیا پھر نماز پڑھانے آیا ہوں۔ گویا روایات کا حاصل یہ نکلا کہ جب آپ کے پاس کوئی آتا تو آپ اسے دے دیتے تھے کہ آپ کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہتا تھا۔(۲)

تو ایک طرف آپ ﷺ کا عمل ہے اور دوسری طرف یہ فرمان ہے کہ صدقہ اتنا کرو جس سے پریشانی نہ ہو۔ تو خوب سمجھ لیجئے کہ آنحضرت ﷺ اپنی تمام ازواجِ مطہرات کا نفقہ اور خرچ ہر سال، شروع سال میں اکٹھا دے دیتے تھے، لہٰذا جو نفقہ واجب تھا وہ ادا ہو جاتا تھا۔ اور ازواجِ مطہرات بھی سخی النفس تھیں، وہ بھی صدقہ کر دیتی تھیں اور آنحضرت ﷺ خود بھی صدقہ کرتے رہتے تھے، لیکن ازواجِ مطہرات اپنا نفقہ وصول کرنے کے بعد اپنی خوشی اور رغبت سے صدقہ کرتی تھیں۔

اور ایسا بھی نہ تھا کہ اگر کچھ بھی نہ ہو تو پھر دوسروں سے مانگنا پڑے، کیونکہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا وہاں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ طریقہ ہم جیسے کمزور لوگوں کے لئے نہیں ہے بلکہ فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی وأصحابه وتخلیهم من الدنیا، رقم: ۵۹۷۸، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقاق، باب، رقم: ۵۲۸۲، مسند أحمد، رقم: ۲۳۲۸٤

(۲) مسند أحمد، رقم: ۲٤۳۱۷

((خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى))

''بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنے پیچھے غناء چھوڑ جائے''

خلاصہ یہ کہ انسان کو اپنے گھر میں بھی کچھ رکھنا چاہئے اور حضور اکرم ﷺ کے اپنے عمل کو سب کے لئے اصل حکم نہ سمجھا جائے۔

صوفیاء کرام کے احوال کا جائزہ

اسی طرح بعض صوفیاء کرام کے متعلق بھی ایسے ہی واقعات سننے میں آتے ہیں، مثلاً حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ جو بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، گنگوہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے گھر اور خانقاہ میں عالمِ استغراق میں بیٹھے رہتے تھے اور گھر میں کچھ کھانے پینے کو نہیں ہوتا تھا اور ہفتہ ہفتہ فاقے گزر جاتے تھے۔ ایک مرتبہ دس دن ایسے ہی گزر گئے، بچے رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کھانے کو کچھ نہیں ہے تو ذرا سا منہ اُٹھا کر تین مرتبہ فرمایا کہ بہت دیگیں چڑھ رہی ہیں اور اس میں سے تمہارے لئے بھی بہت سا کھانا آنے والا ہے۔ اشارہ ان دیگوں کی طرف تھا جو جنت میں تیار ہو رہی ہیں۔ تو ادھر بچے بھوکے ہیں اور خود جنت کی باتوں میں محو ہیں۔ تو یہ بات بظاہر حدیثِ مذکور کے خلاف نظر آتی ہے کہ بچوں کے لئے خصوصاً نابالغ بچوں کے لئے تو ایسا حق ہے کہ وہ معاف کرنے سے بھی نہیں ہوتا یہ تو نفقہ ضروری ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ یہ واقعات ان کے اس وقت کے خاص غلبۂ حال کی کیفیت میں واقع ہوتے ہیں۔ بعض بزرگوں پر استغراق کا ایسا عالم طاری ہوتا ہے کہ دنیا و مافیہا کا ہوش ہی نہیں رہتا تو اس حالت میں وہ جو بھی عمل کریں، اس میں معذور ہوتے ہیں۔ جیسے ایک آدمی بے ہوش ہو اور وہ اسی مدہوشی کے عالم میں کوئی کام ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ کے یہاں قابلِ مواخذہ نہیں ہے بلکہ معاف ہے، حتیٰ کہ اگر اس پر مسلسل چھ نمازوں کا وقت گزر گیا تو اس پر نماز بھی معاف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح صوفیاء کرام بھی ایسے غلبۂ حال کی وجہ سے مکلّف نہیں رہتے۔ لیکن دوسرے کے لئے ان کے اس فعل کی تقلید کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ ان کی معذوری کی کیفیت ہوتی ہے۔

حدیث کا آخری جملہ

((وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ))

''جو شخص پاکدامنی اختیار کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پاکدامنی عطا فرما دیتے ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے یہ چاہے کہ میں کسی کا محتاج نہ بنوں تو اللہ تعالیٰ اس کو بے نیازی عطا فرما دیتے ہیں''

یعنی جو شخص سچے دل سے عفت والی زندگی یا اللہ کے علاوہ دوسروں کی محتاجی سے بچنے والی زندگی کا طلبگار ہو تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمادیتے ہیں اگرچہ مشکلات اور مصائب آئیں۔

ایک عجیب وغریب واقعہ

حافظ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں ایک عجیب وغریب سچا واقعہ نقل کیا ہے کہ روسی ترکستان کی طرف تین بزرگ رہتے تھے اور تینوں کا نام ''محمد'' تھا۔ ایک تو محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ جن کی تفسیر، تفسیر ابن جریر کے نام سے مشہور ہے، اور دوسرے محمد بن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے محدث تھے اور ان کی ''صحیفہ خزیمہ'' حدیث کی مشہور کتاب ہے، اور تیسرے محمد بن نصر انی المروزی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ بہت بڑے محدث تھے اور ''قیام اللیل'' کے نام سے ان کی ایک تصنیف مشہور ہے۔

ابتداء میں اپنے شہر میں رہ کر علم حاصل کیا لیکن سُن رکھا تھا کہ بڑے بڑے علماء، محدثین، فقہاء اور مفسرین عراق بغداد کے اندر رہنے والے ہیں۔ چنانچہ ان سے علم حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ لیکن کہاں ترکستان اور کہاں بغداد اور عراق؟ بالآخر سفر کے ارادے سے جو کچھ بھی زادِ سفر تھا، لے کر بغداد کی طرف چل پڑے۔ اب ہوائی جہاز یا ریل گاڑی کا زمانہ تو تھا نہیں کہ اتنا لمبا سفر آسانی سے طے ہو جاتا۔ خدا جانے کسی گھوڑے یا اُونٹ پر یا پیدل ہی سفر طے کیا ہوگا۔ مہینوں کا سفر طے کرنے کے بعد ایسی حالت میں بغداد پہنچے کہ زادِ سفر ختم ہو چکا تھا۔ ایک دانہ بھی کھانے کے لئے موجود نہ تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ بغداد میں کوئی جاننے والا بھی نہیں کہ اسی کے پاس جا کر ٹھہر جائیں۔ بہرحال شہر کے کنارے ایک مسجد تھی اس میں جا کر ٹھہر گئے اور آپس میں مشورہ کیا کہ زادِ سفر تو ختم ہو گیا ہے اور آگے جانے سے پہلے کھانے پینے کا بندوبست کرنا ہے، اس لئے کہیں مزدوری کرتے ہیں تا کہ کچھ پیسے حاصل ہو جائیں اور کھانے پینے کا سامان حاصل ہو جائے، پھر کسی عالم کے پاس جا کر علم حاصل کریں۔ چنانچہ مزدوری کی تلاش میں نکلے لیکن کہیں مزدوری نہیں ملی اور سارا دن چکر لگا کر واپس آگئے، اسی حال میں تین دن فاقے کے گزر گئے اور کام بھی نہیں ملا۔ بالآخر تینوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب ایسی حالت ہوگئی ہے کہ اب اگر کچھ کھانے کو نہ ملا تو جان جانے کا اندیشہ ہے اور اس حال میں اللہ تعالیٰ نے سوال کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ لہٰذا اب سوائے سوال کرنے کے اور کسی کے پاس جا کر اپنی حالت بیان کرنے کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ جبکہ تینوں بزرگ ایسے تھے کہ ساری عمر کسی نے ایسا کام کیا ہی نہیں تھا، چنانچہ انہوں نے کہا کہ ایک آدمی ہی جا کر یہ کام کرے۔ پھر یہ سوال ہوا کہ کون کرے؟ تو قرعہ ڈالنے کی تجویز پر عمل کیا گیا، اس میں سے محمد بن جریر طبری کا نام نکلا۔ محمد بن جریر طبری نے کہا کہ قرعہ میں نام نکلنے کی وجہ سے جانا تو پڑے گا لیکن جانے سے پہلے دو رکعت نفل پڑھنے کی مہلت دے دو، چنانچہ انہوں نے

اجازت دے دی۔ محمد بن جریر نے وضو کر کے دو رکعت نفل کی نیت باندھ لی اور نماز پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اے اللہ! یہ ہاتھ آج تک آپ کی بارگاہ کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں پھیلے، آج ایسی مجبوری آپڑی ہے کہ اگر آپ اپنے فضل سے کوئی ایسا راستہ نکالیں تو یہ ہاتھ کسی دوسرے کے سامنے نہیں پھیلیں گے، اور آپ تو ہر چیز پر قادر ہیں۔ نجانے ان کی دعا میں کیا تاثیر تھی کہ ابھی دعا مانگ ہی رہے تھے کہ مسجد کے دروازے پر ایک آدمی ایک خوان لیے کھڑا نظر آیا، اور تینوں بزرگوں کا نام لے کر ان کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ یہ بڑے حیران ہوئے کہ پورے بغداد میں ہمیں جاننے والا کوئی نہیں، ہم تو اجنبی اور مسافر ہیں۔ غرض اس نے کہا کہ آپ کے لئے حاکمِ بغداد نے کھانا بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کھانا تو ہم بعد میں لیں گے لیکن یہ بتاؤ کہ بغداد کے حاکم سے ہمارا کیا تعلق؟ بغداد شہر میں تو ہمیں کوئی جانتا ہی نہیں اور نہ ہم کسی کو جانتے ہیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ آج رات جب بغداد کا حاکم سویا تو اسے خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت ہوئی اور آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم کیسے بغداد کے حاکم ہو؟ تمہارے شہر کے اندر ہمارے تین مہمان اس حال میں پڑے ہیں کہ ان پر تین دن سے فاقہ ہے اور ان کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں، پھر خواب میں آنحضرت ﷺ نے ان کا پورا پتہ بتایا کہ بغداد کی فلاں مسجد ہے اور ان میں سے ایک کا نام محمد بن جریر ہے، دوسرے کا نام محمد بن خزیمہ اور تیسرے کا نام محمد بن نصر ہے۔ تو حاکمِ بغداد نے بیدار ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مجھے یہ کھانا دے کر آپ حضرات کی خدمت میں بھیجا ہے۔ تو ابھی دعا سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرما دیا۔[1] اصل بات تو یہ ہے کہ یہاں مانگنے کی دیر ہے اور حقیقت میں ہم لوگ مانگنا بھی نہیں جانتے، مانگنا آجائے تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

کوئی جو ناشناس اداء ہو تو کیا علاج؟
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

اگر یہ سوال ہو جائے

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یوں سمجھو اور ذرا تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں حاضر ہو، میدانِ حشر قائم ہے اور نامۂ اعمال کے دفتر کھلے ہوئے ہیں، سوال و جواب ہو رہا ہے اور پوچھا جا رہا ہے کہ تم نے یہ عمل کیوں کیا؟ فلاں معصیت کیوں کی؟ تو تم نے جواب دے دیا کہ ہمارا ماحول خراب ہو چکا تھا، چاروں طرف گناہ کا راج تھا، حالات بگڑ چکے تھے، بچنا چاہتے تھے مگر بچ نہیں سکتے تھے کیونکہ سنبھلنا ہی

(۱) سير أعلام النبلاء (۱۴/ ۲۷۰)، تذكرة الحفاظ (۲/ ۷۵۳)

مشکل تھا، لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے یہ پوچھ لیا کہ تمہارے لئے گناہوں سے بچنا مشکل تھا تو کیا ہمارے لئے بچانا بھی مشکل تھا؟ ہم سے کیوں نہ بچنے کی توفیق مانگی؟ کہ اے اللہ! موجودہ حالات میرے بس سے باہر ہیں تو ہی مجھے بچنے کی توفیق عطا فرما۔ ہم پورے قرآن میں بار بار اعلان کرتے رہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾(۱)

''بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''

جب ہم ہر چیز پر قادر تھے تو ہم سے اسی قدرت کے واسطے سے کیوں نہ مانگا؟ تو پھر کیا جواب دو گے؟ تو حضرت فرماتے تھے کہ اس لئے اگر آدمی ابھی بچنا چاہے تو عذر اگر چہ وہی رہے لیکن اللہ سے مانگے اور اسی کی طرف رجوع کرے اور جب کسی گناہ کا محرک سامنے آئے تو فوراً اللہ کی طرف رجوع کرے۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں آتا ہے:

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا﴾(۲)

''عورت نے ان کا فکر کیا اور انہوں نے عورت کا فکر کیا''

لیکن جب اس بڑی آزمائش میں گھر گئے تو فوراً اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آگئے، اس نے قبول فرما کر آپ کی مدد کی۔

آیت کریمہ کی فضیلت

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ بڑی بڑی عجیب باتیں فرماتے تھے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ سنایا کہ وہ کس طرح مچھلی کے پیٹ میں گئے کہ ان کو کشتی والوں نے پھینک دیا، مچھلی آئی اور نگل گئی اور تین دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہے اور تاریکیوں میں گھرے ہوئے پکارنے لگے۔

﴿لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾(۳)

اور مسلسل تین دن تک پڑھتے رہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿فَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ﴾(۴)

ہم نے حضرت یونس علیہ السلام کو اس غم سے جس میں وہ مبتلا تھے، نجات دی اور تین دن کے بعد مچھلی کے پیٹ سے نکال لیا۔ اگلا جملہ ارشاد فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دیتے ہیں''

(۱) الطلاق: ۱۲ (۲) یوسف: ۲٤ (۳) الانبیاء: ۸۷ (٤) الانبیاء: ۸۸

تو ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ مچھلی کا قصہ ہر ایک کے ساتھ پیش نہیں آتا لیکن اس کا منشاء یہ ہے کہ مچھلی کے پیٹ کی تاریکیاں تو حضرت یونس علیہ السلام نے دیکھیں لیکن گناہوں، معصیتوں اور فسق و فجور کا سامنا ہر مؤمن مرد وعورت کو پیش آتا ہے۔ گویا حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ کی تاریکی میں پھنسے اور مؤمنین گناہوں کی تاریکیوں میں پھنستے ہیں، تو جو کام حضرت یونس علیہ السلام نے کیا وہی کام ہمیں بھی کرنا ہوگا یعنی "لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" پڑھنا ہوگا، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے فضل فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت ہمارے دلوں میں ڈال دے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

استغفار کی توفیق بھی بہت بڑی چیز ہے

اور اسی طرح حضرت یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ دعا تو مشرق کی طرف جانے کی کر رہا ہے اور سفر مغرب کی طرف کر رہا ہے، کیونکہ وہ دعا نہ ہوگی بلکہ وہ تو مذاق ہو جائے گا۔ اور پھر بھی بتقاضۂ بشریت کوئی کمی رہ جائے اور کسی گناہ میں مبتلاء ہو جائے تو استغفار کی توفیق ہو جانا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ اس توفیق سے وہ گناہ بھی تمہارے حق میں بہترین کیا گیا، اس لئے کہ اس کے نتیجے میں دل میں ملامت پیدا ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، اس لئے یہ دعا کسی بھی حال میں فائدے سے خالی نہیں۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو چاہئے کہ ہر روز سونے سے پہلے اس کو پڑھا کرے اور دعا کیا کرے کہ اے اللہ! حالات ایسے ہیں، معاشرہ بگڑا ہوا ہے اور معصیتوں کا ایک طوفان چھایا ہوا ہے، چاروں طرف گناہوں کی آگ لگی ہوئی ہے جس کی وجہ سے بچنا بہت مشکل ہے، میں توبہ کی ہمت اور توجہ کرتا ہوں لیکن وہ برقرار نہیں رہتی، لہٰذا حوصلہ عطا فرما دیجئے۔ یہ عمل روزانہ کریں گے تو ایک انقلاب آپ کی زندگی میں رونما ہوگا۔ آنکھوں نے اس دعا کے بیشمار کرشمے دیکھے ہیں، اگرچہ یہ نسخہ بہت آسان سا ہے لیکن اس کے فوائد بڑے عظیم الشان ہیں، مگر چونکہ معمولی ہے اس لئے توجہ ہی نہیں کی جاتی اور جب توجہ دلائی جاتی ہے تو سوچتے ہیں کہ کل کریں گے۔ یاد رکھیں! جو کام کل پر ٹالا گیا وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا فوری طور پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

مفہومِ حدیث پر بھی عمل ہو جائے گا۔ غرض بات چل رہی تھی صدقہ کی جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر صدقہ کرنے کی تلقین فرمائی۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

فضیلتِ صدقہ سے متعلق آیات

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۪ وَلَا تَیَمَّمُوا الۡخَبِیۡثَ مِنۡهُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡهِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡهِ﴾(۱)

''اے ایمان والو! (نیک کام میں) خرچ کیا کرو، عمدہ چیز ہو، اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے اور ردّی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو، حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں، ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ (تو اور بات ہے)''

صدقہ کے متعلق قرآن وحدیث میں ایک اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ سب سے گھٹیا اور بے قیمت صدقہ میں دے دیتے ہیں جیسا کہ ہمارے یہاں اُردو میں مثل مشہور ہے کہ ''مری ہوئی بھیڑ اللہ کے نام'' اور اسی طرزِ عمل پر قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں توجہ دلائی ہے۔

﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ﴾

''تم نیکی کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے جب تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو''(۲)

اور ہمارے معاشرے میں یہ عمل پایا جاتا ہے کہ بیکار چیز صدقہ میں دے دی جاتی ہے۔ جس سے صدقہ کی فضیلت جو کہ مقصود ہے، حاصل نہیں ہوتی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے حضرات صحابہ کرام کا حال یہ تھا کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جوق در جوق آنا شروع ہو گئے اور ہر شخص نے اپنی مملوکہ چیزوں میں سے سب سے زیادہ محبوب چیز آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر دی۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی سخاوت

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اپنی تمام مملوکات میں سے زیادہ محبوب وہ باغ ہے جس میں ایک کنواں ہے جس کا پانی بڑا میٹھا تھا اور بڑی وافر مقدار میں تھا۔ آنحضرت ﷺ اکثر وہاں پر تشریف لے جاتے اور پانی نوش فرماتے تھے۔ تو وہ باغ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اور اللہ کا ارشاد ہے:

﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ﴾(۳)

---

(۱) البقرة: ۲۶۷ (۲) آل عمران: ۹۲ (۳) آل عمران: ۹۲

اس لئے میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((بَخٍ ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ))

''واہ واہ! یہ تو بڑے نفع کا مال ہے''

اور پھر مشورہ دیا کہ اپنے قریبی اعزا کو صدقہ کرو چنانچہ انہوں نے اسے اپنی قریبی اعزا جن میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ بھی تھے، پر صدقہ کر دیا۔(۱)

دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جذبہ

ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اپنے سارے مال میں سب سے زیادہ پسندیدہ اپنا وہ گھوڑا ہے جسے میں نے بڑے پیسے خرچ کر کے شوق سے حاصل کیا تھا، میں اسے صدقہ کرنا چاہا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مذکور پر عمل ہو جائے۔(۲)

ایک اور صحابی رضی اللہ عنہ نے آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنی تمام مملوکات میں غور کیا تو مجھے اپنی کنیز سب سے زیادہ محبوب نظر آئی، میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔(۳)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو اس حد تک عمل فرماتے تھے کہ سب سے زیادہ محبوب چیز صدقہ فرما دیتے تھے حالانکہ حکم صرف محبوب چیز کو خرچ کرنا تھا لیکن صحابہ کرام اس میں زیادہ ثواب سمجھتے تھے۔

زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں

اس لئے ہمیں چاہئے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں۔ کہ زکوٰۃ فرض ہے ہی لیکن اس کے ادا کرنے سے چھٹی نہیں ہو جاتی۔ جس طرح نماز میں فرائض پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا بلکہ سنتیں بھی پڑھنی پڑتی ہیں اس کے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی، اس طرح زکوٰۃ ادا کر کے یہ سمجھنا کہ اب آپ کو کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں رہی یہ بڑی غلط فہمی کی بات ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا مما تحبون، رقم: ٤١٨٩، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فضل النفقة والصدقة علی الأقربین، رقم: ١٦٦٤، مسند أحمد، رقم: ١١٩٨٥

(۲) تفسیر الطبری، رقم: ٧٣٩٧ (٥٩٢/٦)، فتح القدیر للشوکانی (٥٤٣/١)، تفسیر القرطبی (١٣٢/٤) یہ واقعہ صحابی رسول ﷺ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔

(۳) تفسیر ابن کثیر (٧٤/٢)، یہ واقعہ صحابی رسول ﷺ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔

((إِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ))
''انسان کے مال میں زکوۃ کے علاوہ اور بھی حق ہیں (یعنی صدقات وغیرہ)''(۱)

چنانچہ ہمارے بزرگوں کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ نکال کر الگ کر لیتے تھے تاکہ صدقہ کر سکیں۔

صدقہ کرنے میں بزرگوں کا معمول

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا ہے کہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ اپنے مال کا خمس یعنی پانچواں حصہ جو کہ بیس فیصد بنتا ہے نکال کر ایک الگ تھیلے میں رکھ لیتے تھے تاکہ ان کو مصارفِ خیر میں خرچ کر سکیں۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس اللہ سرہ کے بارے میں میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ وہ اپنی املاک کا دسواں حصہ اسی کام کے لئے نکالا کرتے تھے۔ اور میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کا معمول بھی یہی تھا۔ بلکہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کر رکھا تھا کہ جو آمدنی محنت سے حاصل ہو اس کا بیسواں حصہ اور بلا محنت کے اس کا دسواں حصہ نکالا کرتے تھے۔ اور ایک تھیلا بنا رکھا تھا جس پر ''صدقات وخیرات'' لکھا ہوا تھا، جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خرچ کرنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے اور وقت پر انسان کو سوچنا نہیں پڑتا۔ میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ کو دیکھا کہ ان کے پاس دس روپے آئے تو فوراً اس میں سے ایک روپیہ الگ کرنا چاہا لیکن پیسے ٹوٹے ہوئے نہ تھے تو کسی کو بھیج کر ٹوٹے ہوئے پیسے منگوائے اور اس میں سے ایک روپیہ اس تھیلے میں ڈال دیا۔ اس اہتمام کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس تھیلے میں ایسی برکت رکھی تھی کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ سے اس تھیلے کے ذریعے ایسے ایسے کام لیے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ یہاں بیٹھے بیٹھے اپنے ہندوستان کے اعزاء کے کام کروا رہے ہیں اور اسی کی برکت سے کبھی وہ تھیلا میں نے خالی نہیں دیکھا۔ یہ کام بظاہر دشوار دکھائی دیتا ہے لیکن اس سے بہت سے لوگوں کے حقوق ادا ہو جاتے ہیں اور یہ کام ہر انسان کر سکتا ہے خواہ کتنا ہی غریب ہو۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس ایک روپیہ آیا اور اس نے ایک آنہ نکال لیا، ہوتے ہوتے وہ ایک روپیہ بن گیا اور وہ اس نے صدقہ کر دیا تو وہ صدقہ اور ایک امیر آدمی کا ایک لاکھ میں سے ایک ہزار کا صدقہ دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ دونوں نے برابر حصہ نکالا ہے اور اللہ تعالیٰ گنتی کو نہیں دیکھتے، وہ تو دل اور جذبہ کو دیکھتے ہیں۔ دنیا اور مال کی محبت سارے فساد کی جڑ ہے، اس کو ختم کرنے کے لئے ہی

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب الزكاة عن رسول الله، باب ما جاء أن في المال حقًا سوى الزكاة، رقم: ٥٩٥، سنن الدارمي، كتاب الزكاة، رقم: ١٥٨١۔

صدقات کا حکم اور ترغیب دی گئی ہے۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ والی حدیث

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ انصارِ مدینہ میں کھجوروں کے باغات کے اعتبار سے سب سے زیادہ مالدار تھے اور انہیں اپنے مالوں میں سب سے زیادہ محبوب بیرحاء تھا جو مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے واقع تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لاتے اور اس میں پاکیزہ پانی پیا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ نازل ہوئی تو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ باغ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے صدقہ ہے، اللہ تعالیٰ کے پاس اس کی بہتری اور ذخیرہ ہونے کی اُمید رکھتا ہوں۔ پس یا رسول اللہ! آپ جہاں مناسب خیال فرمائیں اسے تصرف میں لائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا: واہ واہ، وہ تو نفع والا مال ہے اور میں نے تمہاری بات سن لی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم اسے رشتہ داروں میں تقسیم کردو۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ایسا ہی کروں گا، اور اسے اپنے رشتے داروں اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔(۱)

اللہ تعالیٰ ہمیں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں اور ان کی طرح اللہ کی راہ پر خرچ کرنے والا بنائیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) صحيح البخاری، كتاب تفسير القرآن، باب لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون، رقم: ٤١٨٩، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب فضل النفقة والصدقة على الأقربين، رقم: ١٦٦٤، مسند أحمد، رقم: ١١٩٨٥

خوف اور اُمید ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ، أَمَّا بَعْدُ!

گذشتہ رمضان ۱۴۲۱ھ میں ''انفاسِ عیسیٰ'' کے جس حصے کی تشریح کی تھی، وہ ''تعلق مع اللہ اور محبتِ خداوندی'' سے متعلق تھا، الحمد للہ بقدر ضرورت اس کی تشریح ہوگئی تھی، آگے ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے، جس کا عنوان ہے ''خوف و رجا'' اس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات یہاں پر مذکور ہیں، اللہ کے نام پر اس رمضان ۱۴۲۲ھ میں یہ باب شروع کرتے ہیں۔

ایمان ''خوف'' اور ''رجا'' کے درمیان ہے

جن باطنی اخلاق اور اعمال کا حصول انسان کے لئے ضروری اور مطلوب ہے، ان میں ''خوف و رجا'' بھی ہیں۔ ''خوف'' کے معنی ہیں ''اللہ کا ڈر'' کیونکہ اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہو تو آدمی غفلت میں، گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور ''رجا'' کے معنی ہیں ''اُمید'' یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر بھی ہو، اور اللہ جل شانہ کی ذات سے اور اس کی رحمت سے اُمید بھی ہو، دونوں چیزیں جب ساتھ ساتھ ہوں تب ایمان کامل ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "الإيمان بين الخوف والرجاء"(۱) یعنی ایمان خوف و رجا کے درمیان ہے۔ اگر ان دونوں میں توازن صحیح ہو جائے تو ایمان کامل ہو جائے۔ جتنا انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا چاہئے، اتنا ہی خوف ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، اسی طرح جتنی ''رجا'' ہونی چاہئے، اتنی ہی رجا ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، تو اس انسان کا ایمان کامل ہے۔

☆ اصلاحی مجالس (۶/۲۷۳ تا ۲۸۶)

(۱) قرآن و حدیث کی مختلف نصوص کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ ایمان خوف اور اُمید کی درمیانی کیفیت کا نام ہے، البتہ ہمیں نبی پاک ﷺ کا کوئی ارشاد ان الفاظ کے ساتھ نہیں مل سکا جو اُوپر بیان کیے گئے ہیں۔

خوف اور رجا دونوں کا ہونا ضروری ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''خوف اور رجا'' دو پَر ہیں، جن کے ذریعہ صالحین اس دنیا سے جنت کی طرف پرواز کرتے ہیں، جس طرح پرندہ اپنے پروں کے ذریعہ پرواز کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کو حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ اس کے ضروری ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ خوف کے بارے میں فرمایا:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾(۱)

یعنی جو اللہ کے نیک بندے ہیں، ان کے پہلو رات کے وقت اپنے بستر سے جدا رہتے ہیں، اور اپنے پروردگار کو اس حالت میں پکارتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈر بھی رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے اُمید بھی رکھے ہوتے ہیں۔

رحمت کی اُمید اور جہنم کا خوف

پورے قرآن کریم میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کا ذکر علیحدہ اور جہنم کا ذکر علیحدہ کہیں نہیں کیا، بلکہ جہاں کہیں جنت کا ذکر فرمایا وہیں جہنم کا ذکر بھی فرمایا، اور جہاں جہنم کا ذکر فرمایا وہیں جنت کا بھی ذکر فرمایا، مجھے اس میں کہیں استثناء نظر نہیں آیا۔ یہ اس لئے کیا تاکہ ایک مرتبہ جنت کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنی رحمت سے اُمید پیدا کریں، اور دوسری طرف جہنم کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف پیدا کریں۔ چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ﴾(۲)

یعنی میرے بندوں کو بتادو کہ میں بڑا غفور رحیم ہوں، بڑی مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہوں، اور ساتھ میں یہ بھی بتادو کہ میرا عذاب بھی بڑا دردناک ہے، دیکھئے! دونوں باتیں ساتھ ساتھ بتادیں۔ اب رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید باندھے، اور اس کے عذاب کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرے، جب انسان دونوں چیزیں ساتھ ساتھ لے کر چلے گا تو اپنا ایمان کامل کرے گا۔

کتنا خوف ہونا چاہئے؟

اگر انسان پر تنہا ''خوف'' طاری ہوجائے تو وہ بھی خطرناک چیز ہے، جب خوف ہی خوف

---

(۱) السجدة: ۱٦ (۲) الحجر: ۴۹، ۵۰

طاری ہوگیا، اور "اُمید" بالکل نہیں ہے تو اس کے نتیجے میں ایک طرف تو زندگی اجیرن ہو جائے گی، اور دوسری طرف "یاس" اور "نا اُمیدی" پیدا ہو جائے گی، وہ یہ سوچے گا کہ میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں، اور یہ "نا اُمیدی" بڑی خطرناک چیز ہے، یہ انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے، اس لئے اگر اللہ کی عظمت کا، اس کے جلال کا، اس کے عذاب کے خوف کا استحضار اس قدر ہو جائے کہ ہر وقت وہی دماغ پر چھا جائے تو آدمی کھانے سے، پینے سے رک جائے، اور دنیا کے کام بھی نہ کر سکے، اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ سے خوف مانگا، لیکن کتنا مانگا؟ فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ))(۱)

مطلق یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنا ڈر دیجئے، بلکہ فرمایا کہ یا اللہ! اتنا خوف دیدے جو میرے اور آپ کی معصیت کے درمیان حائل ہو جائے۔ مطلق ڈر نہیں مانگا، اس لئے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا مطلق ڈر طاری ہو جاتا ہے، اور خوف کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس سے ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ دوسری دعا میں آپ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ مَخَافَةً تَحْجُزُنِيْ عَنْ مَعَاصِيْكَ))(۲)

اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھے آپ کی معصیت سے روک دے، اس میں آپ نے قید لگا کر خوف مانگا کہ اس سے زیادہ نہیں مانگا، اس لئے کہ اگر خوف کی زیادتی کے نتیجے میں مایوسی پیدا ہو جائے تو انسان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔

"خوف" اور "تقویٰ" میں فرق

یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ قرآن کریم میں بعض جگہوں پر "تقویٰ" کا لفظ بھی آیا ہے، اور بعض جگہوں پر "خوف" کا لفظ بھی آیا ہے۔ "تقویٰ" کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾(۳)

یعنی اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اللہ کا حق ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳٤۲٤، پوری دعا کچھ یوں ہے: "اللّٰھم قسم لنا من خشیتك ما یحل بیننا وبین معصیك ومن طاعتك ما تبلغنا به جنتك ومن الیقین ما تھوّن به علینا مصیبات الدنیا ومتعنا بأسماعنا وأبصارنا وقوتنا ما أحییتنا واجعله الوارث منا واجعل ثأرنا علی من ظلمنا وانصرنا علی من عادانا ولا تجعل مصیبتنا فی دیننا ولا تجعل الدنیا اکبر ھمّنا ولا مبلغ علمنا ولا تسلط علینا من لا یرحمنا"

(۲) مجمع الزوائد و منبع الفوائد (۱/٤۰۱)

(۳) آل عمران: ۱۰۲

جبکہ ''خوف'' کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اتنا خوف کرو جتنا کہ اللہ کا حق ہے، اس لئے کہ ''تقویٰ'' اور ''خوف'' میں فرق ہے، ''خوف'' کے معنی ہیں مطلق ڈر جس سے آدمی مرعوب ہو جائے، اور دل و دماغ پر اس کا ڈر مسلط ہو جائے، یہ ہے ''خوف''، جبکہ ''تقویٰ'' مطلق ''ڈر'' کا نام نہیں، بلکہ تقویٰ اس کیفیت کا نام ہے جو ''خوف'' کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، یعنی یہ فکر کہ جس سے مجھے خوف ہو رہا ہے، میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں، اس کیفیت کا نام ''تقویٰ'' ہے، لہٰذا ''خوف'' نام ہے ڈر کا، اور اس ڈر کی وجہ سے گناہ سے بچنے کا نام ''تقویٰ'' ہے، چنانچہ یہ ڈر کہ اللہ تعالیٰ زبردست طاقت والے ہیں، بدلہ لینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا شدید ہے، اس نے ایسی جہنم تیار کر رکھی ہے، اس تصور کے بعد جو ڈر پیدا ہو رہا ہے اس کا نام ہے ''خوف'' اور اس ڈر کی وجہ سے اگر تم جھوٹ بولنے سے بچ گئے تو اس کا نام ''تقویٰ'' ہے، اگر اس ڈر کے نتیجے میں تم غیبت سے بچ گئے، بدنظری سے بچ گئے تو اس کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

ناسخ اور منسوخ

بعض حضرات علماء یہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ جو آیت ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (۱)

یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے، اور اس آیت کا ناسخ دوسری آیت ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (۲)

یعنی پہلے یہ حکم آیا تھا کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا حق ہے ویسا تقویٰ اختیار کرو، یہ حکم سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بڑی پریشانی ہوگئی کہ یا اللہ! ہم تقویٰ کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کریں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس پریشانی کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا، اور پھر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (۳)

یعنی اتنا تقویٰ اختیار کرو، جتنا تمہاری استطاعت میں ہو۔ لہٰذا اب "حَقَّ تُقٰتِهٖ" کا مطالبہ باقی نہیں رہا۔

---

(۱) آل عمران: ۱۰۲، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اے ایمان والو! دل میں اللہ کا ویسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنا اس کا حق ہے اور خبردار! تمہیں کسی اور حالت میں موت نہ آئے، بلکہ اسی حالت میں آئے کہ تم مسلمان ہو''

(۲) التغابن: ۱۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''لہٰذا جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو''

(۳) التغابن: ۱۶

پہلی آیت دوسری آیت کی تفسیر ہے

لیکن دوسرے اہلِ علم یہ کہتے ہیں کہ ان آیات کو ناسخ اور منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں، بلکہ درحقیقت پہلی آیت دوسری آیت کی تفسیر ہے، یعنی جب یہ کہا گیا کہ جیسا اللہ کا حق ہے ویسا تقویٰ اختیار کرو، اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ڈر گئے کہ تقویٰ کا حق ہم سے کہاں ادا ہوگا؟ تو ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ تقویٰ کا حق اتنا ہی ہے جتنی تمہارے اندر طاقت ہے، ہم نے تم سے تقویٰ کا بہت اُونچا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ ''حَقَّ تُقٰتِہٖ'' سے مراد ''مَا اسْتَطَعْتُمْ'' ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا'' لہٰذا یہ دوسری آیت پہلی آیت کی تفسیر ہے۔

''احیاء العلوم'' کا باب الخوف

خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اتنا ''خوف'' مطلوب نہیں جس کے نتیجے میں آدمی کے اندر ''مایوسی'' پیدا ہو جائے، اور ''تقویٰ'' اتنا مطلوب ہے جو استطاعت کے مطابق ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احیاء العلوم'' بڑی زبردست کتاب ہے، ہر چیز کے اندر اس کی عجیب شان ہے، لیکن میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ اس کتاب کا باب الخوف ایک مجلس میں پورا نہیں پڑھنا چاہئے، بلکہ مختلف مجلسوں میں تھوڑا تھوڑا پڑھنا چاہئے، اس لئے کہ اگر کوئی شخص پورے باب کو ایک مجلس میں پڑھے گا تو بعض اوقات پڑھنے والے پر ''خوف'' کا اتنا غلبہ ہو جائے گا جو مطلوبہ خوف سے بڑھ جائے گا، چنانچہ اس باب کو پڑھنے کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے حالات خراب ہو گئے، ان کے ذہن اُلٹ گئے، اور وہ مایوسی کی طرف چل پڑے، یہ تفصیل تو ''خوف'' کے بارے میں تھی۔

''اُمید'' میں حدِ اعتدال مطلوب ہے

دوسری چیز ''رجا'' ہے، جس کے معنی ہیں ''اُمید''۔ یہ ''اُمید'' بھی مطلوب ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید رکھنا مطلوب ہے، لیکن یہ ''اُمید'' بھی اعتدال کے اندر ہو، اگر ''اُمید'' اعتدال سے بڑھ جائے تو اس کا نام ''دھوکہ'' اور ''غرور'' ہے۔ ''اُمید'' اعتدال سے کس طرح بڑھ جاتی ہے؟ اس کے بارے میں ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَہٗ ھَوَاھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ))(۱)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ، باب منہ، رقم: ۲۳۸۳، سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب ذکر الموت والاستعداد لہ، رقم: ۴۲۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۶۵۰۱

یعنی ''عاجز'' وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو ''خواہشات'' کے پیچھے لگائے ہوئے ہے، اس کی نفسانی خواہشات اس کو جہاں لے جارہی ہیں، وہ جارہا ہے، گناہ کرنے میں کبھی کوئی کھٹک نہیں ہوتی، گناہوں سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں، دل میں جو خواہش پیدا ہورہی ہے، اس کو پورا کررہا ہے، حلال حرام ایک کررہا ہے، ساتھ میں اللہ تعالیٰ پر آرزو باندھے بیٹھا ہے، چنانچہ جب اس کو یہ کہا جائے کہ یہ کام ناجائز ہے تو جواب میں کہتا ہے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے، اس شخص کو ''غفور رحیم'' ہونے کا دھوکہ ہوگیا ہے، یہ ''رجا'' نہیں، اس لئے کہ جب ''اُمید'' اپنی حد سے آگے بڑھ جائے تو وہ غرور اور دھوکہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا ''رجا'' کو اپنی حد پر رکھنا چاہئے، تاکہ یہ دھوکہ نہ بنے، اور ''خوف'' کو اپنی حد میں رکھنا چاہئے، تاکہ وہ ''یاس'' اور ''نا اُمیدی'' میں تبدیل نہ ہوجائے، دونوں کو اپنی اپنی حد پر رکھ کر چلنا چاہئے۔

دونوں کی حدِ اعتدال کس طرح معلوم ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ انسان ان دونوں کو اپنی اپنی حد پر رکھ کر کس طرح چلے؟ کون شخص یہ بتائے گا کہ یہ ''خوف'' اپنی حد کے اندر ہے، اور یہ ''رجا'' اپنی حد کے اندر ہے؟ اور کون بتائے گا کہ تمہیں ''خوف'' کا مطلوبہ درجہ حاصل ہے، اور ''رجا'' کا بھی مطلوبہ درجہ حاصل ہے؟ یہ پتہ لگانے ہی کے لئے ''فنِ تصوف'' ہے، اور یہ پیری مریدی اس کام کے لئے ہے، اور شیخ سے رجوع اسی مقصد کے لئے کیا جاتا ہے، وہ شیخ بتاتا ہے کہ ''خوف'' کا وہ درجہ جو مطلوب ہے وہ الحمدللہ تمہیں حاصل ہوچکا ہے، اور جتنی ''رجا'' مطلوب تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ تمہیں عطا فرمادی، اور تم اعتدال کے اندر ہو، اور اگر کوئی شخص اعتدال کی حد کے اندر نہیں ہے تو شیخ اس کی اصلاح کرکے اس کو اعتدال کی حد کے اندر لاتا ہے، تصوف کا اور کسی شیخ سے رجوع کرنے کا اصل مقصود یہی ہے۔ آجکل لوگوں نے ''تصوف'' کا مقصد یہ سمجھ لیا ہے کہ شیخ کچھ تسبیحات پڑھنے کو بتادے گا کہ صبح یہ پڑھا کرو، اور شام کو یہ پڑھا کرو، یاد رکھئے! یہ تسبیحات اصلاح کے اندر معاون ضرور ہیں، لیکن اصل مقصود نہیں، تسبیح تو آپ شیخ کے بغیر گھر میں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تصوف کا اور شیخ سے تعلق کا اصل مقصود یہ ہے کہ جو اعمالِ باطنہ مقصود ہیں وہ انسان کے اندر پیدا ہوجائیں، اور جن اعمال سے بچنا ضروری ہے انسان ان سے بچ جائے۔ بہرحال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں ''خوف'' اور ''رجا'' دونوں کو بیان کیا ہے، تاکہ ہم دونوں کے درمیان رہتے ہوئے زندگی گزاریں۔

مایوس اور نا اُمید ہونا جائز نہیں

چنانچہ ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:
''نا اُمیدی عقلی مذموم ہے، یعنی اگر یہ اعتقاد ہو جائے کہ مجھ پر ہرگز رحمت نہ ہو گی، اور میری موجودہ حالت ایسی نہیں کہ اس پر رحمت ہو''(۱)

اگر کسی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کبھی نہیں ہوگی، تو یہ ''یاس'' ہے، اسی کا نام ''نا اُمیدی'' ہے، یہ مذموم ہے، اور کسی مؤمن کے لئے یہ ''یاس'' جائز نہیں، ہرگز نہیں ہونی چاہئے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾(۲)

اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے، اور زیادتیاں کر بیٹھے ہو، تم اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا، بیشک اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف فرمانے والے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، چاہے انسان نے کتنا ہی بڑے سے بڑا گناہ کر لیا ہو، اور برے سے برا گناہ کر بیٹھا ہو، تب بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کسی حال میں مایوس نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسی ہے کہ تم نے چاہے کیسا ہی بڑے سے بڑا گناہ کر لیا ہو، ایک مرتبہ جب تم سچے دل سے توبہ کر لو گے، اور یہ کہو گے "أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ" تو ان شاء اللہ اسی لمحے اللہ تعالیٰ تمہیں سارے گناہوں سے پاک صاف کر دیں گے، اس میں کوئی شبہ اور شک نہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کے دل میں مایوسی کا کہاں گزر ہو سکتا ہے۔

جس کا اللہ ہو اس کو پریشانی کیسی؟

مایوسی تو اس شخص کو ہو جس کے ساتھ یہ وعدے نہ کیے گئے ہوں، جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ راستے نہ بتائے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ میں نے تمہارے لئے توبہ کا دروازہ کھولا ہوا ہے، اور مرتے دم تک کھلا رہے گا، پھر مایوسی کیوں؟ میرے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ

جس کا اللہ ہو، اس کو پریشانی کیسی؟

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے یہ وعدے فرما رکھے ہیں، اور طریقے بھی بتا رکھے ہیں، پھر کہاں کی پریشانی؟ کیسی مایوسی؟ جب گناہ کر کے پریشان ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، توبہ کرو، استغفار

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص:۲۰۴ (۲) الزمر: ۵۳

کرو، اور آئندہ اس گناہ سے بچنے کی فکر کرو، باقی اپنے گناہ کا مراقبہ کبھی مت کرو کہ میں نے فلاں گناہ کیا، میں نے فلاں گناہ کیا، فلاں گناہ کیا۔ ارے جتنا وقت تم اس مراقبہ میں گزار رہے ہو، وہ وقت ''اللہ کے ذکر'' میں، اور ''سبحان اللہ'' پڑھنے میں گزار دو، اور توبہ کرو کہ یا اللہ! میں نے جو کچھ گناہ کیے، میں ان پر اقراری مجرم ہوں، گناہوں کا اقرار کرتا ہوں، لیکن یا اللہ! آپ کی رحمت بڑی وسیع ہے، آپ کی رحمت سے توبہ کرتا ہوں، اور استغفار کرتا ہوں۔ لہٰذا اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ یہ خیال کہ میں تو راندۂ درگاہ ہوں، اور میں تو اللہ کی رحمت سے دور ہوں، اللہ کی رحمت مجھ پر ہو ہی نہیں سکتی، یہ سب شیطانی خیالات ہیں۔

نااُمیدی کے غلبہ کا نتیجہ

بعض اوقات غلبۂ حال کے نتیجے میں ''خوف'' کا یا ''یاس'' کا انسان پر غلبہ ہو جاتا ہے، یہ غلبہ بڑی خراب چیز ہے، اس لئے کہ اس کے نتیجے میں انسان پر قبض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، عبادت میں دل نہیں لگتا، توبہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اور دماغ میں یہی خیال سوار ہو جاتا ہے کہ میں اللہ کی رحمت سے دور ہوں۔ ایسے موقع پر شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، اور حکمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا ایک مرید تھا، اس پر ''قبض'' کی کیفیت طاری ہوگئی، اور اس کے دماغ پر یہ خیال مسلط ہوگیا کہ میں شیطان ہوں، اور شیطان کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ جہنمی ہے، اس لئے اپنے جہنمی ہونے کا یقین ہوگیا، جس سے ملاقات ہوتی تو اس سے یہ کہتا کہ میں شیطان ہوں۔ جب ان کے شیخ کو پتہ چلا تو ان کو بلایا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ میں تو شیطان ہوگیا ہوں، اور میں اللہ کی رحمت سے دور ہوگیا ہوں، اور اب سوائے جہنم کے میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ شیخ نے اس سے کہا یہ بتاؤ شیطان کس کی مخلوق ہے؟ ارے شیطان بھی انہی کی مخلوق ہے، انہوں نے ہی تو شیطان کو پیدا کیا ہے، پھر کیوں ڈرتا ہے؟ بس یہ سن کر اس کی گرہ کھل گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی کیفیت زائل کر دی۔ بہرحال! علاج کے لئے بھی شیخ کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس وقت اس کے لئے کیا مفید ہوگا؟ اسی لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ یہ اعتقاد کہ مجھ پر ہرگز اللہ کی رحمت نہ ہوگی، یہ نااُمیدی ہے، اور مذموم ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

نااُمیدی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

یہ نااُمیدی کی کیفیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ جو اعمال کرنے کی اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرما رہے ہیں، ان کی ناقدری کرنے سے رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر ہماری

زبانوں پہ یہ رہتا ہے کہ ہماری نمازیں کیا ہیں؟ یہ تو ٹکریں مارنا ہے، یہ وقت گزاری کر رہے ہیں۔ یہ سب ناقدری کی باتیں ہیں، یہ ناقدری نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ارے بھائی! اس عبادت کی ادائیگی کی توفیق پر پہلے شکر ادا کرلو، کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو ایسی عبادت کرنے کی بھی توفیق میسر نہیں، اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس عبادت کو انجام دینے کی توفیق دے دی تو پہلے اس پر شکر ادا کرلو، اور یہ کہو: یا اللہ! آپ کی توفیق اور آپ کے فضل وکرم سے مجھے یہ توفیق ملی، آپ مجھے مسجد میں لے آئے، مجھ سے نماز پڑھوادی، اے اللہ! اس پر آپ کا شکر ہے۔

نماز کے بعد استغفار کرلو

شکر ادا کرنے کے بعد یہ کہو کہ یا اللہ! مجھ سے یہ نماز صحیح طور پر نہیں پڑھی گئی، اور اس نماز کے اندر کمی کوتاہی ہوگئی، اس پر میں استغفار کرتا ہوں، لہٰذا نماز پڑھنے کے بعد "الحمدللہ" بھی کہو، اور "استغفراللہ" بھی کہو، اس کے بعد پھر اپنی نماز کی ناقدری مت کرو، اس لئے کہ یہ ناقدری رفتہ رفتہ انسان کو "مایوسی" کی طرف لے جاتی ہے، اور یہ خیال ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی عبادت کرلوں، لیکن وہ قابلِ قبول نہیں ہوگی، اس مایوسی سے بچو، اور جو عبادت کرنے کی توفیق ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، لہٰذا توفیق پر "شکر" اور کوتاہی پر "استغفار" کرتے رہو، ساری عمر یہ کرتے رہو، انشاء اللہ پھر "مایوسی" پیدا نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

توکل کی حقیقت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ سَلْمَانَ وَعَبْدَاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اِلْتَقَيَا فَقَالَ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ اِنْ لَقِيْتَ رَبَّكَ قَبْلِيْ فَالْقَنِيْ وَاَعْلِمْنِيْ مَا لَقِيْتَ وَاِنْ لَقِيْتُهُ قَبْلَكَ لَقِيْتُكَ وَاَخْبَرْتُكَ فَتُوُفِّيَ اَحَدُهُمَا وَلَقِيَ صَاحِبَهُ فِي الْمَنَامِ فَقَالَ لَهُ تَوَكَّلْ وَاَبْشِرْ فَاِنِّيْ لَمْ اَرَ مِثْلَ التَّوَكُّلِ قَالَ ذٰلِكَ ثَلٰثَ مِرَارًا.“(۱)

یہ ایک واقعہ ہے جو حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے۔ حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ اُونچے درجے کے تابعین، اولیاء کرام اور محدثین میں سے ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ آپس میں ملے۔ یہ دونوں صحابی پہلے اہلِ کتاب میں سے تھے۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پہلے تو نصرانی رہے پھر یہودیت بھی انہوں نے اختیار کی اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق عطا فرمائی۔ اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پہلے یہودی تھے، یہود کے سردار مانے جاتے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی توفیق عطا فرمادی۔ اب ان دونوں بزرگوں نے اپنی اس ملاقات میں ایک دوسرے سے ایک معاہدہ کیا کہ ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر تمہارا انتقال پہلے ہو جائے تو تم مجھے خواب میں آکر بتانا کہ تمہارے ساتھ کیا گزری اور اگر میرا انتقال پہلے ہو گیا تو میں تمہیں خواب میں آکر بتاؤں گا کہ میرے ساتھ کیا گزری اور کیا حالات وہاں پر دیکھنے میں آئے؟

اللہ تعالیٰ لاج رکھتے ہیں

ویسے تو یہ انسان کے اختیار میں نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے دوسرے کے خواب میں آجائے

☆ اصلاحی مواعظ (۳/ ۹۱ تا ۱۰۸)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔ زیرِ نظر بیان عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الزہد کے ((باب ما جاء فی التوکل)) کا درس ہے۔

(۱) الزهد لابن المبارك (۱/ ۱۴۳)

لیکن اللہ کے کچھ نیک بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ اللہ کے بھروسے پر کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی لاج رکھتے ہوئے ان کی بات کو سچا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ))(۱)

"بعض لوگ بظاہر بڑے پراگندہ حال و بال ہوتے ہیں اور لوگ ان کو اپنے دروازوں سے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔ اگر وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیتے ہیں"

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے خواہ ایسی بات کی قسم کھائیں جو ان کے اختیار میں نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کی خاطر اتنی عزیز ہوتی ہے کہ ان کی زبان سے نکلی ہوئی بات اللہ تعالیٰ پوری کر دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے یہ حدیث اس وقت ارشاد فرمائی تھی جبکہ دو عورتوں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا اور ان میں سے ایک نے دوسری کا دانت توڑ دیا۔ یہ مقدمہ نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا گیا۔ چونکہ اس وقت تک قصاص کا قانون نازل ہو چکا تھا اس لئے حضور ﷺ نے قصاص کا فیصلہ سنا دیا۔ اب وہ عورت کہ جس سے دانت کا قصاص لینا تھا ان کے ایک عزیز جو کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا بھی تھے، موجود تھے کہ اچانک ان کے منہ سے نکلا:

"لَا وَاللّٰهِ لَا تُكْسَرُ ثَنِيَّتُهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ"(۲)

"یا رسول اللہ! میں قسم کھاتا ہوں کہ اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا"

اب اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس مظلوم خاتون نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر چہ مجھے اس کا دانت توڑنے کا حق حاصل ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ اختیار بھی تو دیا ہے کہ میں اس کو معاف کر دوں۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں مجھے اسی کے بدلے معاف فرما دیں۔

یوں اس عورت کا دانت ٹوٹنے سے بچ گیا۔ اس موقع پر آنحضور ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب النار يدخلها الجبارون والجنة يدخلها الضعفاء، رقم: ٥٠٩٤

(۲) صحيح البخارى، كتاب الصلح، باب الصلح فى الدية، رقم: ٢٥٠٤، سنن النسائى، كتاب القسامة، باب القصاص من الثنية، رقم: ٤٦٧٥، سنن أبى داؤد، كتاب الديات، باب القصاص من السن، رقم: ٣٩٧٩، مسند أحمد، رقم: ١١٨٥٤

آخرت کے حالات مزید معلوم نہیں ہو سکتے

خیر! ان دونوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک کا انتقال پہلے ہوگیا تو دوسرے کو اسی بات کا انتظار رہا کہ وہ خواب میں آکر انہیں وہاں کے حالات بتائیں۔ چنانچہ وہ خواب میں آگئے۔ اب ان کو یہ خیال تھا کہ یہ وہاں کے حالات اور کیفیات کے بارے میں بتلائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو ایسا پردۂ راز میں رکھا ہے کہ کسی کو بھی اس کی خبر کسی طریقے سے نہیں ہو پاتی۔ بس جو علم اللہ تعالیٰ نے دے دیا اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتلا دیا اس سے آگے جانے کی کسی میں مجال ہی نہیں ہے۔

یہاں کے حالات دیکھنے کے ہیں، بتانے کے نہیں

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے ایک واقعہ سنا کہ ایک بزرگ سے کسی نے کہا کہ ہم جو مرنے کے بعد کے حالات پڑھتے ہیں تو محض تصور سے تو اس کی تفصیل سمجھ میں نہیں آسکتی، اس لئے آپ کوئی ایسی ترکیب بتائیے کہ جس کے ذریعے ہمیں تمام تفصیلات اچھی طرح معلوم ہو جائیں۔ ان بزرگ نے کہا: اچھا! میں تمہیں بتانے کی کوشش کروں گا۔ تم ایسا کرنا کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے دفن کے وقت میرے ساتھ ایک قلم اور کاغذ رکھ دینا اور دفن کے کچھ دن بعد تم میری قبر پر آنا تو وہاں پر تمہیں ایک پرچہ رکھا ہوا ملے گا جس میں وہاں کے حالات لکھے ہوں گے۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا اور کچھ دن کے بعد جب وہ ان کی قبر پر پہنچا تو واقعۃً وہاں ایک پرچہ پڑا ہوا پایا۔ اب یہ شخص بڑی خوشی اور شوق سے آگے بڑھا کہ اس کے ذریعے مجھے وہاں کے حالات معلوم ہوں گے لیکن جب اس نے پرچہ اُٹھا کر دیکھا تو اس میں یہ لکھا ہوا پایا کہ یہاں کے حالات دیکھنے کے ہیں بتانے کے نہیں۔ اور اس عالم کے حالات کو مخفی رکھنے میں بھی حکمت ہے کہ اگر کسی وقت عالمِ برزخ کے مناظر سامنے آجائیں تو کوئی انسان بھی دنیا کا کوئی کام کر ہی نہ سکے۔ اسی لئے روایات میں آتا ہے کہ قبر میں جب عذاب ہوتا ہے تو بعض اوقات جانور بھی اس کی آواز سن لیتے ہیں لیکن انسان کو وہ آواز نہیں سنائی دیتی کیونکہ اگر انسان وہ آواز سن لے تو پھر وہ دنیا کے کام نہیں کر سکے گا۔

عالمِ برزخ میں توکّل کی اہمیت

بہر حال! جو صحابی خواب میں آئے انہوں نے انہیں وہاں کے حالات تو نہ بتائے البتہ ایک ایسا جملہ بتا گئے جو ہمارے اور آپ کے عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں یہاں آنے کے بعد جس چیز کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں وہ توکّل ہے۔ اگر تم نے اللہ پر بھروسہ کر لیا تو پھر خوشخبری سن

لو کہ اس کا انجام بہت بہتر ہے اس لئے کہ اس جہان میں آنے کے بعد میں نے توکل کے علاوہ کسی اور صفت کو نہیں دیکھا جو انسان کے درجات کو بلند کردے۔

توکّل کا معنی

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاحی معنی اللہ پر بھروسہ کرنے کے ہیں۔ یعنی اس کائنات میں ہونے والے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت اور اس کی حکمت سے ہورہے ہیں۔ اور توکل درحقیقت توحید ہی کا ایک لازمی حصہ ہے کیونکہ توحید صرف کلمہ طیبہ زبان سے پڑھ لینے کا نام نہیں ہے بلکہ توحید کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ چنانچہ جب "لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کہا تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات میں نہ کوئی عبادت کے لائق اور نہ کوئی محبت کے لائق، اس کائنات میں نہ کسی کے پاس قدرت اور نہ وسعت، اس کائنات کے اندر ہونے والے تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہورہے ہیں۔ کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ "توحید خدا، خدا را واحد دیدن است نہ کہ واحد گفتن" یعنی درحقیقت توحید اللہ تعالیٰ کو ایک دیکھنے کا نام ہے نہ کہ ایک کہنے کا۔ مطلب یہ کہ فقط زبان سے ایک کہہ دینا کافی نہیں بلکہ اللہ کی دی ہوئی آنکھ سے دیکھے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہورہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہورہا ہے، اسی کو توحید کہا جاتا ہے اور اسی کا ایک لازمی تقاضا توکل بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ اسباب پیدا کررکھے ہیں لیکن وہ اسباب فی نفسہٖ کوئی حقیقت نہیں رکھتے، ان اسباب میں قوت پیدا کرنے والی ذات اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے، اسی کو توکل کہا جاتا ہے۔ اب توکل کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا نہ کہ اسباب و ذرائع پر۔ اگرچہ اسباب اختیار کرنے کا ہمیں شریعت ہی نے حکم دیا ہے لیکن انسان اسباب کو اختیار کرتے ہوئے یہ سوچ لے کہ اس کی اپنی ذات میں کچھ نہیں رکھا بلکہ اس میں قوت دینے والی ذات کوئی اور ہے لہٰذا اصل رجوع مجھے اسی کی طرف کرنا چاہئے۔

توکل کا صحیح مفہوم

مثال کے طور پر کسی شخص کو بیماری لاحق ہوجاتی ہے۔ اب بیماری کا علاج کرنا تو نبی کریم ﷺ کی سنت بھی ہے، لیکن ایک مسلمان کے دوا کھانے میں ایک کافر کے ساتھ امتیاز ہونا چاہئے۔ کیونکہ کافر جو کہ خدا پر ایمان نہیں رکھتا اس کا سارا بھروسہ اس دوا پر ہے۔ لیکن ایک مسلمان جب دوا کھاتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ یہ دوا کوئی حقیقت نہیں رکھتی، اس دوا کے اندر تاثیر پیدا کرنے والی کوئی اور ذات ہے اور اسی کو "توکل" کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگرچہ یہ اعتقاد ایک مسلمان کے دل

میں ہوتا ہے مگر عمل کے وقت اس کا دھیان نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر عمل کے وقت دھیان ہوگا تب جا کر توکل کا صحیح مفہوم حاصل ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس بات کا مشاہدہ بھی کراتے رہتے ہیں کہ اسباب انسان کو دھوکہ دے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک دوا کسی بیماری میں بڑی موثر ثابت ہوئی لیکن دوسری مرتبہ اسی مرض میں وہی دوا کھانے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

دوا بھی تاثیر کی اجازت طلب کرتی ہے

ہمارے ایک بزرگ ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب تھے جو کہ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ کے خاص معالج اور بڑے تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ ایک دن میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری ساری عمر کا تجربہ یہ ہے کہ دوا جب مریض کے حلق میں جاتی ہے تو (اللہ تعالیٰ سے) پوچھتی ہے کہ کیا اثر کروں؟ فائدہ یا نقصان؟ پھر جو اشارہ وہاں سے ملتا ہے اس کے مطابق وہ دوا کام کرتی ہے۔ یہی بزرگ ہمیں سناتے تھے کہ کسی وقت میں لاہور کے گنگارام ہسپتال کا انچارج ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں رات کے وقت ہسپتال میں گیا تو وہاں میں نے واپسی کے وقت موجود عملے سے کہا کہ جو چھ نمبر بیڈ کا مریض ہے اس پر میں ساری تدبیریں اختیار کر چکا، اب اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں، بس یہ ایک دو گھنٹے کا مہمان ہے۔ جب اس کا انتقال ہو جائے تو اس کے ورثاء کو اس کی اطلاع کر دینا۔ اور وہ جو بارہ نمبر بیڈ کا مریض ہے وہ اب تندرست ہو چکا ہے، صبح کو تم اسے چھٹی دے دینا کیونکہ مجھے صبح آنے میں دیر ہو جائے گی۔ اس کے بعد جب میں اگلے دن وہاں پر گیا تو معلوم ہوا کہ چھ نمبر بیڈ والا مریض تو صحت یاب ہو کر اپنے گھر کو روانہ ہو چکا ہے اور بارہ نمبر بیڈ کا مریض فوت ہو چکا ہے۔ معلوم ہوا کہ دوا اپنا اثر دکھانے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے اجازت لیتی ہے پھر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

توکل اس چیز کا نام نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ توکل اس چیز کا نام ہے کہ انسان تدبیر کیے بغیر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ خوب سمجھ لیجے کہ توکل اس کا نام ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں اپنی اُونٹنیوں کو چَرانے جاتا ہوں تو نماز کے وقت ان اُونٹنیوں کو باندھ دیا کروں یا کھلا رہنے دیا کروں اور اللہ پر توکل کر لوں؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ پہلے اس کی پنڈلی کو رسی سے باندھو پھر توکل کرو یعنی اسباب اختیار کرنے کے بعد توکل کرو۔ (۱)

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع، باب منه، رقم: ۲٤٤١

ہماری مثال

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ بطور تمثیل سنایا کرتے تھے کہ ایک دیہاتی ہندو تھا۔ جس زمانے میں ہندوستان کے اندر نئی نئی ریل چلی تو اس نے دیکھا کہ سارا کا سارا شہر خود بخود بھاگا چلا جارہا ہے، اسے بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا بات ہے؟ اس نے حیرانی سے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیسے خود بخود چل رہی ہے۔ تو کسی نے کہا کہ بھئی! یہ گاڑی خود سے نہیں چل رہی بلکہ درحقیقت گارڈ جب سبز جھنڈی ہلاتا ہے تو اس وقت ریل چلتی ہے، اس لئے اصل تو گاڑی چلانے والی سبز جھنڈی ہے۔ اس نے یہ سن کر سبز جھنڈی کو بڑا معزز سمجھا اور جا کر اس کی تعظیم کرنے لگا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ یہ سبز جھنڈی بڑی طاقتور ہے کہ اتنی بڑی ریل کو چلا رہی ہے۔ لوگوں نے اس سے کہا: درحقیقت یہ گارڈ کے ایک ہاتھ کا کمال ہے جس میں اس نے یہ جھنڈی اُٹھائی ہوئی ہے۔ اس لئے اصل وہ گارڈ ہے، سبز جھنڈی کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ اس نے گارڈ کے پاس جا کر اس کی تعریف شروع کردی کہ آپ تو بہت طاقتور آدمی ہیں کیونکہ آپ ہی کی بدولت یہ پوری گاڑی چلتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو اتنا طاقتور آدمی نہیں ہوں کہ اس گاڑی کو چلا سکوں، اصل تو ڈرائیور ہے جو سب سے آگے بیٹھا ہے، وہ گاڑی چلاتا ہے۔ پھر وہ شخص ڈرائیور کے پاس پہنچ کر اس کو کہتا ہے تم تو بڑے طاقتور ہو کہ اتنی بڑی گاڑی چلا رہے ہو۔ اس نے کہا کہ بھئی! میں تو کوئی طاقتور آدمی نہیں بس یہ چند پرزے ہلاتا ہوں اس سے یہ گاڑی چلتی ہے اور یہ پرزے بھی خود کچھ نہیں بلکہ ان کے پیچھے بھاپ کی طاقت ہے جو اسے چلاتی ہے۔ اب یہ دیہاتی بیچارہ اس مقام پر پہنچ کر رک گیا کہ اس کو کون چلاتا ہوگا؟ لیکن اگر غور وفکر کی نظر ہوتی تو سمجھ لیتا کہ بھاپ میں بھی کوئی طاقت نہیں، اس میں طاقت پیدا کرنے والی بھی کوئی اور ہستی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ اس دیہاتی کی طرح کبھی سبز جھنڈی پر بھروسہ کرلیا کبھی گارڈ پر، کبھی ڈرائیور پر اور کبھی بھاپ پر، اور اس سے آگے جو سب سے بڑی طاقت ہے اس کی طرف دھیان نہیں جاتا جس کی وجہ سے توکل سے محروم رہ جاتے ہیں۔ توکل یہ ہے کہ انسان ہر چیز میں یہ نظریہ رکھے کہ اس کام میں کچھ بھی نہیں رکھا، حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ ہی اس کام کو کر رہے ہیں۔

اور اس بات کا استحضار کرنے کیلئے شریعت نے کچھ احکام دیئے ہیں، مثلاً قرآن کریم میں فرمایا:

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾(۱)

''کبھی بھی کسی کام کے بارے میں یہ نہ کہو کہ میں یہ کل کردوں گا بلکہ ساتھ یہ کہو انشاء اللہ یہ کام کروں گا''

---

(۱) الکہف: ۲۳

انشاء اللہ کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ کا حکم اور اس کی مشیت ہوئی تو میں فلاں کام کروں گا۔
آج لوگوں نے انشاء اللہ کا معنی ہی بگاڑ کر رکھ دیا اور یہ سمجھ لیا کہ انشاء اللہ کہنے سے کچا ارادہ مراد ہوتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت انشاء اللہ کا مقصود یہ ہے کہ دل میں اس بات کا استحضار پیدا کیا جائے کہ کوئی کام بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کردہ ایک دلچسپ لطیفہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کسی وعظ میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب راستے میں چلتے ہوئے اپنے کسی دوست سے ملے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ بکری خریدنے جارہا ہوں! اس نے کہا کہ جب کوئی کام کرنے کا ارادہ ہو تو انشاء اللہ کہہ لیا کرو۔ انہوں نے کہا: انشاء اللہ کا کیا مقصد؟ پیسے میری جیب میں ہیں، بکری بازار میں ہے، جاؤں گا اور بکری خرید کر لے آؤں گا۔ اور یہ کہہ کر چل دیئے۔ اب جب آگے چلے تو راستے میں جیب کٹ گئی جس کی وجہ سے وہ بکری نہ خرید سکے۔ چنانچہ واپسی کے ارادے سے روانہ ہوئے تو راستے میں وہی صاحب پھر مل گئے۔ انہوں نے پوچھا کیا ہوا تو کہا کہ میں انشاء اللہ بکری خریدنے گیا تھا تو انشاء اللہ میری جیب کٹ گئی اور انشاء اللہ میں بکری نہیں خرید سکا۔
غرضیکہ توکل کی تعلیم درحقیقت اس لئے دی گئی ہے کہ انسان کو یہ استحضار رہے کہ میں کوئی بھی کام اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں کرسکتا اور یہ چیز انشاء اللہ کہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی کی وجہ سے پھر انسان کی نظر اسباب سے ہٹ کر مسبب کی طرف چلی جاتی ہے۔ آپ ذرا اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ بیماری ہوتی ہے تو سارا زور سبب یعنی دوا پر ہوتا ہے۔ لیکن اس دوا کے اندر تاثیر پیدا کرنے والے کی طرف رجوع ہر ایک کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب بھی دوا کھائیں تو یہ نیت کرلیا کیجئے کہ یا اللہ! یہ دعا تو کھارہا ہوں آپ اس میں تاثیر بھی ڈال دیجئے تو توکل پر عمل ہوجائے گا۔ اسی طرح تجارت وغیرہ کے اندر بھی یہی حکم ہے۔

بعض بزرگوں کا طریقۂ توکل

اس مقام پر تھوڑی سی تفصیل مزید عرض کردوں کہ جس کے بارے میں ذہنوں میں اکثر خلجان رہتا ہے۔ بعض بزرگوں نے توکل کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ انہوں نے معاش کا کوئی کام کیا ہی نہیں، مثلاً اپنے گھر یا جنگل میں بیٹھ گئے اور کوئی کام نہیں کیا جس سے کبھی فاقہ کی نوبت بھی آئی اور کبھی اللہ نے عطا بھی فرمادیا اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہ حال تھا۔ مثلاً

اصحاب صفہ حضور ﷺ سے علم حاصل کرنے کی خاطر صفہ پر آ کر پڑ گئے تھے اور مقصد صرف قال اللہ وقال الرسول کی تعلیم حاصل کرنا تھا۔ اب ظاہری طور پر ان کے معاش کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ صفہ پر اس ارادے سے آئے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا تو کھالیں گے ورنہ صبر کرلیں گے۔ بلکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس دو بھائی آیا کرتے تھے۔ ایک بھائی برسرِ روزگار اور ہنر مند اور محنت مزدوری کے ذریعے کمانے والا تھا اور دوسرا بھائی اکثر حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھا احادیث سنتا رہتا تھا، تو اس برسرِ روزگار بھائی نے ایک مرتبہ حضور ﷺ سے اپنے بھائی کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ! میرا یہ بھائی کوئی کام نہیں کرتا، ہر وقت آپ ہی کے پاس بیٹھا رہتا ہے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهِ))

''اس پر اعتراض نہ کرو کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اسی کی وجہ سے رزق عطا فرما رہے ہوں''(۱)

یعنی حضور ﷺ نے اس توکل پر نکیر نہیں فرمائی اور اسی طرح یہ سلسلہ اولیاء کرام اور صوفیاء عظام تک منتقل ہوتا رہا۔ چنانچہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک مرتبہ انہیں کئی وقت کا فاقہ ہوگیا۔ ایک آدمی نے آ کر کھانے کے بارے میں عرض کیا تو فرمایا کہ ہاں! دیگیں چڑھ رہی ہیں، یعنی یہاں فاقے کرلو اور جنت میں مزے لے لو۔ اسی لیے بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ ایک طرف تو کسبِ معاش کے لئے تدابیر اختیار کرنے کے بعد توکل کا حکم ہے اور دوسری طرف بعض بزرگوں کا یہ معمول ہے۔

اسباب کی تین قسمیں

تو خوب یاد رکھئے! کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کا ہر کام سبب سے وابستہ کر رکھا ہے لیکن اسباب کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

ایسے اسباب ترک کرنا حرام

(۱) وہ اسباب کہ جن سے عادۃً نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے، مثلاً انسان کو بھوک لگے تو کھانا بھوک مٹانے کا سبب ہے اور کھانا ایسا سبب ہے کہ جس پر نتیجے کا مرتب ہو جانا تقریباً یقینی ہے۔ چنانچہ آج تک سوائے کسی غیر معمولی شخص کے کسی کے بارے میں یہ نہیں سنا گیا کہ اس نے

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول اللّٰه، باب فی التوکل علی اللّٰه، رقم: ۲۲۶۷

کھانا کھایا لیکن اس کی بھوک نہ مٹی، ایسے اسباب کو ترک کرنا حرام ہے۔ یعنی اگر کسی شخص کے سامنے کھانا موجود ہو اور وہ کہے کہ میں اللہ پر توکل کرتا ہوں کہ وہ میری بھوک مٹا دے گا اور اس کھانے کو نہیں کھاتا تو یاد رکھیں کہ اگر وہ شخص اسی حالت میں مر گیا تو وہ حرام موت مرے گا، کیونکہ سبب یعنی کھانا کھانے کو اختیار کرنا فرض اور واجب ہے۔ نیز بزرگانِ دین میں سے کسی ایک سے بھی اس سبب کو ترک کرنا منقول نہیں۔

ایسے اسباب کو ترک کرنا جائز

(۲) اسباب کی دوسری قسم وہ اسباب ہیں جن پر کبھی تو نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں، جیسے دوا کی مثال ہے کہ وہ کبھی فائدہ دیتی ہے اور کبھی نہیں، ان کو "ظنی اسباب" کہا جاتا ہے اور ان کا حکم یہ ہے کہ ہم جیسے کمزور لوگوں کے لئے ایسے اسباب کو بھی ترک کرنا جائز نہیں، ان اسباب کو اختیار کرنے کے بعد پھر اللہ پر بھروسہ کرنا چاہئے، لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ خصوصی تعلق عطا فرمایا ہے ان کے لئے اسباب کو ترک کرنا بھی جائز ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے کسی حال میں بھی شکوہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ پر قوی ایمان رکھنے والے لوگ بعض اوقات اس قسم کے اسباب ترک کر دیتے ہیں کہ اگر کھانا وغیرہ موجود ہے تو اس کو ترک نہ کیا لیکن روزگار کے حصول کے معاملے میں توکل کیا۔ چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اور بہت سے بزرگانِ دین نے بھی ایسا کیا۔ اگر کسی میں قوتِ برداشت ہو تو ایسا کرنا بھی جائز ہے لیکن یہ ہم جیسے کمزوروں کے لئے نہیں کیونکہ ہم میں قوت نہیں۔ اگر کوئی نقل بھی اُتارنا چاہے تو مارا جائے گا۔ لہٰذا اس میں نقل بھی کرنی مناسب نہیں ہے۔

توکل پر ایک واقعہ

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک صاحب نے یہ بات سنی کہ اللہ کے بعض قوی بندے اللہ پر توکل کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کو نوازتے ضرور ہیں۔ اگرچہ کچھ دیر سویر ہو جائے لیکن پھر بھی وہ فراخی سے زندگی گزارتے ہیں۔ چنانچہ ان صاحب نے بھی یہ کام کرنے کا ارادہ کیا اور جنگل میں جا کر بیٹھ گئے۔ اب ایک دن، دو دن، حتیٰ کہ تین دن گزر گئے اور فاقے پر فاقے ہو رہے ہیں اور کوئی بھی نہیں آ رہا، تو طرح طرح کے خیالات دل میں پیدا ہونے لگے، لیکن جب تیسرا دن گزر گیا تو دیکھا کہ ایک صاحب خوان لیے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی جان میں جان آئی کہ اب کام بن گیا، لیکن اس شخص نے وہاں پہنچ کر یہ کیا کہ پیٹھ پھیر کر بیٹھ کر خود کھانے لگا، اب

یہ تو سمجھے تھے کہ میرے لئے آرہا ہے اور اس نے خود کھانا شروع کر دیا تو تھوڑی دیر تک تو وہ دیکھتے رہے لیکن پھر رہا نہ گیا اور پیٹھ پھیر کر کھنکھارنا شروع کیا تا کہ اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا سکیں۔ چنانچہ اس نے مڑکر جب انہیں دیکھا تو کہا: آیئے آپ بھی شریک ہو جایئے، لہٰذا یہ بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ بعد میں ان صاحب کی کسی سے ملاقات ہوئی تو اس سے کہنے لگے کہ ہم نے تو یہ سنا تھا کہ توکل میں اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں سے انتظام کر ہی دیتے ہیں تو میرا تجربہ یہ ہے کہ ایسا ہو تو جاتا ہے لیکن کچھ کھنکھارنا پڑتا ہے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ایسے توکل سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ انسان محنت مزدوری کر کے کما کر کھائے اور جس توکل میں کھنکھارنا پڑے اس توکل سے اللہ کی پناہ!

لہٰذا ہم جیسے کمزور لوگوں کے لئے یہ راستہ نہیں ہے بلکہ ہمارے لئے راستہ یہی ہے کہ ہم اسباب اختیار کریں، لیکن اس پر مکمل بھروسہ ہونے کے بجائے اللہ کی ذات پر ہو۔ جن کو نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں یوں تعبیر فرمایا:

((اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوْا عَلَیْہِ))

''اعتدال کے ساتھ کسی چیز کی جستجو کرو اور اللہ پر بھروسہ کرو''(۱)

ایسے اسباب توکل کے منافی ہیں

(۳) اسباب کی تیسری قسم وہمی قسم کے اسباب ہیں، یعنی انسان اس چکر میں پڑا رہے کہ فلاں زمین خریدوں گا پھر اس کو بیچ کر فلاں جاگیر خریدوں گا اور پھر اس سے فلاں چیز خریدوں گا، یعنی ہر وقت خیالی منصوبے بناتا رہے تو یہ توکل کے منافی ہے۔ لہٰذا چاہئے کہ کسی چیز کی جستجو میں اعتدال ہو لیکن اس قدر انہماک نہ ہو کہ اس کے علاوہ کسی اور طرف دھیان ہی نہ جائے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ اسباب کو ضرور اختیار کریں لیکن ایک تو اس میں انہماک نہ ہو، دوسرے یہ کہ بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہو اور اسی سے انسان مانگے۔ جس کا راستہ یہ ہے کہ جب کوئی تدبیر کرنی ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے کہ یا اللہ! میں یہ تدبیر تو کر رہا ہوں لیکن اس تدبیر کا نتیجہ نکالنا آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! اس کو کامیاب کر دیجئے۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے اس مختصر سے جملے میں بیان فرمایا:

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب الاقتصاد في طلب المعيشة، رقم: ٢١٣٥، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب أنه كان يقال الحمد لله الذي خلق كل شيء ......الخ، كنز العمال، رقم: ٩٢٩١

((اَللّٰهُمَّ هٰذَا الْجُهْدُ وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ)) (۱)

''اے اللہ! یہ میری کوشش ہے لیکن بھروسہ آپ ہی پر ہے''

تدبیر خواہ کسی بھی صورت میں ہو، چاہے وہ تدبیر ملازمت کی صورت میں ہو یا تجارت کی، حصولِ علم کی یا علاجِ مرض کی بہر صورت اس دعا کو پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیا کرو۔ انشاء اللہ توکل کی دولت حاصل ہو جائے گی۔

رجوع اِلی اللہ کی عادت اپناؤ

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ تم کہاں وہ مجاہدے کرو گے جو پہلے بزرگوں نے کیے، اس لئے تمہیں چھوٹے چھوٹے چٹکلے بتا دیتا ہوں کہ اگر ان پر عمل کر لو گے تو انشاء اللہ محروم نہیں رہو گے۔ وہ چٹکلے یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی عادت ڈالو۔ یہاں تک کہ اگر گھر سے کسی مقصد کے لئے نکلے ہو اور وہاں سواری کے ذریعے جانا ہے تو اس کو اختیار کرو لیکن دل میں یہ خیال لاؤ کہ اے اللہ! یہ سواری تو آپ نے مجھے دے دی اب اس کو منزلِ مقصود تک آپ پہنچا دیجئے۔ اور ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول دعا بھی پڑھ لیا کرو:

۱۔ ﴿سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ﴾ (۲)

''پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے اس سواری کو مسخر فرما دیا حالانکہ ہم اس کو قابو میں کرنے والے نہ تھے''

۲۔ ((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَّعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ))

''اے اللہ! سفر کے ساتھی بھی آپ ہیں اور میرے پیچھے میرے گھر والوں، مال اور اولاد کی نگہبانی کرنے والے بھی آپ ہیں۔ اے اللہ! میں سفر کی مشقت سے اور بری حالت کے دیکھنے سے اور گھر بار، اہل و عیال میں بری واپسی سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں'' (۳)

یعنی اسباب کو اختیار کرنا تو ہے لیکن نگاہ اللہ تعالیٰ پر ہے۔

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب منه، رقم: ۳۳۴۱

(۲) الزخرف: ۱۳، ۱۴

(۳) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب ما يقول إذا ركب إلى سفر الحج وغيره، رقم: ۲۳۹۲، سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما يقول إذا خرج مسافراً، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

توکل ایسے اختیار کرتے ہیں

غرض توکل کے بارے میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کے بعد میں نے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں دیکھی، یعنی اس کی وجہ سے جو درجات بلند ہوتے ہیں وہ کسی اور عمل کی بدولت نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس کو حاصل کرنا ہم سب کے لئے ضروری ہے جس کی ہمیں مشق کرنی ہے۔ ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے "الحمدللہ کبھی اس میں تخلف نہیں ہوتا کہ جب کوئی شخص سوال کرنے کے لئے آتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے تو میں فوراً دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ یا اللہ! نامعلوم یہ کیا سوال کر بیٹھے، اس سوال کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دے" اسی کو توکل کہا جاتا ہے۔

نبی اکرم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ سے مانگو!(۱) اسلئے کہ موچی اور پیسے سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ جب تک اس کا حکم نہیں ہوگا آپ کے جوتے کا تسمہ بھی نہیں لگے گا۔ اور اس کا اندازہ عمل کے وقت ہوگا کہ یہ کیسی عجیب دولت ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں یہ باتیں تم کو ایک لمحے میں بتا دیتا ہوں اسلئے اس کی قدر نہیں ہوتی، جب اس کی مشق کرو گے تب اس دولت کے بارے میں پتہ لگے گا۔

توکل کا ایک لازمی حصہ یہ بھی ہے کہ جو دل میں خیر کا کام آئے اس کو اللہ سے ضرور مانگو لیکن پھر اللہ کے فیصلے پر راضی بھی رہو۔ اسی کو "رضا بالقضاء" کہا جاتا ہے۔ لہٰذا جب اللہ جل شانہ کی طرف سے فیصلہ ہو جائے تو اس پر بہت زیادہ واویلا کرنے اور شور مچانے کی کوئی ضرورت نہیں، ہاں اگر طبعی طور پر فیصلہ دوسرا ہو جانے کی وجہ سے کچھ رنج و ملال ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھتے رہا کریں:

﴿وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾

"میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے"(۲)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ۳۳۶۰، سنن النسائی، کتاب الاستعاذة، باب الاستعاذة من الحور بعد الکور، رقم: ۵۴۰۳، سنن أبی داؤد، کتاب الجهاد، باب ما یقول الرجل إذا سافر، رقم: ۲۲۳۱، سنن ابن ماجه، کتاب الدعاء، باب ما یدعو به الرجل إذا سافر، رقم: ۳۸۷۸

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب یسأل الحاجة مهما صغرت، رقم: ۳۵۳۶

(۲) المؤمن: ٤٤

اللہ کے لئے جینا مرنا ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

عرصۂ طویل کے بعد آپ حضرات سے ملاقات کا موقع مل رہا ہے اور شاید اس سے قبل اتنا لمبا عرصہ نہ ہوا ہو۔ مختلف سفر اور مختلف اعذار کی وجہ سے حاضری نہ ہو سکی، لیکن الحمد للہ مؤمن کا کسی بھی حال میں گھاٹا نہیں بشرطیکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ایمانِ کامل عطا فرمادیں اور صحیح فکر و عمل عطا فرمائیں۔ انسان جس حال میں ہو اگر اس حال کے مناسب انسان کام کرتا رہے تو یہ سب دین کا حصہ ہے۔

یہ جو ہم قربانی کرتے ہوئے ایک آیت کریمہ پڑھتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ہے کہ قربانی کے وقت یہ آیت پڑھی جائے۔

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

"بیشک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کیلئے ہے"(۱)

یہ ایک عجیب و غریب آیت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں حضور اکرم ﷺ کو یہ حکم دیا ہے، آپ فرمادیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ نے قربانی کے وقت ان الفاظ کی ادائیگی کو سنت بنادیا۔

اخلاص کی برکت

دراصل اس آیت کریمہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مؤمن کا ہر لمحہ خواہ وہ کسی بھی حال میں ہو اللہ کے لئے ہونا چاہئے۔ جہاں تک عبادتوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو یہ آیت واضح ہی ہے کہ ہر عبادت اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ اور یہی معنی اخلاص کے بھی ہیں کہ انسان کی عبادت کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو جو ہر عبادت کی روح ہے۔ چنانچہ اگر کسی مختصر سی عبادت میں بھی اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ

☆ اصلاحی مواعظ (۳/ ۱۱۱ تا ۱۲۶)

(۱) الأنعام: ۱۶۳

کے یہاں بہت زیادہ اجر و ثواب کا موجب ہے اور اگر بڑی سے بڑی عبادت میں اخلاص نہ ہو تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

اخلاص کی اہمیت پر ایک واقعہ

قربانی کا معنی عربی زبان میں یہ ہے کہ وہ چیز جس سے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے اور قرب حاصل ہوتا ہے اخلاص سے۔ پس اگر کوئی آدمی چھوٹی سی بھی قربانی کر دے لیکن اس میں اخلاص شامل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہے اور اگر بڑے سے بڑے جانور کی قربانی کی لیکن اس میں اخلاص شامل نہ تھا تو اس قربانی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں نے قربانی پیش کی جن میں سے ایک کا نام ہابیل تھا اور دوسرے کا قابیل۔ قابیل نے ایک موٹے تازے دنبے کی قربانی پیش کی اور ہابیل کو کوئی دنبہ وغیرہ میسر نہیں آیا تو اس زمانے میں اس بات کی بھی اجازت تھی کہ اگر نفلی قربانی ہو اور کوئی جانور میسر نہ ہو تو گندم کے خوشے قربانی کے طور پر دے دیئے جائیں۔ اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ جو قربانی اللہ تعالیٰ قبول فرما لیتے تھے اس کے لئے آسمان سے آگ اُترتی تھی اور اس کو جلا دیتی تھی، اور آگ نہ اُترنا اس بات کی علامت تھی کہ قربانی قبول نہیں ہے۔ تو ہابیل اور قابیل کی قربانی میں سے ہابیل کی قربانی کو آگ نے جلا دیا اور دنبہ یونہی پڑا رہ گیا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ﴾(۱)

''ہابیل اور قابیل نے قربانی پیش کی تو ان دونوں میں سے ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی''

اب قابیل کہ جس کی قربانی قبول نہیں ہوئی تھی اس نے ہابیل سے کہا کہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ قصہ تو طویل ہے لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بظاہر دیکھنے میں قابیل کی قربانی زیادہ قیمتی ہے اور ہابیل کی قربانی معمولی ہے لیکن اس کے باوجود ہابیل کی معمولی قربانی قبول ہوگئی۔ معلوم یہ ہوا کہ اخلاص بہت اہم چیز ہے۔

زندگی کا ہر کام اللہ کے لئے ہو

یاد رکھئے! کہ عبادات میں تو اخلاص ضروری ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے فرمایا ''إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي'' لیکن آگے جو عجیب بات ارشاد فرمائی وہ یہ ہے:

(۱) المائدۃ: ۲۷

﴿وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''میرا جینا مرنا بھی اللہ کے لئے ہے''

یعنی عبادات کے علاوہ تمام کام جو زندگی سے متعلق ہیں، وہ سب اللہ رب العالمین کے لئے ہوں۔ چنانچہ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، کمانا، ہنسنا اور بولنا سب اللہ کے لئے ہونا چاہئے۔ اگرچہ بظاہر یہ تمام کام اپنے نفس کے لئے نظر آرہے ہیں لیکن اگر انسان چاہے تو صحیح نیت کر کے اس کام کو اللہ تعالیٰ کے لئے بنا سکتا ہے اور جب وہ کام اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جاتا ہے تو وہ عبادت بن جاتی ہے اور پھر اس پر اجر و ثواب مرتب ہوتا ہے۔

نفس کا حق

مثلاً انسان بھوک کے تقاضے کی وجہ سے کچھ کھانا چاہتا ہے، اب بظاہر تو وہ کھانا ہی ہے اور نفس کے تقاضے کا عمل ہے۔ اب اس وقت ایک لمحے کے لئے رک کر یہ تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نفس کا بھی مجھ پر حق رکھا ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))

''تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے''(۱)

نفس کا حق یہ ہے کہ اسے مناسب غذا فراہم کی جائے کیونکہ یہ نفس میری ملکیت میں نہیں بلکہ یہ بھی دینے والے کی عطا ہے جو میرے پاس امانت ہے اور اس کو غذا اس نیت سے فراہم کی جائے تاکہ اس میں اللہ کی بندگی کی طاقت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کو بھوک لگی ہو اور کھانا بھی موجود ہو لیکن وہ اس کو نہ کھائے اور مسلسل بھوکا رہے اور اسی بھوک کے عالم میں بھوک کی وجہ سے وہ مر جائے، یاد رکھئے! وہ حرام موت مرا۔

یہ جان اللہ کی امانت ہے

اسی سے بھوک ہڑتال کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ بہت سے لوگ نہ کھانے کا ارادہ کر لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی جان کو اپنی ملکیت میں سمجھ رکھا ہے، اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ اور لوگوں میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ اگر بھوک ہڑتال کے دوران کوئی شخص مر جائے تو وہ ''شہیدِ اعظم'' کہلاتا ہے کہ اس نے اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہوئے جان دے دی اور یہ معلوم

(۱) سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۳۳۷، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب ما يؤمر به من القصد في الصلاة، ۱۱۶۲، مسند أحمد، رقم: ۲۵۱۰۴

نہیں ہوتا کہ وہ حرام موت مرا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ ہم نے یہ نفس جو تمہیں امانت کے طور پر دیا ہے تم پر اس کے کچھ حقوق ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يٰأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾

''اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو''(۱)

یہ نفس ہم نے تمہیں اس لئے دیا ہے کہ تم اسے اچھے سے اچھا کھلاؤ اور ساتھ ساتھ اچھے سے اچھا عمل بھی کرو۔ یہ نفس تمہیں اس لئے نہیں دیا کہ تم اسے بھوکا مار دو۔ لہٰذا یہ تصور کہ یہ نفس میری ملکیت ہے غلط ہے۔ جب بھوکا رہنے سے بچنا ضروری ہوا اور بھوکا رہنا بلاوجہ حرام ہوا تو مطلب یہ ہو گیا کہ کھانا واجب ہے۔ لہٰذا کھانا کھاتے وقت یہ نیت کرو کہ اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے فریضے کی وجہ سے میں کھا رہا ہوں تو یہ عمل اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگا اور اس پر اجر وثواب ہوگا۔ نیز یہ بھی نیت کرلو کہ جناب رسول اللہ ﷺ بھی کھانا کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ معترضین نے اعتراض کر دیا کہ کیسا پیغمبر ہے کہ ہماری طرح کھانا کھاتا ہے اور ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ آسمان سے کوئی فرشتہ پیغمبر بن کر نازل ہوگا جس کو کھانے پینے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ حالانکہ پیغمبر انسانوں میں اسی لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ کوئی اور مخلوق نہیں بلکہ تمہیں میں سے ایک فرد ہے اور جیسی خواہشات تمہاری ہیں اسی طرح اس کی بھی خواہشات ہیں اور اسی لحاظ سے یہ کھانا بھی کھاتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے کھانا کھانا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہوا۔

بسم اللہ پڑھنے کی وجہ

پھر کھانا کھاتے وقت ابتداء میں بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔ یہ بسم اللہ کا جو حکم ہے اس لئے نہیں کہ بسم اللہ کوئی منتر ہے بلکہ اس طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے ہے کہ میں جو کھانا کھا رہا ہوں وہ اللہ کی رضا کے لئے کھا رہا ہوں۔ یہ کھانا اسی کی عطا ہے، اسی کا حکم ہے اور اسی کے نبی ﷺ کی سنت ہے۔ پھر کھانا کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرو۔

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا))(۲)

تو یہ کھانا اللہ کے لئے ہو جائے گا۔ اسی طرح نیند آنے کے وقت سونے کا عمل بظاہر تو نفس کا

---

(۱) المؤمنون: ۵۱

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما یقول إذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۳۷۹، سنن ابن ماجہ، کتاب الأطعمة، باب ما یقال إذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۲۷٤، مسند أحمد، رقم: ۱۰۸٤٦

تقاضا ہے لیکن اگر یہ نیت کر لی جائے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))(۱)

''تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے''

تو یہ سونا بھی اللہ کے لئے ہو جائے گا۔ یہ جو سرکاری مشین اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے یہ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک تمہارا ساتھ دیتی ہے۔ اس کو نہ کسی سروس کی ضرورت ہے اور نہ تیل ڈالنے کی۔ لہٰذا اس کا حق یہ ہے کہ اس کو تھوڑا آرام بھی دو۔ اسی طرح مزدوری کے ذریعے بظاہر تو مقصد پیسے کمانا ہوتا ہے لیکن نیت یہ کی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس اور بیوی بچوں کے جو حقوق رکھے ہیں ان کی ادائیگی کے لئے کسبِ معاش بھی ضروری ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دوسرے فرائض کے بعد سب سے بڑا فریضہ حلال روزی کمانا ہے۔(۲)

تو اس نیت سے مزدوری اور تجارت وغیرہ بھی ثواب بن جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ صبح سے لے کر شام تک زندگی میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جس کو صحیح نیت کر کے اللہ کے لئے نہ بنایا جا سکے۔

موت اللہ کے لئے کیسے ہو؟

اور شانِ کریم کی آیت میں لفظ ''وَمَمَاتِیْ'' یعنی میری موت بھی اللہ کے لئے کا مطلب یہ ہے کہ یا تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا جان دیدے یا پھر اگر جہاد کا موقع نہیں ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ میرے حق میں بہتر سمجھیں گے مجھے موت عطا فرمادیں گے۔

اگر چہ موت کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن اسکی جگہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمادی

((اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مَا عَلِمْتَ الْحَيٰوةَ خَيْرًا لِيْ وَتَوَفَّنِيْ إِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَيْرًا لِيْ))(۳)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم، رقم: ۱۸۳۹، سنن النسائی، کتاب الصیام، باب صوم یوم وإفطار یوم، رقم: ۲۳۵۰

(۲) ((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ)) کنز العمال، رقم: ۹۲۳۱ (۱۶/۴)، کشف الخفاء، رقم: ۱۶۷۱ (۴۶/۲)، سنن البیهقی، رقم: ۱۲۰۳۰ (۲۴/۲)، الجامع الکبیر للسیوطی، رقم: ۳۵ (۱۴۰۸۵/۱)، جامع الأحادیث، رقم: ۱۳۹۳۷ (۱۲۸/۱۴)، مشکوٰۃ المصابیح، رقم: ۲۷۸۱ (۱۲۹/۲)، شعب الإیمان، رقم: ۸۷۴۱ (۴۲۱/۶)

(۳) سنن النسائی، کتاب السهو، باب نوع آخر، رقم: ۱۲۸۸، مسند أحمد، رقم: ۱۷۶۰۵

''اے اللہ! جب تک میرے حق میں زندگی بہتر ہے تب تک تو مجھے زندہ رکھ اور جب میرے حق میں موت بہتر ہو جائے تو تو مجھے موت دیدے''

پس جب انسان نے اپنی زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دی تو جینا بھی اللہ کے لئے ہوا اور مرنا بھی اللہ کے لئے ہوا۔

مؤمن کا کسی حال میں گھاٹا نہیں

ایک مرتبہ اس چیز کا ارادہ کر کے مشق کرنے کی ضرورت ہے کہ زندگی کے ہر کام میں اللہ کو راضی کرنے کی نیت کرو۔ اگر یہ کام کر لیا تو اس سے ہر جائز کام ثواب بن جاتا ہے کیونکہ مؤمن کا کسی حال میں گھاٹا نہیں۔ اگر اس کو کوئی خوشی ملتی ہے وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ عبادت ہوتا ہے۔ اگر اس کو غم لاحق ہو جائے، وہ اس پر صبر کرتا ہے اور "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور مشیت پر سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے تو پھر اس کی طرف قرآن حکیم کا یہ ارشاد متوجہ ہوتا ہے:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾(۱)

''صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا''

گویا جب اللہ کی خاطر کسی بھی چیز پر صبر کیا جاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ بے بہا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

سنت پر عمل کرنے والا قریب ہے

میں نے شاید اس سے قبل یہ واقعہ سنایا ہو کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک مشہور اور بڑے لاڈلے صحابی تھے۔ ان سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دِل کی باتیں بھی کہہ دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتے تھے۔

تقریباً ۹ ہجری کا واقعہ ہے کہ دینی مصلحت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان کو یمن بھیج دیا جائے کیونکہ یمن فتح ہو چکا تھا اور وہاں کسی ایسے حاکم کی ضرورت تھی جو حکومت بھی کرے اور لوگوں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ بھی انجام دے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ انتخاب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر پڑی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم یمن چلے جاؤ اور ان کو مدینہ منورہ سے اس شان کے ساتھ رخصت کیا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدل ان کے گھوڑے کی باگ تھامے انہیں کافی دور تک رخصت کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ

(۱) الزمر: ۱۰

بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میری زندگی اب اس دنیا میں تھوڑی ہی ہے۔ ادھر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی جلدی واپسی کی کوئی توقع نہ تھی۔ لہٰذا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چلتے چلتے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے معاذ! شاید یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہو اور اس کے بعد تم مجھے نہ دیکھ سکو۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اتنے جانثار صحابی اب تک نجانے کس طرح ضبط کر رہے تھے لیکن جب یہ جملہ سنا کہ اے معاذ! آج کے بعد شاید تم مجھے نہ دیکھ سکو تو اندر سے غم واندوہ کا لاوہ ایک دم پھوٹ پڑا اور حضرت معاذ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں بھی آنسو آنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرہ آبادی کی طرف پھیر لیا اور فرمایا: اے معاذ! اگر چہ تم مجھ سے جدا ہو رہے ہو لیکن یاد رکھو کہ جو شخص میری سنت پر عمل کرنے والا ہے وہ ہر وقت مجھ سے قریب ہے چاہے وہ دور ہی کیوں نہ ہو اور جو شخص میری سنت پر عمل نہیں کرتا وہ مجھ سے دور ہے چاہے وہ کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ (۱)

ایک عجیب واقعہ

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوتے تھے تو عام طور سے روضۂ اقدس کی جالی کے سامنے کچھ دور جو ایک ستون ہے اس کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے تھے، جالی کے قریب نہیں جاتے تھے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا کہ پتہ نہیں تمہارے دل کی کیا قساوت ہے کہ سب لوگ تو جالی کے قریب جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس تک پہنچ جاتے ہیں اور تم آگے نہیں بڑھ پاتے، پیچھے ہی رہتے ہو، تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے روضۂ اقدس میں سے آواز آ رہی ہو کہ جو شخص ہماری سنت پر عمل پیرا ہے وہ ہم سے قریب ہے خواہ ظاہری نظر میں ہم سے کتنے ہی فاصلے پر ہو، اور جو شخص ہماری سنت پر عمل پیرا نہیں وہ ہم سے دور ہے چاہے وہ ہمارے روضے کی جالیوں سے چمٹا ہوا ہو۔

حاصل کلام یہ کہ ایک مؤمن کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرتے ہوئے اللہ جل جلالہ کی رضامندی ہے۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا، نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

محبت کا اصل تقاضا یہ ہے

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھ لیجئے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

(۱) مختصر تاریخ دمشق (۱/۱۱۱ ۳۳)

صحبت سے فیض یاب ہوئے لیکن موت کے وقت یہ کیفیت ہے کہ کوئی تو قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے فوت ہورہا ہے اور کوئی سندھ میں آکر شہید ہورہا ہے۔ حالانکہ بظاہر محبت کا تقاضا تو یہ تھا کہ جہاں آپ ﷺ تشریف فرما ہیں انسان وہاں سے ہلے ہی نہ۔ لیکن وہ محبت کے اصل تقاضے کو جانتے تھے کہ محبت کا اصل تقاضا یہ نہیں ہے کہ محبوب سے چمٹے رہو بلکہ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ محبوب کی رضا کے مطابق کام کرو۔

عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

لہٰذا اگر ایک مؤمن اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے قریب ہے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی دور رہو۔

اللہ تعالیٰ کبھی اس طرح بھی نواز دیتے ہیں

حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ کا ایک واقعہ میں نے اپنے والد ماجد اور اپنے شیخ حضرت عارفی قدس اللہ اسرارہما سے سنا ہے کہ ایک شخص حضرت حاجی صاحب کے سامنے آکر یہ کہتا تھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ہر سال حج کرتے ہیں تو حسرت ہوتی ہے کہ لوگوں کو تو بار بار حاضری ہورہی ہے اور مجھے چونکہ وسائل میسر نہیں اس لئے حاضری کی توفیق نہیں ملتی۔ تو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ صرف مکہ اور مدینہ میں ہی ہیں یا یہاں بھی ہیں؟ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ ہر جگہ ہیں اور تم وسائل نہ ہونے کی وجہ سے وہاں نہ پہنچ پائے تو کیا اللہ تمہیں صرف اس وجہ سے محروم کردیں گے کہ تمہارے پاس پیسے نہیں تھے؟ تم اللہ کے ساتھ ایسی بدگمانی کرتے ہو؟ یاد رکھو! اگر تمہاری نیت یہ ہو کہ جب بھی وسائل مہیا ہوں گے تو انشاء اللہ وہاں حاضری دوں گا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں سے بھی حصہ عطا فرمائیں گے اور تمہیں محروم نہیں فرمائیں گے۔ ان کی شان تو یہ ہے کہ کبھی تو نیکی پر نواز دیتے ہیں اور کبھی نیکی کی حسرت پر انعام عطا فرمادیتے ہیں۔

نیکی کی حسرت پر لوہار کا درجہ بڑھ گیا

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو کسی شخص نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی رحمت کا معاملہ فرمایا لیکن وہ درجہ مجھے نصیب نہ ہوا جو میرے پڑوس میں رہنے والے لوہار کو ملا، کیونکہ اگرچہ وہ لوہار تھا لیکن جونہی اس کے کان میں "حی علی الصلوۃ" کی آواز پڑتی تو اگر اس نے ہتھوڑا سر پر بلند کررکھا ہوتا تو بجائے اس

کے کہ وہ لوہے پر دے مارتا، وہ ہتھوڑا پیچھے پھینک دیتا تھا اور نماز کے لئے چلا جاتا تھا اور اپنی بیوی سے یہ کہا کرتا تھا کہ ہم تو دن رات دنیاداری کے کام میں مشغول رہتے ہیں اس لئے ہمیں موقع نہیں ملتا کہ جس طرح یہ اللہ کے بندے ساری رات کھڑے ہوکر نماز پڑھتے رہتے ہیں اسی طرح ہم بھی پڑھتے۔ اگر ہمیں بھی فراغت ہوتی تو ہم بھی عبداللہ بن مبارک کی طرح رات کے وقت عبادت کرلیا کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تجھے تیری اسی حسرت پر نواز دیا اور تجھے وہ درجہ دیا جو عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو بھی نہ دیا۔

ایک بزرگ اور ایک عورت کی خواہش

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے اپنے ایک وعظ میں ارشاد فرمایا کہ ایک بزرگ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں بڑے خزائن سے نوازا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت بڑے بزرگ بھی سمجھے جاتے تھے۔ آخری عمر میں انہوں نے سوچا کہ مدینہ منورہ چلا جاؤں تاکہ وہیں پر موت آئے اور جنت البقیع کی مٹی نصیب ہو۔ چنانچہ وہ بزرگ وہاں جاکر مقیم ہوگئے۔ پھر ان کا انتقال ہوگیا اور انہیں جنت البقیع میں دفن کردیا گیا اور بظاہر ان کی آرزو پوری ہوگئی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد اس بزرگ کے مدفن کو کھودنے کی ضرورت کسی وجہ سے پیش آگئی، چنانچہ جب اسے کھود کر دیکھا تو وہ بزرگ وہاں سے غائب تھے اور ان کی جگہ ایک یورپین عورت پڑی ہوئی تھی۔ لوگ بڑے حیران و پریشان ہوئے اور یہ خبر سن کر بہت بڑا مجمع اسے دیکھنے کے لئے آگیا۔ اس مجمع میں شامل لوگوں نے دیکھا تو اس میں ایک شخص کچھ عرصہ فرانس میں رہ کر آیا ہوا تھا، اس نے کہا کہ میں اس عوت کو پہچانتا ہوں۔ یہ تو پیرس میں تھی اور مسلمان ہوگئی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ ہم نے تو اس جگہ ان بزرگ کو دفن کیا تھا، یہ عورت یہاں کیسے آگئی؟ پھر اس قصے کی تحقیق کی گئی۔ چنانچہ لوگوں نے ان کی بیوی سے اس بارے میں پوچھا کہ کیا کوئی خاص بات ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں یہاں دفن ہونے کی فضیلت سے محروم رکھا؟ تو انہوں نے کہا: ویسے تو وہ بزرگ آدمی تھے، البتہ ان میں ایک یہ بات تھی کہ کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ اسلام میں ساری باتیں تو بہت اچھی ہیں لیکن غسلِ جنابت کی پابندی بڑی کٹھن ہے، جبکہ عیسائی مذہب میں یہ بات اچھی ہے کہ اس میں غسلِ جنابت فرض نہیں، اور اس عورت کے متعلق اس شخص نے بتایا کہ اس عورت کی مسلمان ہونے کے بعد یہ خواہش تھی کہ کاش! میں کسی طرح مدینہ منورہ جاکر مروں اور جنت البقیع میرا مدفن ہو، تو اللہ تعالیٰ نے دفن کے بعد بھی اس عورت کی حسرت کو اس طرح پورا کیا کہ اس کو اندر ہی اندر جنت البقیع منتقل فرمادیا۔

لہٰذا نیک کام کی توفیق ہوجائے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اور جو کام بن نہ پڑے تو کم از کم دل

میں یہ ہمت رکھو کہ اگر وسائل میسر آتے تو میں یہ کام کرتا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں نوازنے میں کوئی کمی نہیں۔

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

روزانہ کا معمول

میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم نمازِ فجر پڑھ چکو تو ایک مرتبہ دل سے نیت کرو کہ آج میں جو کام بھی کروں گا وہ اللہ کے لئے کروں گا۔ اس کے بعد جب اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے نکلنے لگو تو یہ نیت کرلو کہ میں اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے فریضے کو ادا کرنے جارہا ہوں۔ اس سے خود بخود دل میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ یہ کام میں اللہ کے لئے کررہا ہوں۔ لہٰذا اس کے عائد کیے ہوئے احکام کے مطابق کروں گا۔ پھر وہ شخص رشوت، جھوٹ، فریب، دھوکے وہی وغیرہ چیزوں کے ارتکاب میں مبتلا نہ ہوگا۔ پھر جب گھر واپس آجاؤ تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہ نیت کرلو کہ میں اپنے گھر والوں سے گفتگو، ہنسنا بولنا اللہ کے حکم کی وجہ سے کروں گا۔ پھر رات کے وقت اس بات کا جائزہ لو کہ میں اپنی نیت کے مطابق کام میں مشغول رہا یا نہیں۔ جتنے کام نیت کے مطابق ہوئے اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اور جو نیت کے مطابق نہ ہو سکے اس پر استغفار کرو۔ اس استغفار و توبہ کی برکت سے ایک درجہ بلند ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت نصیب ہوگی اور توبہ اللہ تعالیٰ کو بڑی محبوب ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

یہ اپنے روزانہ کا معمول بنالو اور صبح کو اُٹھ کر یہ آیت پڑھ لو:

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ﴾(۱)

اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ ان شاء اللہ رفتہ رفتہ بھٹکنے کے مواقع ختم ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جو شخص اس کے راستے پر چلنا شروع کرے تو وہ گرتا پڑتا منزل تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ جو شخص ہمارے راستے میں کوشش کرتا ہے ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے راستے پر لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۲)

(۱) الأنعام: ۱۶۳ (۲) العنکبوت: ۶۹

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بچہ جب چلنا شروع کرتا ہے تو ایک دم ہی چلنا شروع نہیں کر دیتا بلکہ گرتے پڑتے چلتا ہے تو سامنے سے ماں باپ اسے بلاتے ہیں، جب وہ چلتے چلتے گرنے لگتا ہے تو ماں باپ اسے آگے بڑھ کر پکڑ لیتے ہیں اور اسے گرنے نہیں دیتے، تو پھر ارحم الراحمین اپنے بندوں کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا کی خاطر عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور اپنی رضا کی خاطر جینے اور مرنے کا جذبہ عطا فرمائیں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

اللہ کا شکر ادا کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۭ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ﴾[1] صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمِ.

پچھلی مجلس میں میں نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ ہم اپنی گفتگو اور سوچ بچار کا آغاز سورۃ فاتحہ سے کریں گے کیونکہ اللہ جل جلالہ نے بھی اپنی کتاب کا آغاز سورۃ فاتحہ سے فرمایا ہے۔

اور تمام مفسرین اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۃ فاتحہ پورے قرآن کا عطر اور نچوڑ ہے، اور اسی وجہ سے ہر مسلمان پانچ وقت کی نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے، اور اس کو پڑھنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ جب اس کلام کی ابتدائی منزل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے صحیح فہم عطا فرمائیں گے اور انشاء اللہ اس کی برکات عمل کی صورت میں بھی نمودار ہوں گی۔

رحمٰن اور رحیم، دو صفات

پچھلے اجتماع میں میں نے مختصراً بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پر کچھ بیان کیا تھا۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے صرف ایک حصہ کا پچھلی مرتبہ بیان ہوا تھا وہ ہے بسم اللہ، یعنی "اللہ کے نام پر شروع کرتا ہوں"۔ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی دو صفتیں بیان ہو رہی ہیں، ایک رحمٰن دوسرے رحیم، یعنی اس اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے۔ یہ جو دو صفتیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی بیان فرمائی گئیں ہیں یہ حضورِ اقدس ﷺ کی تشریف آوری کا امتیاز ہیں۔

☆ اصلاحی مواعظ (۳/۳۹ تا ۴۷)، جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور۔

(۱) الفاتحة: ۱ تا ۷

مشرکین بھی اپنے کام کی ابتداء اللہ کے نام سے کرتے تھے

حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے جو مشرکین تھے وہ بھی اللہ کے وجود کے قائل تھے، اور نہ صرف قائل تھے بلکہ ان کا معمول یہ تھا کہ جب بھی کوئی کام شروع کرتے تو وہ بھی اللہ کے نام سے شروع کیا کرتے تھے، اور اللہ کا نام لینے کے لئے ان کے ہاں جو جملہ مقرر تھا وہ تھا باسمك اللّٰهم کہ اے اللہ ہم آپ کے نام سے شروع کرتے ہیں، تو اللہ کے نام سے تو وہ بھی شروع کرتے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حضور ﷺ کا خاص امتیاز

لیکن جب سرورِ دو عالم ﷺ تشریف لائے تو باسمك اللّٰهم کے بجائے فرمایا کہ یوں کہو کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، یہ تبدیلی پیدا فرمائی۔ اس تبدیلی میں جو بنیادی امتیاز ہے وہ الرحمٰن الرحیم کی صفت ہے ورنہ اللہ کا نام تو مشرکین بھی لیتے تھے، البتہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ الرحمٰن الرحیم کا اضافہ یہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ہوا۔ چونکہ یہ دونوں صفتیں الرحمٰن الرحیم آگے سورۃ فاتحہ میں بھی آرہی ہیں اس لئے ان کے متعلق جو بات ہے اسے میں اس آیت تک موقوف کررہا ہوں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اب جو سورۃ فاتحہ شروع ہورہی ہے اس کی پہلی آیت ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، یہ سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت ہے جس سے سورۃ فاتحہ شروع کی گئی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے معنی یہ ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا صحیح مفہوم اگر انسان کے دل میں بیٹھ جائے تو اس کے سارے معاملات خود بخود درست ہوجائیں گے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم شروع ہورہا ہے۔ اور قرآن ایک خاص پیغام، ایک خاص تعلیم اور ایک خاص ہدایت لے کر آیا ہے، اور وہ تعلیم اور ہدایت وہ ہے جس میں عقائد بھی ہیں، توحید اور رسالت کی دعوت بھی ہے اور آخرت کی دعوت بھی ہے، اس میں عبادات بھی ہیں، نماز بھی ہے، روزہ بھی ہے، زکوٰۃ بھی ہے اور حج بھی ہے۔ اس میں معاملات بھی ہیں، جائز و ناجائز، حلال اور حرام اور بیع و شراء وغیرہ بھی اس میں موجود ہیں، اس میں معاشرت بھی ہے کہ ایک دوسرے سے کس طریقہ سے ملنا چاہئے، اس میں اخلاق بھی ہیں کہ کونسے اخلاق انسان کو اختیار کرنے چاہئیں اور کون سے نہیں، یہ ساری تفصیلات اس پیغام ہدایت میں موجود ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ قرآن شروع

ہو رہا ہے سورۃ فاتحہ سے، تو اس کی ابتدا میں نہ عقائد کا کوئی مسئلہ بیان ہوا، نہ توحید و رسالت کا، نہ آخرت کا، نہ نماز کا حکم، نہ روزے کا حکم، نہ زکوٰۃ کا حکم اور نہ حج کا کوئی حکم، بلکہ شروع یہاں سے کیا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رب ہے تمام جہانوں کا۔ اس میں کیا راز ہے کہ سارے مسائل اور سارے احکامات کو چھوڑ کر ابتدا کی جارہی ہے اللہ رب العالمین کی تعریف سے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد سے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے شکر سے۔ اس سے درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے اور راز اس میں یہ ہے (واللہ سبحانہ اعلم) کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا صحیح مفہوم اگر انسان کے دل میں بیٹھ جائے اور ذہن نشین ہو جائے اور یہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا فقرہ جو پیغام دے رہا ہے اس پیغام کو اگر انسان اپنے اندر جذب کرلے تو سارے عقائد، ساری عبادات، سارے معاملات، سارے اخلاق اور ساری معاشرت، خود بخود درست ہو جائے گی۔ اگر انسان اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا صحیح مفہوم سمجھ لے اور اس سے نکلنے والے پیغام کو اپنے اندر جذب کرلے تو اس کے سارے کے سارے معاملات خود بخود درست ہو جائیں گے، اس لئے سب کو چھوڑ کر بات اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے شروع کی گئی۔

ہر چیز کی تعریف درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے

یہاں بات سمجھنے کی یہ ہے کہ اس میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہہ کر ایک دعویٰ کیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے معنی یہ ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اور اس کائنات میں کوئی دوسرا حقیقی معنی میں تعریف کے لائق نہیں ہے، اگر کوئی ہے تو صرف اللہ جل جلالہ کی ذات ہے۔ اور ساتھ میں یہ جملہ خبریہ بھی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی کی تعریف ہوگی حقیقت میں وہ تعریف اللہ رب العالمین کی ہی ہوگی، چاہے تعریف کرنے والا اللہ کے نام کے بجائے کسی اور کا نام لے رہا ہو۔ اس لئے کہ ایک انسان کی عام عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جب کسی چیز کی تعریف کی جائے حقیقت میں وہ تعریف اس چیز کی نہیں ہوتی بلکہ وہ تعریف اس چیز کے بنانے والے کی ہوتی ہے۔ اگر آپ لاہور کی شاہی مسجد کی تعریف کریں کہ بڑی عالیشان مسجد ہے، بڑی شاندار بنائی گئی ہے، اس کا نقشہ بڑا اعلیٰ درجہ کا تیار کیا گیا ہے، یہ بڑی مستحکم ہے، جتنی چاہے آپ تعریف کرلیں وہ تعریف نہ اس پتھر کی ہے، نہ اس عمارت کی ہے، نہ اس مینار کی ہے اور نہ اس گنبد کی ہے، حقیقت میں تعریف اس معمار کی ہے کہ جس نے یہ شاہی مسجد کا نقشہ بنایا اور اس کو اس شاندار اعلیٰ طریقہ سے تعمیر کیا۔

اگر آپ کسی کپڑے کی تعریف کرتے ہیں تو حقیقت میں تعریف اس کپڑے کی نہیں ہوتی کہ کپڑا بڑا خوبصورت ہے، بڑا شاندار لباس ہے، حقیقت میں یہ تعریف اس شخص کی ہے کہ جس نے اس کپڑے کو بنایا یا اس کا ڈیزائن تیار کیا۔ تو دنیا میں جس کسی کی بھی چیز کی تعریف ہوگی تو وہ درحقیقت اس

چیز کی نہیں بلکہ اس کے بنانے والے کی تعریف ہوگی کہ جس نے وہ چیز بنائی۔ پھر اس کائنات کی ہر چیز کے اندر یہ حکم جاری ہوگا، لہٰذا اگر آپ نے شاہی مسجد کی تعریف کی ہے تو شاہی مسجد کی تعریف درحقیقت اس کے معمار کی تعریف ہے۔ لیکن معمار کے پاس وہ ذہن کہاں سے آیا، معمار کے پاس وہ سوچ کہاں سے آئی، اس کے دل میں یہ ڈیزائن کس نے ڈالا اور اس کو یہ قوتِ کارکردگی کس نے عطا کی، کہ اتنی عالیشان عمارت کھڑی کردی، درحقیقت اگر غور کرو گے تو آخر میں یہی بات آئے گی کہ وہ معمار کی تعریف درحقیقت معمار کی تعریف نہیں ہے بلکہ معمار کے بنانے والے کی تعریف ہے کہ جس نے اس معمار کو بنایا، جس نے اس معمار کا ذہن تیار کیا اور جس نے اس معمار کے ذہن کی تخلیق کی۔

سائنسدانوں کی ترقی کی تعریف درحقیقت اللہ کی تعریف ہے

آج دنیا میں سائنسدانوں کی تعریفیں ہو رہی ہیں کہ انہوں نے سائنس کو عروج اور کمال پر پہنچایا اور واقع میں پہنچا دیا اور دنیا میں انقلاب برپا کردیا، کمپیوٹرز کے ذریعہ انسان کے دماغ کا کام کیا جارہا ہے اور روبوٹ تیار ہو رہے ہیں، وہ انسان کے طریقہ سے کام کررہے ہیں، انسان چاند پر اور مریخ پر پہنچ رہا ہے، یہ ساری کی ساری جو ترقیات ہیں، یہ سائنسدانوں کی طرف منسوب کی جارہی ہیں اور یہ تعریف ساری دنیا میں ہو رہی ہے۔ جن آدمیوں کی نگاہیں محدود ہیں وہ ان سائنسدانوں پر پہنچ کر رک جاتی ہیں۔ لیکن جس کو اللہ نے نورِ بصیرت عطا کیا ہو وہ اس سے تھوڑا آگے بڑھتا ہے اور آگے بڑھ کر کہتا ہے، بیشک یہ ترقیات بڑی حیرت انگیز ہیں، بڑی شاندار ہیں اور ان سائنسدانوں نے یہ ترقیاں کی ہیں لیکن ان سائنسدانوں کے ذہن میں اس چھوٹے سے دماغ کے اندر اگر بھیجہ نکال کر دیکھا جائے تو شاید آدھے سیر کا بھی نہ ہو، اس چھوٹے سے دماغ کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا احکامات پیدا فرمادیئے، اس دماغ کے اندر اللہ تعالیٰ نے کیا کیا قوتیں عطا فرمادیں کہ اس دماغ کو کام میں لاکر انسان کہاں سے کہاں پہنچ گیا، تو اگر انسان حقیقت پسند نگاہ سے دیکھے تو یہ جتنی تعریفیں ہو رہی ہیں حقیقت میں یہ تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے یہ دماغ بنایا ہے۔

انسان کا دماغ ایک نعمت ہے

آج اس دماغ کا یہ حال ہے کہ سارے سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دماغ جو انسان کے اندر ہے اس میں ایک چھوٹا سا خلیہ ہے، وہ ایک ارب واقعات کو محفوظ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے، اور ایک انسان کے دماغ میں اربوں خلیات ہیں، ان خلیات کے ذریعہ انسان کو یادداشت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ جو ہوتا ہے کہ انسان کوئی چیز بھول گیا یا یادداشت جاتی رہی تو وہ خلیات ٹوٹتے پھوٹتے

رہتے ہیں، ان میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل ہوتا رہتا ہے، اگر وہ عمل ختم ہوگیا تو یادداشت جاتی رہی۔ ان خلیات کے اندر اربوں واقعات انسان کے چھوٹے سے دماغ میں محفوظ ہیں۔ اور اس چھوٹے سے دماغ کے اندر اب بھی سارے ڈاکٹر صاحبان اور میڈیکل سائنس کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ جتنا انسان کا دماغ ہے اس دماغ کا صرف ۱/۸ حصہ ایسا ہے کہ جس کے بارے میں ہمیں پتہ ہے کہ اس کا عمل یہ ہوتا ہے اور اس کا فنکشن یہ ہے کہ یہ فلاں فلاں کام کرتا ہے، باقی انسان کے دماغ کے سات حصے ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں معلوم نہیں کہ یہ کیا کام کرتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں اگر کوئی خرابی وہاں پیدا ہوجائے تو کوئی ڈاکٹر اس کو چھونے پر بھی تیار نہیں ہوتا، اس حصہ کو چھوکر نہ جانے انسان کے جسم کی کونسی صلاحیت ختم ہوجائے گی۔ تو اس چھوٹے سے دماغ کے بھی سات حصے غیر معلوم ہیں اور صرف ایک حصہ معلوم ہوا ہے۔ اس ایک حصہ سے انسان کام لے کر کہاں سے کہاں پہنچ رہا ہے اور اس دماغ کے ذریعہ سے کیا کچھ ترقیات کررہا ہے۔ بیشک یہ ترقیات ہیں لیکن ذرا اس بنانے والے کو تو دیکھو جس نے انسان کو یہ دماغ عطا فرمایا اور اس دماغ کے بل بوتے پر اس نے کائنات کو مسخر کر کے رکھ دیا ہے۔

اللہ نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کے لئے مسخر کردیا

ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾(۱)

''زمین اور آسمان میں جو بھی چیزیں ہیں سب تمہارے لئے مسخر کردیں ہیں'' صرف اور صرف اسی دماغ کے بل بوتے پر۔

میرے والد ماجد قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو ہم سواری پر بیٹھتے ہیں تو دعاء یہ تلقین فرمائی گئی کہ ہر سواری پر بیٹھتے ہوئے یہ دعاء پڑھ لو:

﴿سُبْحَانَ الَّذِىْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ﴾(۲)

''پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے یہ سواری مسخر کردی''

مسخر کرنے کے معنی ہیں کہ رام کردی یعنی ہمارے تابع کردی اور ہم اس سے کام لے رہے ہیں۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے اب تو خیر ریلوں اور ہوائی جہازوں کا زمانہ ہے، پہلے زمانہ میں گھوڑے اور گدھے اس کام کے لئے استعمال کیے جاتے تھے، تو گھوڑے کا حال یہ ہے کہ ایک

(۱) البقرۃ: ۲۹ (۲) الزخرف: ۱۳، ۱۴

چھوٹا سا بچہ اس کے منہ میں لگام ڈال کر اس کے اوپر سوار ہو کر جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ کبھی گھوڑے نے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ بھئی میں تجھ سے دس گنا زیادہ طاقتور ہوں، یہ کیا ظلم ہے کہ تو میرے اوپر سواری کرتا ہے، میں تیرے اوپر سواری کیوں نہ کروں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان کے لئے مسخر کر دیا کہ اس گھوڑے کے منہ میں لگام ڈال کر جہاں چاہے لے جا سکتا ہے یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کرشمہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو قوت کے اعتبار سے تو گھوڑے کی قوت کہاں اور انسان کی قوت کہاں۔ آج ساری قوتیں ہارس پاور کی شکل میں ناپی جارہی ہیں کہ اس میں اتنے ہارس پاور پائے جاتے ہیں، اس میں اتنے ہارس پاور پائے جاتے ہیں۔ لیکن انسان کو یہ دماغ عطا فرما کر اور اس دماغ کے اندر عقل عطاء فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو ایسا بنادیا کہ وہ ساری کائنات کو مسخر کرتا جارہا ہے۔ تو حقیقت میں اس کائنات میں جس چیز کی بھی تعریف کرو گے تو وہ تعریف آخر میں جا کر اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اللہ جل جلالہ کی تعریف ہے، اس لئے فرمایا جارہا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی تمام تعریفیں رب العالمین کے لئے ہیں۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" ایک دعویٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یہ ایک دعویٰ ہے اور رب العالمین جو اگلا جملہ ہے یہ اس دعویٰ کی دلیل ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا، انسانوں کے عالم کا بھی، حیوانوں کے عالم کا بھی، جنات کے عالم کا بھی، آسمانوں کا بھی اور زمینوں کا بھی۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" سے قرآن کا آغاز

دوسری بات یہ کہ قرآن کریم کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع کر کے اس بات پر متنبہ فرمادیا کہ اگر اللہ کے حکم کے مطابق اور اس کی رضا کے مطابق اس دنیا میں زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اس کا پہلا قدم اور اس کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ اللہ کی تعریف کرنے اور شکر کرنے کی عادت ڈالو۔

شکر اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے کی کنجی

اللہ کا شکر اور اس کی حمد اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پر عمل کرنے کی کنجی ہے۔ وہ اس طرح کہ اسلام کی جتنی بھی تعلیمات ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، حج کرو، اور فلاں چیز حلال ہے فلاں چیز حرام ہے، یہ جو ساری پابندیاں اور قیود بظاہر آدمی کو مشکل لگتی ہیں، نفس تقاضا کرتا ہے کہ یہ کام کروں لیکن اسلام نے اس کو حرام قرار دے دیا، دل چاہ رہا ہے کہ سوؤں لیکن اسلام نے حکم دیا کہ نہیں

اُٹھو نماز پڑھو، بظاہر یہ ساری چیزیں مشکل لگتی ہیں اور اللہ کا شکر اور اس کی حمد یہ کنجی ہے اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پر عمل کرنے کی۔

اللہ تعالیٰ کی محبت سے تمام مشکلات آسان ہو جائیں گی

بظاہر تو اسلام کے ان احکامات پر عمل کرنا بہت مشکل لگتا ہے، اس مشکل کو دور کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرو۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آجائے گی تو یہ ساری مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ کیونکہ محبت ہی وہ چیز ہے جو انسان کے لئے دشواریوں کو آسان بناتی ہے، مشکلات کو حل کرتی ہے اور محبت کے ذریعہ انسان بڑے سے بڑے سخت کام کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ دیکھو کہ صبح سویرے اُٹھنا اور اُٹھتے ہی بس پکڑنے کے لئے جلدی سے گھر سے نکلنا، اور دفتر میں جا کر آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ادا کرنا اور مسلسل محنت کرنا اور وہاں سے واپس شام کو ایسے وقت میں واپس آنا کہ جس وقت بچے سو گئے ہوں، سارا دن محنت کے اندر گزارنا مشکل کام ہے کہ نہیں؟ لیکن چونکہ دل میں محبت اس بات کی ہے کہ سارا مہینہ کام کرنے کے بعد جب اگلا مہینہ شروع ہو گا تو اس وقت تنخواہ ملے گی اور اس تنخواہ کی محبت سے ساری تلخیاں برداشت ہو جاتی ہیں اور ساری مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ بھائی یہ تو بڑا مشکل کام ہے صبح سویرے اُٹھتے ہو اور سارا دن محنت کرتے ہو اور رات کو کہیں جا کر گھر میں پہنچتے ہو، یہ سب مشکل کام ہے اس لئے یہ سب مشکل کام چھوڑ دو، لاؤ تمہارا کام چھڑوا دیتے ہیں تو وہ کہے گا کہ خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے، یہ مصیبت میرے لئے بہتر ہے بہ نسبت اس کام کے کہ آپ میرے روزگار پر لات ماردیں اور میری ملازمت چھڑوا دیں۔ تاجر آدمی دن رات اپنی محنت کے اندر لگا ہوا ہے لیکن ساری محنت برداشت اس لئے کر رہا ہے کہ اس نفع سے محبت ہے جو اس کے نتیجہ میں ملنے والا ہے۔ تو محبت وہ چیز ہوتی ہے جو بڑی سے بڑی چیز کو آسان کر دیتی ہے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "از محبت تلخہا شیریں شود" کہ محبت کے ذریعہ تلخ سے تلخ کام اور مشکل سے مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔

محبت کی ایک عجیب مثال

دیکھو ماں ہے جو اپنے بچہ کو پالتی ہے اور اس طرح پالتی ہے کہ سردی کا موسم ہے، جاڑے کا موسم ہے، کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے اور رات کا وقت ہے، ماں لحاف میں لیٹی ہوئی ہے اور بچہ نے کوئی پیشاب پاخانہ وغیرہ کر دیا۔ اب وہ اس سردی کے اندر اُٹھ کر جا رہی ہے اس کو دھو رہی ہے، اور یہ

کام اس کے لئے کس قدر مشکل کام ہے جو وہ کر رہی ہے، کوئی کہے کہ یہ مشکل تمہیں اس بچہ کی خاطر پڑی ہے، لاؤ دعا کرتے ہیں کہ یہ بچہ تمہارا نہ رہے کہ جس نے تمہیں اس مشکل میں ڈال دیا یا آئندہ تمہارا کوئی بچہ نہ ہو جو تمہیں اس مشکل میں ڈالے، تو وہ ماں کہے گی، ہزار ہا ایسی مشکلات میرے لئے آسان ہیں کیونکہ اس بچہ سے مجھے محبت اور تعلق ہے۔ تو ساری مشکلات ساری پریشانیاں درحقیقت جو چیز آسان کر دیتی ہے وہ ہے محبت، جس دن یہ محبت پیدا ہوگئی تو ساری مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ ہمارے لئے شریعت کے جتنے احکام ہیں، حلال و حرام، جائز ناجائز، فرض، واجب، سنت، مستحب وغیرہ، ان کو آسان بنانے کا ایک ہی نسخہ ہے اور وہ نسخہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت ہمارے دل میں پیدا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ محبت ہم سب کو عطا فرمادیں تو یقین رکھو کہ سب مشقتیں آسان ہو جائیں گی۔

احکامات پر عمل کرنے کا آسان ترین نسخہ اللہ کی محبت ہے

حضور نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

((قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ))(۱)

''میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز ہے''

حالانکہ نماز ویسے تو مشقت ہی کا کام ہے لیکن وہ آسان اس لئے ہوگئی کہ اس کے اندر لطف آنے لگا اور اس کے اندر لذت حاصل ہونے لگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پناہ گزیر ہے اور اس محبت کے نتیجہ میں ساری مشقتیں آسان ہیں، رات کو اُٹھنا بھی مشکل نہیں، پھر صبح سویرے اُٹھنا بھی مشکل نہیں، پھر روزے رکھنا بھی مشکل نہیں، پھر انسان کو اس مشقت میں بھی لذت آتی ہے کہ یہ مشقت میں اپنے محبوب کی خاطر برداشت کر رہا ہوں، جب آدمی یہ تصور کرتا ہے کہ یہ میں اپنے محبوب کی خاطر برداشت کر رہا ہوں تو اس مشقت میں بھی مزا آتا ہے۔ تو سارے احکامِ شریعت پر عمل کرنے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت دل میں پیدا ہو جائے۔

محبت حاصل کرنے کا طریقہ شکر ہے

اللہ کی محبت کیسے حاصل ہو کہ جس سے یہ سارے کام آسان ہو جائیں، اس محبت کو حاصل کرنے کا سب سے آسان اور بہترین نسخہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو! جتنا اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو گے، اس کی نعمتوں کا استحضار کرو گے، اس کی نعمتوں کو سوچو گے اور اس کا دھیان کرو

---

(۱) سنن النسائي، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء، رقم: ۳۸۷۸، مسند أحمد، رقم: ۱۱۸٤۵

گے اتنی ہی محبت میں ترقی ہوتی جائے گی۔ آپ اپنے روزمرہ زندگی کی مثال دیکھ لیجئے کہ جب آپ ماں کو دیکھتے ہیں کہ اس نے میری خاطر کیا کیا مشقتیں برداشت کیں، کتنے دن تک مجھے پیٹ میں رکھا، اس نے کتنی مشکلات برداشت کیں، اس نے کتنی مشکل سے مجھے پالا، اور اب جب بھی کوئی مصیبت کا موقع آتا ہے تو یہ ماں میرے لئے اپنی جان بھی حاضر کر دیتی ہے۔ جب آدمی اس کی قربانیوں کو دیکھتا ہے اور اس کے انعامات کو دیکھتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کو اس سے محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ باپ سے بھی محبت پیدا ہوتی ہے کیونکہ دیکھتا ہے کہ باپ نے میرے ساتھ کیا کیا احسانات کیے ہیں۔ جتنے انسان کے محسن ہیں ان کے احسانات کا انسان جتنا تصور کرے گا اتنی ہی ان سے محبت پیدا ہوگی۔ ایک آدمی ہے جو روز صبح کو آپ کے گھر میں ہدیہ لا کر ڈال دیتا ہے، آپ نے چاہے اس کو دیکھا بھی نہ ہو لیکن خود بخود آپ کے دل میں محبت پیدا ہو جائے گی کہ کون ایسا مخلص آدمی ہے جو روزانہ مجھے کوئی نہ کوئی تحفہ دے کر چلا جاتا ہے۔ تو اللہ جل جلالہ کے انعامات کا جتنا استحضار انسان کرے گا اور جتنا اس کا دھیان کرے گا تو اتنی ہی اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت پیدا ہو جائے گی، اور محبت پیدا کرنے کا نسخہ ہے شکر۔ گویا دین پر عمل کرنے کا آسان نسخہ ہے محبت پیدا کرنا اور محبت حاصل کرنے کا آسان ترین نسخہ ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا۔ اسی لئے قرآن نے جگہ جگہ حکم دیا ہے کہ شکر ادا کرو۔ ایک جگہ آتا ہے:

﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ؕ وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ﴾(۱)

''اے داؤد کے اہل خاندان شکر کرو اللہ کا اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے بہت ہی کم ہیں''

غرض قرآن کا آغاز کیا جا رہا ہے اللہ کے شکر سے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ اے انسان اگر تو اپنی خیر چاہتا ہے تو اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ اللہ کا شکر گذار بندہ بن جا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کر، اس کو سوچ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر اور یہ کہہ کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور یہی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کا نسخہ ہے۔

انسان مشکل میں اللہ کو پکارتا ہے

قرآن مجید نے جگہ جگہ انسان کی ایک خصلت بیان کی ہے اور قرآن نے جگہ جگہ اس کا ایک عجیب مزاج بیان فرمایا ہے کہ جب انسان کو کوئی مشکل پڑتی ہے تو وہ اس مشکل میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے کہ اے اللہ! میں اس مشکل میں مبتلا ہو گیا ہوں یہ مجھ سے دور کر دیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

(۱) سبا: ۱۳

جب وہ مشکل کام اس سے دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے ہمیں پکارا ہی نہیں اور ہم سے کبھی اس مشکل کو دور کرنے کی درخواست کی ہی نہیں۔

دوسری خصلت انسان کی یہ ہے کہ اگر ہم نے انسان کو ہزار انعامات دیئے ہوں اور ایک تکلیف دے دی ہو تو انسان ان ہزار انعامات کو بھلا دے گا اور اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جائے گا کہ یہ تکلیف مجھے پہنچ گئی۔

مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکیمانہ بات

مجھے اپنے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بڑی حکیمانہ بات یاد آگئی کہ میری ایک ہمشیرہ ہیں جو الحمدللہ اب بھی حیات ہیں، ان کی عمر کے تقاضا سے ان کے دانت بار بار ٹوٹ رہے تھے اور کچھ دن بعد ایک نہ ایک دانت نکلوانا پڑتا تھا، تو ایک مرتبہ انہوں نے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ یہ دانت بھی بڑی عجیب چیز ہیں کہ یہ آتے ہوئے بھی تکلیف دیتے ہیں اور جاتے ہوئے بھی تکلیف دیتے ہیں کہ کبھی اس دانت میں درد ہو رہا ہے کبھی اس دانت میں درد ہو رہا ہے، کبھی اس دانت کو نکلوانا پڑتا ہے اور کبھی اس دانت کو نکلوانا پڑتا ہے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خدا کی بندی! تمہیں دانت کی دو ہی باتیں یاد آرہی ہیں کہ آتے ہوئے بھی اس نے تکلیف دی تھی اور جاتے ہوئے بھی اس نے تکلیف دی اور یہ جو پچاس سال تک اس سرکاری مشین سے فائدہ اٹھایا وہ تمہیں یاد نہ آیا۔ اس کا تو ذکر کر رہی ہو کہ اس نے آتے ہوئے بھی تکلیف دی اور جاتے ہوئے بھی تکلیف دی اور یہ درمیان میں جو عرصہ گزارا اس میں نجانے کتنی غذائیں کھائیں، کتنی لذتیں حاصل کیں، اس کا خیال نہیں آیا۔

اگر انسان کو اللہ والوں کی صحبت میسر نہ ہو اور اللہ والوں کی نگاہ نہ پڑی ہو تو انسان کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ ذرا سی تکلیف کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور ہزاروں نعمتیں جو عین اسی وقت اس انسان کے اوپر اللہ کی طرف سے بارش کی طرح برس رہی ہیں ان کو بھول جاتا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا:

﴿إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ﴾(۱)

''انسان بڑا ناشکرا ہے''

حضرت مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شکر کا ایک عجیب واقعہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات یاد آئی۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک استاذ

(۱) الحج: ٦٦

حضرت مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جو حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے اور بڑے عجیب وغریب بزرگ تھے۔ ان کے عجیب وغریب واقعات ہیں۔ ان کو شاید اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یادیں تازہ کرنے کے لئے پیدا فرمایا تھا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں اور بخار چڑھا ہوا ہے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور جا کر دیکھا تو شدید بخار کی حالت میں تپ رہے تھے، اور جس طرح بخار کی حالت میں انسان کو غفلت ہوتی ہے اس طرح کی غفلت کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے جا کر پوچھا کہ حضرت کیسے مزاج ہیں؟ تو فرمانے لگے کہ بھائی الحمد للہ بہت اچھا ہوں، اللہ کا شکر ہے کہ آنکھ میں درد نہیں ہو رہا، اللہ کا شکر ہے کان میں درد نہیں ہو رہا، اللہ کا شکر ہے ناک بھی ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے زبان ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے دل ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے کہ جگر ٹھیک ہے، جتنی تکلیفیں نہیں تھیں وہ پہلے شمار کرائیں اور اس پر شکر ادا کیا، اور پھر فرمایا کہ ہاں بخار ہو رہا ہے، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرما دیں۔

نعمت کا استحضار پہلے اور تکلیف بعد میں

جو نعمتیں میسر ہیں ان کا استحضار پہلے کرو اور اگر کوئی تھوڑی بہت تکلیف آئی ہے تو اس تکلیف کا ازالہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، لیکن یہ کیا کہ آدمی اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جائے اور جو بیشمار نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں ان کو بھول جائے، یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے اس کے بجائے انسان پہلے نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر تو ادا کرے پھر تکلیف کی بات کرے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں۔ ایک عالم وہ ہے جس میں راحت ہی راحت ہے، آرام ہی آرام ہے، لذت ہی لذت ہے، تکلیف اور غم کا نام نہیں، وہ عالمِ جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمائے۔ دوسرا عالم وہ ہے جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، عذاب ہی عذاب ہے، پریشانی ہی پریشانی ہے، غم ہی غم ہے، راحت اور خوشی کا نام نہیں، اور وہ جہنم ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ تیسرا عالم وہ ہے جس میں راحت بھی ہے، تکلیف بھی ہے، خوشی بھی ہے، غم بھی ہے، پریشانی بھی ہے اور امن وسکون بھی ہے، یعنی دونوں کا مخلوط آمیزہ اور دونوں کا مجموعہ ہے، یہ وہ عالم ہے جس سے ہم اور آپ گزر رہے ہیں یعنی عالمِ دنیا۔

تکالیف کا تناسب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں ہمیشہ کم ہوتا ہے

اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس دنیا میں مجھے راحت ہی راحت ملے، تکلیف کبھی نہ ہو یہ کبھی نہیں ہوسکتا، بڑے سے بڑا سرمایہ دار، بڑے سے بڑا حکمران، بڑے سے بڑا صاحبِ اقتدار یہ منزل حاصل نہیں کرسکتا کہ اس کو دنیا میں کبھی غم اور تکلیف نہ پہنچے۔ تکلیف تو پہنچے گی چاہے مسلمان ہو، چاہے کافر، چاہے عام مسلمان ہو، چاہے ولی اللہ ہو، چاہے صحابی ہو یا پیغمبر ہو، کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، تکلیف بھی ہوگی راحت بھی ہوگی۔ لیکن ہمیشہ یاد رکھو کہ کیسی ہی بڑی سے بڑی تکلیف آجائے اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں اس کا تناسب ہمیشہ کم ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یقیناً زیادہ ہوں گی۔ اگر تکلیف کا تناسب نعمتوں سے بڑھ جائے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب تک زندگی ہے اس وقت تک یہ ضرور ہوگا کہ تکلیفیں بھی ہوں گی اور راحت بھی ہوگی، لیکن ہمیشہ اگر غور کرو تو راحتیں زیادہ ہوں گی اور تکلیفیں کم ہوں گی۔ یہ کائنات کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہے

انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرے اور تکلیف پر صبر کرکے اسی سے مانگے کہ یا اللہ! یہ تکلیف مجھ سے دور فرمادے۔ اور اگر ناشکری کی کہ ساری نعمتوں کو تو بھول گیا اور صرف تکلیف کو لے کر بیٹھ گیا اور اسی بنا پر ناشکری کی اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ تقدیر کا شکوہ کیا کہ میں ہی رہ گیا تھا اس مصیبت کے لئے، اس مصیبت کو اُٹھانے کے لئے، (العیاذ باللہ) تو یہ بات خطرناک ہے۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرکے اس کا شکر ادا کرے۔ دیکھو خدا نہ کرے کہ ایک بیماری آگئی، لیکن ذرا یہ تو دیکھو کہ وہ بیماری کتنی نعمتوں کے ساتھ لپٹ کر آئی ہے، اس بیماری کی حالت میں الحمدللہ تیماردار میسر ہیں، اس بیماری کی حالت میں اللہ کا شکر ہے کہ طبیب یا ڈاکٹر موجود ہیں، اس بیماری کی حالت میں الحمدللہ علاج کے لئے پیسے موجود ہیں، یہ بیماری کی حالت الحمدللہ دوسروں کی بیماری کی حالت سے بہتر ہے کہ دوسرے کی بیماری زیادہ تکلیف دہ اور میری بیماری اس کی نسبت کم تکلیف دہ ہے۔ اگر غور کرو تو اس بیماری کے اندر بھی اتنی نعمتیں نظر آئیں گی کہ انسان اس کا شکر ادا نہیں کرسکے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ یہ جو قرآن کریم کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے ہو رہا ہے وہ ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ شکرگذار بننے کی عادت ڈالو کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کو سوچو اور نعمت کو سوچ کر کثرت سے اس پر شکر ادا کرو۔

قرآن کریم نے فرمایا: اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا کہ اے داؤد کی اولاد تم ایسا عمل کرو جس کے

نتیجہ میں شکر پیدا ہو، مطلب یہ کہ شکر گزار بننے کی عادت یہ صرف زبان سے ایک مرتبہ الحمدللہ کہنے سے ادا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے، اس کے لئے ریاضت کرنی پڑتی ہے، ریاضت کرو اور شکر گذار بندے بن جاؤ۔

تکبر کی جڑ کاٹنے والی چیز شکر ہے

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تمہیں پتہ نہیں کہ شکر کیا چیز ہے۔ شکر وہ چیز ہے کہ اگر اپنی زندگی میں اس کی عادت ڈال لی تو یقین رکھو کہ تنہا یہ شکر تمہیں نہ جانے کتنے روحانی امراض سے نجات عطا کر دے گا۔ مثلاً ایک مثال دیتا ہوں کہ جتنے روحانی امراض ہیں ان کی سب سے بڑی جڑ تکبر ہے، یہ تکبر وہ ہے جس نے شیطان کو ہلاکت میں ڈالا، اس تکبر کی جڑ کاٹنے والی چیز شکر ہے۔ کسی زمانہ میں تکبر کا علاج کرنے کے لئے صوفیائے کرام بڑے بڑے مجاہدے اور بڑی بڑی ریاضتیں کروایا کرتے تھے، ایسے ایسے کام پر لگا دیتے تھے کہ جس میں انسان کا نفس اور اس کی انا کا پندار ٹوٹ جائے، ایسے کاموں پر مدتیں لگا کر کہیں جا کر تکبر کا علاج ہوتا تھا۔ تو میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کا علاج ریاضتیں اور مجاہدات ہیں جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو تو یہ تکبر کی بیماری خود بخود ختم ہو جائے گی۔

شکر کا مطلب

جب آدمی شکر ادا کرتا ہے کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے کھانا دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ کپڑا دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ رتبہ دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ملازمت دی، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ منصب دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ میں تو اس لائق نہیں تھا، نہ اس کھانے کے لائق تھا، نہ اس کپڑے کے لائق تھا، نہ اس رتبہ اور منصب کے لائق تھا یہ محض آپ نے اپنے فضل سے اپنی رحمت سے مجھے دے دیا۔ ورنہ اگر کسی کے ذمہ تمہارا کوئی قرض تھا اور اس نے وہ قرض ادا کر دیا تو کوئی شکر کی بات نہ ہوئی۔ لیکن کوئی شخص تمہارے استحقاق کے بغیر تم کو کوئی چیز دیدے تو یہ شکر کی بات ہے۔ تو جب اللہ کا شکر ادا کیا کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے آپ نے مجھے پیدا کیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے آنکھ دی، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے کان دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے گویائی دی، معنی یہ ہیں کہ اے اللہ میں اس کا مستحق نہیں تھا، میرا کوئی حق نہیں تھا آپ پر، آپ نے جو عطاء فرمایا اپنے فضل کرم سے مجھے عطا فرمایا۔ تو جب پہلے ہی قدم پہ آپ نے یہ

اعتراف کرلیا کہ میں مستحق نہیں تھا تو تکبر کی جڑ کٹ گئی۔

شکر کو ختم کرنے کے لئے شیطان کا حربہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ فرماتے تھے کہ جب شیطان کو اللہ تعالیٰ نے جنت سے نکالا اور کہا کہ مردود ہوجا! تو چلتے چلتے اس نے بھی درخواست کی کہ یا اللہ نکال تو رہے ہیں تو آپ مجھے اتنی عمر دے دیجئے کہ جب تک یہ دنیا قائم ہے اس وقت تک میں زندہ رہوں، تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ چل دے دی۔ اب جب مل گئی تو اس نے اپنے عزائم کا اظہار اس طرح کیا کہ اچھا جب آپ نے مجھے یہ عمر دے دی تو اب یہ عمر آدم کے بیٹوں کو گمراہ کرنے میں صرف کروں گا۔

قرآن کریم نے فرمایا:

﴿لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ﴾ (۱)

میں ان کو گمراہ کرنے کے لئے ان کے سامنے سے آؤں گا ان کے پیچھے سے آؤں گا، ان کے دائیں سے آؤں گا، ان کے بائیں سے آؤں گا، یعنی ان پر چاروں طرف سے حملہ کروں گا، اور میرے اس گمراہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا:

﴿وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴾ (۲)

آپ ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔ یعنی انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے میرا حربہ یہ ہوگا کہ میں ان کے دلوں سے شکر کو کھرچ دوں گا اور ان کو ناشکرا بنادوں گا۔ اس کے نتیجہ میں یہ گمراہی کے راستہ پر پڑ جائیں گے۔

تو پتہ چلا کہ شیطان کے حربوں سے اگر بچنا ہے تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار بنو اور ہر ہر بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد، واقعات کو سیدھا پڑھنا چاہئے

محترم بھائی مصطفیٰ صادق صاحب نے بڑی اچھی بات یاد دلائی، میرے بڑے بھائی زکی کیفی مرحوم صاحب کی وفات کا واقعہ ہے کہ اس موقع پر حضرت والد صاحب قدس سرہ بہت ہی سخت بیماری میں مبتلا تھے، دل کی تکلیف، بدن میں بہت سخت پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں اور وہ انگارے کی طرح دہک رہی تھیں، اس حالت میں اپنے محبوب ترین بیٹے کے انتقال کی خبر آئی، کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اس دکھ کو لے بیٹھتا، لیکن اس حالت میں جو خط انہوں نے لاہور میں بچوں کے نام لکھا وہ خط پورا پڑھنے کے

(۱) الاعراف: ۱۷ (۲) الاعراف: ۱۷

قابل ہے، اس خط میں لکھا کہ حادثہ تو بڑا عظیم ہے لیکن میرے بچو! یہ غم اس واسطہ ہوتا ہے کہ ہم واقعات کو الٹا پڑھتے ہیں اور الٹا اس طرح پڑھتے ہیں کہ بھئی ایک جوان آدمی پچاس سال کی عمر اور ابھی کسی بچے کی شادی بھی نہیں ہوئی، ایک بچہ مدینہ منورہ میں پڑھ رہا ہے، اور اس حالت میں حج سے آ کر اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ فرمایا کہ اس واقعہ کو سیدھا پڑھو اور وہ اس طرح کہ ہر انسان کا ایک ایک سانس اللہ کے ہاں لکھا ہوا ہے، لہٰذا وہ ایک متعین سانس لے کر آئے تھے، گنے چنے سانس لے کر آئے تھے، اتنے ہی سانس ان کو ملنے تھے، اس سے کم و بیش ہو نہیں سکتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس حادثہ کے لئے کیا اسباب تمہاری تسلی کے لئے مہیا فرمائے کہ ایک بیٹا مدینہ منورہ میں پڑھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حج کا سامان مہیا فرما دیا۔ حج کے لئے گئے تو وہاں بیٹے کو خدمت کا موقع دیا، وہاں بھی انتقال ہو سکتا تھا لیکن حج کی پوری عبادت مکمل کرنے کے بعد یہاں آئے اور یہاں پر آ کر الحمد للہ اپنے عزیزوں سے مل بھی لیے اور ملنے کے بعد اپنے دوست احباب کی دعوت بھی کر دی اور ماں باپ سے کراچی سے مل کر آ گئے، اور یہ سارے اسباب مہیا کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بلایا۔ گویا واقعات کو الٹا پڑھنے کے بجائے واقعات کو سیدھا پڑھو تو پتہ چلے کہ یہ تکلیف جو تھی وہ کتنی رحمتوں کے ساتھ لپٹ کر آئی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا شکر

میرے والد ماجد قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ کس طرح کنویں میں ڈالے گئے، غلام بنائے گئے، قید خانہ میں رہے، مدتوں ماں باپ سے جدا رہے، باپ ان کے لئے روتا رہا اور بیٹا باپ کے لئے روتا رہا، سارے سال کے بعد جب مصر میں ملاقات ہوئی تو ایک بیٹا جس کو اس طرح کنویں میں ڈالا گیا ہو، غلام بنایا گیا ہو، قید کیا گیا ہو اور فتنوں میں مبتلا کیا گیا ہو، وہ بعد میں باپ سے ملا تو بجائے زمانہ کا دکھڑا سنانے کے اپنے والد سے فرمایا، جس کو قرآن نے بھی ذکر کیا:

﴿وَقَدْ أَحْسَنَ بِيٓ إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِنۢ بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَٰنُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِيٓ﴾(۱)

کہ اللہ نے کتنا احسان کیا میرے اوپر کہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا۔ قید خانہ میں جانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ ذکر یہ کیا کہ اللہ نے کتنا احسان کیا مجھ پر کہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا:

﴿وَجَآءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ﴾(۲)

(۱) یوسف: ۱۰۰ (۲) یوسف: ۱۰۰

اور اے میرے والدین میرے بہن بھائیوں پر کتنا اللہ نے احسان کیا کہ آپ کو دیہات سے لے آیا اور مجھ سے لاکر ملاقات کروائی۔گویا جدائی کا ذکر نہیں بلکہ ملاقات کا ذکر کیا، اور پیچھے جو واقعات پیش آئے تھے اور بھائیوں نے ظلم کیا تھا، اس کو شیطان کے سر ڈال دیا:

﴿مِنْ بَعْدِ أَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي﴾(۱)

شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان ایک مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ساری تکلیفیں چھوڑ کر اللہ کی نعمتوں کا ذکر کیا اور یہی شکر گذار بندوں کا طریقہ ہے۔

''الحمدللہ'' ہمیں کیا سبق دے رہا ہے

الحمدللہ کا لفظ جب شروع میں آ گیا تو یہ ہمیں اور آپ کو یہ سبق دے رہا ہے کہ اگر قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو پہلی سیڑھی اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر گذار بندے بن جاؤ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

شکر ادا کرنے کا طریقہ

شکر ادا کرنے کا طریقہ میرے شیخ حضرت عارفی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈال لو اور شکر ادا کرنے کی رٹ لگاؤ! رٹ کا کیا مطلب کہ ہر وقت، ہر لمحہ سوچو، ہوا کا جھونکا چلے اور اچھا معلوم ہو تو کہو، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، گھر میں داخل ہوئے اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا معلوم ہوا کہو، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، بھوک کے وقت کھانا سامنے آیا تو کہو، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، جو چھوٹی سے چھوٹی نعمت اور چھوٹی سے چھوٹی خوشی حاصل ہو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔

مغربی تہذیب کے نتیجہ میں ہماری حالت

مغربی تہذیب کے نتیجہ میں آج ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ جو چیزیں مسلمان کے ادنیٰ خاندان کے اندر معروف اور متعارف تھیں وہ سب چھوٹ گئیں اور ادنیٰ مسلمان خاندان کا یہ حال ہوتا تھا کہ پوچھا کہ بھائی کیسا مزاج ہے تو جواب ہوتا تھا کہ الحمدللہ، اللہ کا شکر ہے۔تو بچپن سے یہ مزاج بنایا جاتا تھا کہ الحمدللہ کہنے کی عادت ڈالو۔آج اگر کسی بچے سے پوچھو کہ بیٹے کیسے ہو تو جواب میں وہ کہے گا، ٹھیک ہوں اور الحمدللہ شاذ و نادر ہی کسی کی زبان پر آئے گا، کیونکہ بچے کو سکھایا ہی نہیں گیا اور

(۱) یوسف: ۱۰۰

عادت ہی نہیں ڈالی گئی۔ انگریزوں کا طریقہ ہے کہ جب کوئی کسی سے پوچھتا ہے کہ بھئی کیسے مزاج ہیں تو انگریزی میں کہتے ہیں Fine thanks جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بھئی اچھا ہوں تمہارا شکریہ، یعنی شکریہ اس کا کہ تم نے مجھ سے میرا حال پوچھ لیا، آج وہی عادت ہمارے اندر ہے اور جوان مغربی تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے ہیں یہ عادت ان کو بھی پڑ رہی ہے۔

تو اپنے بچوں کو پہلے دن سے الحمدللہ کہنے کی عادت ڈالو اور خود رٹ لگاؤ اور اس کی مشق کرو کہ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

ایک بزرگ کا معمول

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میرے ایک بزرگ تھے، ایک روز مجھے رات کو ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں جا کر دیکھا کہ جب سونے لگے تو میں دوسرے کمرہ میں تھا، تو میں نے اچانک دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر مستقل کہہ رہے ہیں، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، بڑی دیر تک بڑے جوش کے عالم میں پڑھتے رہے، تو میں نے حضرت سے پوچھا کہ حضرت کیا یہ معمول ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہر وقت مبذول رہتی ہیں لیکن ہم لوگ غفلت کے دھندوں میں پڑے رہتے ہیں۔ لہٰذا میں یہ کرتا ہوں کہ دن میں جو کچھ توفیق ہوگئی سو ہوگئی لیکن میں رات سونے سے پہلے جتنی دن بھر کی نعمتیں میرے تفکر میں آتی ہیں، میں ان کا تصور کرتا رہتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں کہ یا اللہ جب میں صبح کو اُٹھا تو مجھے سواری مل گئی، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، جب میں دفتر گیا تو وہاں میرے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، جب میں گھر آیا تو گھر والے صحت مند تھے، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، یا اللہ اس وقت مجھے یہ آرام دہ بستر میسر ہے، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، میں اس وقت مکان میں چھت کے نیچے بیٹھا ہوا ہوں کہیں باہر نہیں ہوں، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، فرماتے ہیں کہ جتنی نعمتیں میسر ہیں ان کا تصور کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر دیتا ہوں۔

اللہ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جس دن یہ کام کر لیا دیکھنا کتنی ترقی ہوتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت میں ترقی ہوگی تو یقیناً اسلام پر عمل آسان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو شکر ادا کرنے کی توفیق عطاء فرمائے اور دین کی صحیح سمجھ اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

’’قناعت‘‘ اختیار کرو ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ((وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰہُ لَکَ تَکُنْ اَغْنَی النَّاسِ))(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ کل ایک حدیث کا بیان شروع کیا تھا، جس میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کون ہے جو پانچ باتیں مجھ سے سیکھے، اور خود بھی عمل کرے، اور دوسروں تک ان باتوں کو پہنچائے، اور عمل کرائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں، تو آپ نے یہ پانچ باتیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان فرمادیں، جن میں سے پہلا جملہ وہ تھا جس کی تشریح میں نے کل عرض کی تھی:

((اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَکُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ))

’’تم حرام چیزوں سے بچو تو تم سارے لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے‘‘

جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان کے عبادت گزار ہونے کے لئے سب سے اہم شرط یہ ہے کہ گناہوں سے پرہیز کرے، اور تقویٰ اختیار کرے، اگر گناہوں سے تو پرہیز نہیں کیا، اور نفلی عبادتیں خوب ہو رہی ہیں، تو محض نفلی عبادتوں کی کثرت سے انسان عبادت گزار نہیں بنتا، جب تک اس کے ساتھ ساتھ گناہوں کو بھی ترک نہ کرے، اس کی تھوڑی سی وضاحت اور تفصیل عرض کردی تھی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ظاہر کے گناہ، باطن کے گناہ، حقوق اللہ سے متعلق گناہ، معاشرت سے متعلق گناہ، اخلاق سے متعلق گناہ، اللہ تعالیٰ ان سب گناہوں سے نجات عطا فرمادے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۴/۱۰ تا ۲۲۱) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ، باب من اتقی المحارم فھو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، مسند أحمد، رقم: ۷۷۴۸

قسمت کے لکھے ہوئے پر راضی ہو جاؤ

دوسرا فقرہ جو اس حدیث میں ارشاد فرمایا، وہ یہ ہے:
((وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ))
یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری قسمت میں جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر راضی ہو جاؤ، اگر تم راضی ہو جاؤ گے تو تم دنیا کے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔ پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ ''غنی'' کا عام طور پر ترجمہ ''مالدار'' اور ''دولتمند'' سے کیا جاتا ہے، جس کے پاس دولت اور پیسہ زیادہ ہو، وہ غنی ہے، حقیقت میں ''غنی'' کے معنی ''دولتمند'' کے نہیں ہیں، بلکہ حقیقت میں ''غنی'' کے معنی ہیں ''وہ شخص جو کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو''، چونکہ جس شخص کے پاس دولت ہے، پیسہ ہے، امیر آدمی ہے، ایسا شخص کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی سے اس کو مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، اس وجہ سے اس کو ''غنی'' کہتے ہیں، ورنہ اصل میں ''غنی'' کے معنی ''مالداری'' کے نہیں، بلکہ اس کے اصل معنی ''حاجت سے بے نیاز'' ہونے کے ہیں کہ آدمی کو کسی دوسرے کی حاجت نہیں۔

غنی کون؟

ایک حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:
((لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ))(۱)
اصل میں ''غنیٰ'' روپے، پیسے اور سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی، بلکہ اصل میں ''غنیٰ'' نفس کا ''غنیٰ'' ہے کہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تقدیر پر ''قناعت'' ہو جائے، اور اس صورت میں وہ دوسروں سے بے نیاز ہو جائے کہ بس جو مجھے مل گیا وہ ہی میرے لئے کافی ہے، انسان کے دل میں جب یہ خیال پیدا ہو جائے تو انسان ''غنی'' ہے۔ اس لئے کہ پیسہ بذاتِ خود تو کوئی چیز نہیں۔ کیا پیسوں کو بھوک کے وقت کھالو گے؟ نہیں۔ یا اس کو کپڑوں کی جگہ پہن لو گے؟ نہیں۔ بلکہ پیسوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو تنگ دستی نہ ہو، اس کی ضرورت پوری ہو جائے، اور دوسروں کا محتاج نہ ہو۔ اب اگر ایک آدمی کے پاس بہت سارا روپیہ ہے، بینک بیلنس ہے، کوٹھی بنگلہ ہے، کاریں ہیں، دنیا کا سارا ساز وسامان موجود ہے، ان سب کے ہونے کے باوجود اس کے اندر ''بے نیازی'' پیدا نہیں ہوئی، پھر بھی وہ شخص

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب الغنى غنى النفس، رقم: ٥٩٦٥، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب ليس الغنى عن كثرة العرض، رقم: ١٧٤١، سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء أن الغنى غنى النفس، رقم: ٢٢٩٥، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب القناعة، رقم: ٤١٢٧۔ مسند أحمد، رقم: ٧٠١٥

دوسروں کا حاجت مند رہا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو "غنی" حاصل نہیں۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کی آمدنی کم ہے، گنتی میں اس کے پیسے کم ہیں، لیکن وہ شخص دوسروں سے بے نیاز ہے، وہ کسی کے مال کی طرف منہ اُٹھا کر نہیں دیکھتا، کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی کے پیچھے نہیں پھرتا، یہ شخص "غنی" ہے، اس کو "غنی" حاصل ہے۔ لہٰذا اصل غنیٰ دل کا غنیٰ ہے کہ دل دوسروں سے بے نیاز ہو جائے۔

غنی کے لئے دو چیزوں کی ضرورت

بہرحال! اس جملے میں حضورِ اقدس ﷺ بڑے کام کی بات ارشاد فرمارہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین، وہ یہ کہ اپنی قسمت پر راضی ہو جاؤ تو ساری دنیا میں سب سے "غنی" تم ہو گے۔ اس جملے میں حضورِ اقدس ﷺ نے دو باتوں کی تلقین فرمائی، ایک "قناعت" دوسرے "رضا بالقضاء" تقدیر پر راضی ہونا، اگر یہ باتیں حاصل ہو جائیں تو تم سارے انسانوں میں "غنی" ہو جاؤ گے۔ پہلی بات ہے "قناعت"، قناعت کے معنی ہیں جائز اور مناسب تدبیر اور دوڑ دھوپ کے بعد حلال طریقے سے جو کچھ مجھے مل گیا، بس وہ میرے لئے کافی ہے، مجھے اور زیادہ کی ہوس نہیں، حرص نہیں، اس کا نام ہے قناعت، یہ بہت اہم صفت ہے، جو ہر مؤمن کے اندر مطلوب ہے، اور خود حضورِ اقدس ﷺ نے اپنے لئے دعا مانگی ہے، فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ))(۱)

اے اللہ! جو رزق آپ نے مجھے عطا فرمایا ہے، اس پر مجھے قناعت بھی عطا فرما۔ اس قناعت کے بغیر انسان کو راحت اور سکون حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی

قناعت حاصل کرنے کے لئے آدمی کو یہ سوچنا چاہئے کہ دل میں خواہشات تو بیشمار پیدا ہوتی رہتی ہیں کہ ایسا بن جاؤں، مجھے اتنی دولت حاصل ہو جائے، مجھے کوٹھی اور بنگلہ حاصل ہو جائے، کاریں مل جائیں، یہ سب خواہشات تو دل میں پیدا ہوتی رہتی ہیں، لیکن اس روئے زمین پر کون سا انسان ایسا ہے جس کی ہر خواہش پوری ہو جاتی ہو؟ کوئی ہے؟ نہیں۔ چاہے بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، چاہے بڑے سے بڑا ولی اللہ ہو، بڑے سے بڑا صوفی ہو، بزرگ ہو، عالم ہو، کوئی نہیں ہے جس کی ہر خواہش پوری

(۱) المستدرك للحاكم (۲۰۲/۳) رقم: ۳۳٦۰، شعب الإيمان (۳۵۳/۳)، رقم: ۴۰۴۷، صحيح ابن خزيمة (۴۳/۱۰) رقم: ۲۵۲۲۔ پوری دعا کچھ یوں ہے: "اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَاخْلُفْ عَلٰى كُلِّ غَائِبَةٍ لِّیْ مِنْكَ بِخَيْرٍ"

ہو جاتی ہو، یہ تو دنیا ہے، جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ اس میں تمہاری کچھ خواہشات پوری ہوں گی، اور کچھ نہیں ہوں گی، جب ہر خواہش پوری نہیں ہوگی تو اب دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ یا تو ساری زندگی خواہش پوری نہ ہونے پر کڑھتے رہو، اور یہ شکوہ شکایت کرتے رہو کہ میری فلاں خواہش پوری نہیں ہوئی، میں فلاں چیز چاہ رہا تھا، وہ نہیں ملی، ساری زندگی اس حسرت اور افسوس میں گزار دو۔ اس لئے کہ تقدیر سے زیادہ تو تمہیں کبھی کوئی چیز نہیں مل سکتی، چاہے رو، چاہے فریاد کرو، چاہے کڑھتے رہو، اور لوگوں کے سامنے شکوے کرتے رہو، ملے گا وہی جو تقدیر میں لکھا ہے۔

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

دوسری صورت یہ ہے کہ جو کچھ مل رہا ہے اس کو ہنسی خوشی قبول کرلو، اور اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ، اور قناعت اختیار کرلو، بس یہی دو صورتیں ہیں، لہٰذا اللہ جل شانہ کی تقدیر پر اور اس کی تقسیم پر راضی ہو جاؤ کہ تمہیں جتنا کچھ دیا ہے، تمہارے لئے وہ ہی مناسب ہے۔ البتہ جائز اور حلال طریقوں سے تدبیر کرنا منع نہیں، لیکن تدبیر کرنے کے بعد جو مل گیا، اس پر خوش ہو جاؤ کہ ہاں! میرا حق اتنا ہی تھا، جو مجھے میرے اللہ نے دیا، اب اس سے زیادہ کی ہوس میں مبتلا ہوکر خود بھی پریشان ہونا اور دوسروں کو بھی پریشان کرنا، اور اس کے لئے جائز اور ناجائز طریقے استعمال کرنا یہ وہ بلا ہے جس میں آج پوری دنیا مبتلا ہے، اور نبی کریم ﷺ اس جملے کے ذریعے اس سے بچانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

جائز اور حلال طریقے سے اعتدال سے کماؤ

پہلی بات یہ ہے کہ دولت اور پیسے کے حاصل کرنے کے لئے ناجائز اور حرام تدبیر نہ ہو، بلکہ جو طریقہ بھی پیسے کمانے کا اختیار کرو وہ حلال اور جائز ہونا چاہئے، اور جو کچھ ملے اس پر قناعت اختیار کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ جائز اور حلال طریقوں کو بھی اعتدال کے ساتھ اختیار کرو، یہ نہیں کہ صبح سے لے کر شام تک بس پیسے کمانے میں منہمک ہے، اور دنیا کی دوڑ دھوپ میں لگا ہوا ہے، سب کچھ مل جانے کے باوجود خواہش یہ ہے کہ اور مل جائے، اس دنیا کی حرص و ہوس اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر وقت دل و دماغ پر دنیا کی فکر سوار ہے۔ ایک مؤمن کے اندر یہ چیز مطلوب نہیں، چاہے وہ جائز اور حلال طریقے سے کر رہا ہو، اس لئے کہ جائز اور حلال طریقوں کے اندر بھی اعتدال مطلوب ہے، یہ نہ ہو کہ دنیا کو اپنے اوپر اس طرح سوار کرلیا کہ اب خواب بھی اس کے آرہے ہیں، بقول شخصے کہ ''جس تاجر کے دماغ پر دنیا سوار ہوتی ہے، جب وہ رات کو بستر پر لیٹتا ہے تو آسمان کے ستارے بھی اس کو آپس میں تجارت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں'' یہ حالت اچھی نہیں۔

پیسوں کو خادم بناؤ، مخدوم نہ بناؤ

ارے بھائی! یہ پیسہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا خادم بنا کر پیدا کیا ہے کہ تمہاری خدمت کرے، نہ یہ کہ یہ پیسہ تمہارا مخدوم بن جائے، اور تم اس کے خادم بن جاؤ کہ میں کس طرح اس کو حاصل کرلوں، کس طرح اس کو رکھوں، کہاں خرچ کروں؟ اور کس طرح مزید پیسہ پیدا کروں؟ ہم نے اُلٹا معاملہ کرلیا ہے کہ وہ پیسہ جو ہمارا خادم تھا، ہم نے اس کو مخدوم بنا دیا ہے۔ اب اس پیسے کے پیچھے اپنی جان بھی جا رہی ہے صحت بھی خراب ہو رہی ہے، دین بھی خراب ہو رہا ہے، لوگوں سے تعلقات بھی خراب ہو رہے ہیں، اور دن رات یہی فکر ہے۔

سبق آموز واقعہ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ''گلستان'' میں اپنا ایک قصہ لکھا ہے کہ میں ایک مرتبہ سفر پر تھا کہ ایک شہر میں ایک تاجر کے گھر میں مقیم ہوگیا، بہت بڑا تاجر تھا، اس کا گھر بھی عالیشان تھا، اور اس میں دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ جب دسترخوان پر کھانے کے لئے بیٹھے تو بات چیت شروع ہوئی، اس تاجر کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی، میں نے اس تاجر سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت مال و دولت سے نوازا ہے، اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ اس تاجر نے کہا کہ میں نے ساری دنیا میں گھوم لیا، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت کچھ عطا فرمایا، لیکن میرے دل میں ایک حسرت ہے وہ یہ کہ میں ایک آخری تجارتی چکر لگانا چاہتا ہوں، اس کے بعد اپنی بقیہ زندگی اپنے وطن میں گزار دوں گا۔ میں نے پوچھا کہ وہ آخری چکر کہاں کا ہے؟ اس تاجر نے اس آخری چکر کی تفصیل یہ بتائی کہ میں ایران سے گندھک خرید کر چین جاؤں گا، وہاں سے چینی برتن خریدوں گا، وہ برتن روم میں لے جا کر فروخت کروں گا، اور روم سے ریشم خرید کر ہندوستان میں فروخت کروں گا، اور ہندوستان سے لوہا خرید کر حلب میں فروخت کروں گا، اور حلب کا آئینہ خرید کر یمن میں فروخت کروں گا، اور یمن سے چادریں خرید کر ایران میں فروخت کروں گا، اور اس کے بعد سفر چھوڑ کر ایک دکان میں بیٹھ کر بقیہ زندگی گزار دوں گا، اس کے بعد اس نے شیخ سعدی سے کہا کہ تم بھی تو کہو، تم نے جو سفر میں دیکھا سنا ہو اس کے بارے میں بتاؤ، شیخ سعدی نے کہا کہ یہ دو شعر سن لو:

آں شنیدستی کہ در صحرای غور
بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشمِ تنگِ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

کہ تم نے یہ قصہ سنا ہے کہ غور کے صحراء میں ایک سردار اپنے خچر پر سامان لے جا رہا تھا، خچر نے اس تاجر کو نیچے گرایا، وہ تاجر مر گیا، اور تجارت کا سارا سامان جنگل میں پڑا رہ گیا، وہ بکھرا ہوا سامان زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا دار کی تنگ نظر کو یا تو قناعت بھر سکتی ہے، یا قبر کی مٹی بھر سکتی ہے، اس کے بھرنے کا کوئی اور راستہ نہیں۔ (۱)

انسان کا پیٹ قبر کی مٹی بھر سکتی ہے

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ اشعار درحقیقت ایک حدیث کا مضمون ہیں، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا:

((لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغٰى أَنْ يَكُوْنَ لَهٗ وَادِيَانِ، وَلَوْ كَانَ لَهٗ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُوْنَ لَهٗ ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ)) (۲)

اگر ابن آدم کو سونے سے بھری ہوئی ایک وادی مل جائے تو وہ چاہے گا کہ میرے پاس سونے کی دو وادیاں ہو جائیں، اور اگر دو وادیاں سونے سے بھری ہوئی مل جائیں تو وہ چاہے گا کہ مجھے تیسری وادی مل جائے، اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی، اس کا پیٹ ہر وقت خالی رہتا ہے، اور دل چاہتا ہے کہ اس کے اندر اور آجائے، اور آجائے، اور یہ پیٹ اس وقت بھرے گا جب وہ قبر میں جائے گا، اور قبر کی مٹی اس میں داخل ہوگی تب وہ بھرے گا، اس سے پہلے قناعت حاصل نہیں ہوگی۔

حرص و ہوس چھوڑ دو

اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ اگر راحت چاہتے ہو تو قناعت پیدا کرو، وہ یہ کہ جائز اور حلال طریقے سے جو کچھ مجھے مل رہا ہے، وہ الحمد للہ میرے لئے ایک نعمت ہے، مجھے زیادہ کی ہوس نہیں۔ ایک بہت بڑا فتنہ جو ہمیشہ سے ہے، لیکن آج یہ فتنہ بہت بڑھا ہوا ہے، وہ حرص و ہوس ہے،

---

(۱) گلستانِ سعدی، ص ۱۲۰

(۲) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب ما يتقى من فتنة المال، رقم: ٥٩٥٩، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب لو أن لابن آدم واديين لابتغى ثالثا، رقم: ١٧٣٨، سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء لو كان لابن آدم واديان من مال، رقم: ٢٢٥٩، مسند أحمد، رقم: ١٢٢٥٦

مثلاً یہ حرص ہے کہ فلاں کے پاس جیسا بنگلہ ہے، میرے پاس بھی ویسا بنگلہ ہو، فلاں کے پاس جیسی گاڑی ہے، میرے پاس بھی ویسی گاڑی ہو، فلاں کے پاس جیسا کارخانہ ہے، میرے پاس بھی ایسا کارخانہ ہو۔ بلکہ میں اس سے بھی آگے بڑھ جاؤں۔ آگے بڑھنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اگر فرض کرو کہ اس دوڑ کے باوجود حلال وحرام کی فکر ہے، تب بھی اپنے دل کا سکون تو اس دوڑ کے نتیجے میں غارت کیے ہوئے ہے کہ مجھے اور مل جائے، اور مل جائے۔

اپنے سے اُونچے آدمی کومت دیکھو

اب سوال یہ ہے کہ قناعت کیسے پیدا ہوگی؟ اس کے بارے میں فرمایا کہ دنیا کے معاملات میں اپنے سے اُونچے آدمی کومت دیکھو، بلکہ اپنے سے نیچے آدمی کو دیکھو، اس لئے کہ اگر اپنے سے اُونچے آدمی کو دیکھو گے تو ہر وقت دل میں یہ حسرت رہے گی کہ اچھا اس کے پاس ایسی گاڑی ہے، میرے پاس بھی ایسی گاڑی ہونی چاہئے، اس کے پاس ایسا مکان ہے، میرے پاس بھی ایسا مکان ہونا چاہئے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہوس بڑھتی چلی جائے گی، لیکن جب تم اپنے سے نیچے آدمی کو دیکھو گے تو اس صورت میں شکر کے جذبات پیدا ہوں گے، تم یہ سوچو گے کہ یہ بھی میری طرح گوشت پوست کا انسان ہے، اور یہ اس حالت میں زندگی گزار رہا ہے، مجھے تو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ نوازا ہے، مجھے تو اس کا شکر ادا کرنا چاہئے، یہ سوچنے سے انسان کے اندر "قناعت" پیدا ہوگی۔ لہٰذا اپنے سے کمتر کو دیکھا کرو

حضرت عون بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

ایک محدث عون بن عبد اللہ بن عتبہ فرماتے ہیں:

"میں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ مالداروں کے ساتھ گزارا (خود بھی مالدار تھے) صبح سے شام تک مالداروں کے ساتھ رہتا تھا، لیکن جب تک مالداروں کی صحبت میں رہا، مجھ سے زیادہ غمگین انسان کوئی نہیں تھا، کیونکہ جہاں جاتا، یہ دیکھتا کہ اس کا گھر میرے گھر سے اچھا ہے، اس کی سواری میری سواری سے اچھی ہے، اس کا کپڑا میرے کپڑے سے اچھا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر میرے دل میں کڑھن پیدا ہوتی تھی کہ مجھے تو ملا نہیں اور اس کو مل گیا۔ لیکن بعد میں دنیاوی حیثیت سے جو کم مال والے تھے، اُن کی صحبت اختیار کی، اور ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا، تو میں راحت میں آگیا، اس واسطے کہ جس کو بھی دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں تو بہت خوشحال ہوں، میرا کھانا بھی اس کے کھانے سے اچھا ہے، میرا کپڑا بھی اس کے

کپڑے سے اچھا ہے، میرا گھر بھی اس کے گھر سے اچھا ہے، میری سواری بھی اس کی سواری سے اچھی ہے، اس واسطے میں اب الحمد للہ راحت میں آگیا ہوں"(۱)

دنیا کا مہنگا ترین بازار

ارے بھائی! اگر تم اپنے سے اوپر دیکھنا شروع کرو گے تو اوپر والوں کی کوئی حد اور انتہا ہی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میں امریکہ میں گیا، امریکا کے شہر لاس اینجلس میں ایک بازار ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا مہنگا ترین بازار ہے، اس بازار میں میرا جانا ہوا، میرے میزبان نے ایک دکان کی طرف اشارہ کیا، اور کہا کہ یہ دکان ایسی ہے کہ اس دکان میں رکھی ہوئی اشیاء کی قیمتیں تصور سے بھی زیادہ ہیں، مثلاً یہ موزے جو سامنے رکھے ہوئے ہیں، ان کی قیمت ۲۰۰ ڈالر ہے، اور یہ سوٹ بیس ہزار ڈالر کا ہے، ہمارے حساب سے بارہ لاکھ روپے کا ایک سوٹ، اور یہ دکاندار صرف کپڑے اور سوٹ فروخت نہیں کرتا، بلکہ یہ مشورہ بھی دیتا ہے کہ آپ کے جسم پر کس قسم کا، کس ڈیزائن کا اور کس کلر کا لباس مناسب ہوگا، اور اس مشورے کے دس ہزار ڈالر الگ چارج کرتا ہے، اور پھر اس سوٹ کی تیاری پر چالیس، پچاس ہزار ڈالر الگ ہوں گے، اس طرح ایک سوٹ جو آپ سر سے لے کر پاؤں تک پہنیں گے پچاس، ساٹھ ہزار ڈالر میں تیار ہوگا۔

شہزادہ چارلس اور دِلی خواہش

اور اس شخص سے لباس کے بارے میں مشورہ لینے کے لئے مہینوں پہلے وقت لینا پڑتا ہے، اور برطانیہ کے شہزادہ چارلس نے اس سے وقت مانگا تو دو مہینے بعد کا وقت ملا۔ اب وہ شہزادہ چارلس دو مہینے تک تکلیف میں رہا، اس لئے کہ اس کا دل چاہ رہا ہے کہ اس سے ملاقات کی فضیلت مجھے حاصل ہو جائے، اور پھر اس کے مشورے سے تیار کردہ سوٹ میں بھی پہنوں، اور پیسے خرچ کرنے کے لئے بھی تیار ہے، لیکن اس کے باوجود بھی دل کی خواہش پوری نہیں ہو رہی ہے۔ یہ بھی دولت خرچ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اب اس کو دیکھو، اور سوچو کہ میں اس طرح لباس تیار کرا کر پہنوں، نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری زندگی حسرت میں گزر جائے گی، لیکن یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر تم اپنے سے اوپر دیکھنا شروع کرو گے تو اس کی کوئی حد نہیں۔

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب اللباس عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء في ترقيع الثوب، رقم: ۱۷۰۲، حلية الأولياء (۲/۱۸۹)، فيض القدير (۲/۹۳)، تفسير ابن كثير (۱/٦٤٥)، صفة الصفوة (۳/۱۱۰)

کس طرف دیکھو گے؟

جس بازار کا میں یہ واقعہ بتا رہا ہوں، اسی بازار سے دو میل کے فاصلے پر ایک اور بازار میں یہ منظر بھی دیکھا کہ وہاں پر لوگ ٹرالیاں لے کر جا رہے ہیں، اور کوکا کولا، اور پیپسی کولا کے خالی ڈبے جمع کر رہے ہیں، اور ان کو فروخت کر کے اپنا پیٹ پال رہے ہیں، اور رات کو سوتے وقت اسی ٹرالی میں سے ایک کمبل نکالا، اور راستے کے کنارے ٹرالی کھڑی کی، اور وہیں فٹ پاتھ پر سردی میں سو گئے۔ اب بتاؤ! اُدھر دیکھو گے یا اِدھر دیکھو گے؟ اگر اُدھر دیکھو گے تو تمہارا پیٹ کبھی نہیں بھرے گا، کبھی تمہاری آنکھ سیر نہیں ہوگی، کبھی تمہیں آرام اور سکون حاصل نہیں ہوگا، لیکن اگر دوسری طرف دیکھو گے اور یہ سوچو گے کہ یہ بھی اللہ کے بندے ہیں، کس طرح رات گزارتے ہیں، ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سو کر رات گزار رہے ہیں، اللہ نے مجھے تو راحت اور آرام والا مکان عطا فرمایا ہے، اس سوچ کے نتیجے میں اطمینان اور سکون عطا ہوگا۔ اس لئے حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے اصول بتا دیا کہ دین کے معاملے میں اپنے سے اعلیٰ کو دیکھو، اور دنیا کے معاملے میں اپنے سے کمتر کو دیکھو، تو اس کے نتیجے میں شکر پیدا ہوگا، اور قناعت پیدا ہوگی۔ (۱)

حرص و ہوس انسان کو جلاتی رہتی ہے

قناعت سے بہتر کوئی دولت نہیں، کیونکہ جب انسان کے دل میں ہوس کی آگ لگ جاتی ہے تو پھر اس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہوتی، پھر یہ ہوس انسان کو جلاتی رہتی ہے، اور حاصل کچھ نہیں ہوتا، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے ہمیں یہ دعا سکھائی، ہم سب کو یہ دعا مانگنی چاہئے، اگر عربی الفاظ یاد ہو جائیں تو بہت اچھا ہے، ورنہ اُردو میں ہی مانگ لیا کریں، وہ دعا یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَاخْلُفْ عَلٰی كُلِّ غَائِبَةٍ لِّیْ مِنْكَ بِخَیْرٍ)) (۲)

اے اللہ! جو کچھ آپ نے مجھے رزق عطا فرمایا ہے، اس پر مجھے قناعت عطا فرما دیجئے، اور جو نعمتیں مجھے حاصل نہیں ہیں، ان کے بدلے میں مجھے اپنی طرف سے جو میرے حق میں بہتر ہو وہ عطا فرما۔ ہو سکتا ہے کہ میں جس چیز کی خواہش کر رہا ہوں، وہ میرے حق میں ٹھیک نہ ہو، مناسب نہ ہو، لیکن آپ اپنے فضل و کرم سے جو ہمیں عطا فرمائیں گے، وہی میرے حق میں مناسب ہوگا، وہی مجھے عطا فرما دیں۔

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، مسند الأنصار، مسند أبی ذر الغفاری، رقم: ۲۰۴۴۷، ۲۰۵٤۰

(۲) المستدرك للحاكم (۲۰۲/۳) رقم: ۳۳٦۰، شعب الإیمان (۳۵۳/۳)، رقم: ٤۰٤۷، صحیح ابن خزیمة (٤۳/۱۰) رقم: ۲۵۲۲

ایک خوبصورت دعا

ایک اور دعا حضورِ اقدس ﷺ نے یہ سکھائی:
((اَللّٰهُمَّ مَا رَزَقْتَنِيْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ قُوَّةً لِّيْ فِيْمَا تُحِبُّ، وَمَا زَوَيْتَ عَنِّيْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ فَرَاغًا لِّيْ فِيْمَا تُحِبُّ))(۱)

کیا عجیب و غریب دعا حضورِ اقدس ﷺ نے مانگی ہے، فرمایا کہ اے اللہ! میری پسندیدہ چیز جو آپ نے مجھے عطا فرمائی ہے، اس چیز کو ان کاموں کا ذریعہ بنا دیجئے جو آپ کو پسند ہیں۔ اور میری پسندیدہ چیز جو آپ نے مجھے نہیں دی تو اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما دیجئے جو آپ کی پسند ہے۔ نبی کے علاوہ کوئی دوسرا شخص یہ دعا مانگ ہی نہیں سکتا۔ بہر حال! قناعت کے بغیر اس دنیا میں راحت حاصل نہیں ہو سکتی۔

دولت نے بیٹے کو باپ سے دور کر دیا

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ والد صاحب کے جاننے والوں میں ایک تاجر تھے، ان کا ایک کاروبار کراچی میں تھا، ایک ممبئی میں، ایک سنگاپور میں، ایک بنکاک میں تھا، کئی شہروں میں فیکٹریاں لگی ہوئی تھیں، ایک بیٹا سنگاپور میں کام کر رہا ہے، ایک بنکاک میں کام کر رہا ہے، ایک ممبئی میں کام کر رہا ہے، اور خود کراچی میں کام کر رہے ہیں۔ والد صاحب نے ایک دن ان سے پوچھا کہ آپ کی اپنے بیٹوں سے ملاقات ہو جاتی ہے؟ جواب میں کہنے لگے کہ میری اپنے بیٹے سے ملاقات کو اتنے سال ہو گئے ہیں۔ گویا کہ ایک بیٹا اپنے کاروبار میں مگن ہے، اور دوسرا بیٹا اپنے کاروبار میں مگن ہے، اور باپ اپنے کاروبار میں مگن ہیں، سالہا سال سے باپ نے اپنے بیٹے کی شکل نہیں دیکھی، اور بیٹے نے باپ کی شکل نہیں دیکھی، اور پیسوں کی گنتی میں روز اضافہ ہو رہا ہے۔ ارے بھائی! جن پیسوں کے نتیجے میں انسان کو اپنی اولاد سے، اپنے باپ سے ملنے کی نعمت نصیب نہ ہو، ایسا پیسہ کس کام کا؟

اولاد کا قرب بڑی نعمت ہے

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں ایک کافر کا واقعہ بیان کیا ہے، جو بڑا اکّڑ قسم کا کافر تھا اور ہم نے اس کو کیسی نعمتوں سے نوازا تھا، فرمایا:

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳۴۱۳

﴿وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًاۙ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًاۙ﴾(۱)

یعنی ہم نے اس کو مال بھی بے انتہا دیا تھا، اور اس کو اولاد بھی دی تھی جو اس کے پاس موجود تھی۔ جس سے معلوم ہوا کہ اولاد کا پاس موجود ہونا یہ اللہ جل شانہ کی عظیم نعمت ہے، اگر انسان کے پاس روپیہ پیسہ تو ہو لیکن اولاد قریب نہ ہو تو ان پیسوں کا کیا فائدہ؟

اس مقدار پر راضی ہو جاؤ

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ اگر تم صحیح معنی میں مالداری چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اس مقدار پر راضی ہو جاؤ جو اللہ جل شانہ نے تمہاری قسمت کے حساب سے تمہیں عطا فرمادی، تو پھر انشاء اللہ راحت اور آرام میں رہو گے، اور پھر کسی کے محتاج نہیں ہو گے، اور نہ کسی کی طرف تمہاری نگاہیں اُٹھیں گی، اور تم سیر چشم رہو گے۔ لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی نہ ہو گے تو پھر ہزار ہاتھ پاؤں مارتے رہو، اور دل میں غمگین بھی ہوتے رہو، کبھی بھی دل کا غنیٰ حاصل نہیں ہوگا، جو اصل مقصود ہے۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

خلاصہ یہ کہ حضور ﷺ نے اس جملے میں دو باتوں کی تاکید فرمائی ہے، ایک قناعت حاصل کرنے کی، دوسرے رضا بالقضاء کی، آج مختصراً ''قناعت'' کے بارے میں عرض کر دیا کہ اپنے تمام معاملات میں جائز اور حلال طریقے سے جو کچھ حاصل ہو رہا ہے، اس پر خوش ہو جاؤ، دوسروں کی طرف مت دیکھو کہ دوسروں کے پاس کیا ہے؟ ارے بھائی! دوسرے کا معاملہ وہ جانے، تمہارا معاملہ تم جانو، تم اس فکر میں کیوں پڑے ہو کہ دوسرے کے پاس کیا ہے؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بڑا خوبصورت، بڑا معنی خیز شعر ہے، اگر انسان اس پر عمل کرے تو اس کو بڑا سکون حاصل ہو جائے، فرماتے ہیں۔

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

مجھے اس سے کیا غرض کہ کس کے گلاس میں کتنی ہے، ہاں مجھے جو کچھ ملا ہے، وہ میرے لئے حاصل میخانہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے، درحقیقت وہی میرے لئے کافی ہے، قناعت یہ ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے پر راضی ہو جاؤ، اور اس کو اپنے لئے نعمت سمجھو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا

(۱) المدثر: ۱۲، ۱۳

کرو، اور دوسروں کی طرف دیکھ کر حرص و ہوس میں مبتلا نہ ہو۔

تجارت کو ترقی دینا قناعت کے خلاف نہیں

یہاں میں ایک اور وضاحت کردوں، وہ یہ کہ لوگ بعض اوقات ''قناعت'' کا مطلب یہ سمجھ بیٹھتے ہیں، اور اس ساری گفتگو کا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جو شخص تاجر ہے اس کو آگے تجارت بڑھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، قناعت کا مقصد یہ نہیں، میں نے تین الفاظ استعمال کیے، ایک یہ کہ مال کمانے کا طریقہ جائز ہو، دوسرے وہ مال حلال ہو، تیسرے یہ کہ اعتدال کے ساتھ ہو، اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ))(۱)

لہٰذا اعتدال کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کمانے کو اپنے اوپر سوار نہ کرو، مال کے خادم نہ بنو، اب اگر ایک شخص جائز طریقے سے اور اعتدال کے ساتھ اپنے کاروبار کو بڑھا رہا ہے، تو شریعت نے اس پر نہ صرف یہ کہ پابندی عائد نہیں کی، بلکہ یہ عمل قناعت کے بھی منافی نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے کاروبار کو ناجائز اور حرام طریقے سے بڑھا رہا ہے، وہ تو بالکل ہی حرام ہے، دوسرا یہ کہ اگرچہ ناجائز کا ارتکاب نہیں ہو رہا ہے، لیکن اعتدال سے بڑھا ہوا ہے، اس لئے کہ دن رات مال بڑھانے کے علاوہ کوئی اور فکر ہی نہیں ہے، یا اس کاروبار کے نتیجے میں دوسروں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، یہ بھی اعتدال سے بڑھنے میں داخل ہے، تیسرے یہ کہ آدمی اس کاروبار میں ایسا مشغول ہوگیا ہے کہ اب اس کو کسی دینی محفل میں جانے کی فرصت نہیں، دین کی بات سیکھنے کی فرصت نہیں، کسی اللہ والے کے پاس جاکر بیٹھنے کی فرصت نہیں، یہ بھی اعتدال سے خارج ہے، اور قناعت کے خلاف ہے۔

بہرحال! اعتدال کے ساتھ، جائز طریقے سے دنیا کماؤ، اور جو ملے اس پر راضی رہو، بس اسی کا نام قناعت ہے۔ اس دنیا میں قناعت کے علاوہ راحت حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو قناعت کی دولت عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب الاقتصاد في طلب المعيشة، رقم: ۲۱۳۵، مؤطا مالك، الكتاب الجامع، باب أنه كان يقال الحمد لله الذي خلق كل شيء

چار عظیم صفات ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((أَرْبَعٌ إِنْ كُنَّ فِيْكَ فَلَا عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنْيَا، حِفْظُ أَمَانَةٍ، وَصِدْقُ حَدِيْثٍ، وَحُسْنُ خَلِيْقَةٍ، وَعِفَّةٌ فِيْ طُعْمَةٍ))(۱)

ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لوگوں کے سامنے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا:

((أَرْبَعٌ إِنْ كُنَّ فِيْكَ فَلَا عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنْيَا))

چار صفتیں ہیں کہ اگر وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں تو اگر دنیا کی کوئی نعمت تمہیں نہ ملی ہو تو تمہیں اس کا کوئی غم نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ چار صفتیں اتنی بڑی دولت ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی اور دولت کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا یہ چار صفتیں دنیا کی ساری دولت سے بالا و برتر ہیں، وہ چار صفتیں کیا ہیں؟ فرمایا:

((حِفْظُ أَمَانَةٍ، وَصِدْقُ حَدِيْثٍ، وَحُسْنُ خَلِيْقَةٍ، وَعِفَّةٌ فِيْ طُعْمَةٍ))

وہ چار صفتیں جو دنیا کی ساری دولتوں سے بڑھ کر دولت ہیں، ان میں سب سے پہلی صفت ''امانت کی حفاظت'' کرنا، دوسری صفت ''بات کی سچائی''، تیسری صفت ''خوش اخلاقی'' اور چوتھی صفت یہ کہ ''جو لقمہ کھا رہے ہو اس کا پاک دامن ہونا'' کہ اس میں حرام کا شائبہ نہ ہو، یہ چار صفتیں بہت مختصر ہیں، لیکن اتنی جامع ہیں کہ سارا دین ان کے اندر سمٹ آیا ہے۔

پہلی صفت: امانت کی حفاظت

پہلی صفت بیان فرمائی کہ ''امانت کی حفاظت'' قرآن و حدیث کے ارشادات اس کی تاکید

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۱۸۴ تا ۲۰۶)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ٦٣٦٥

سے بھرے ہوئے ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلٰى أَهْلِهَا﴾(۱)

اور حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے امانت میں خیانت کرنے کو منافق کی خصلت قرار دیا ہے، فرمایا کہ تین باتیں جس کے اندر پائی جائیں وہ پکا منافق ہے، ان میں سے ایک ہے ''وعدہ خلافی'' اور دوسرے ''امانت میں خیانت'' اور تیسرے ''جھوٹ بولنا'' ان تین چیزوں کو آپ نے نفاق کی علامت قرار دیا، مسلمان کا کام نہیں کہ وہ یہ تین کام کرے، بہرحال! ''امانت'' وہ چیز ہے جس کی رعایت سے مسلمان مسلمان بنتا ہے۔

نبوت سے پہلے آپ ﷺ کے مشہور اوصاف

نبی کریم ﷺ کی ایک اہم صفت جو عطاء نبوت سے پہلے سے لوگوں میں معروف تھی، وہ صادق اور امین ہونا تھی، یعنی سچائی اور امانت داری۔ بڑے سے بڑا دشمن بھی اپنی امانت حضورِ اقدس ﷺ کے پاس رکھوانے کے لئے تیار تھا، یہاں تک کہ جب آپ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرما رہے تھے، اس وقت لوگوں کی امانتیں آپ کے پاس رکھی ہوئی تھیں، ان امانتوں کو ان کے مالکوں تک پہنچانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، یہ آپ کا خاص وصف تھا، جو کافروں میں بھی معروف اور مشہور تھا۔ لہٰذا حضورِ اقدس ﷺ کے اُمتی ہونے کے ناطے ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ''امانت'' کا خصوصی خیال رکھے۔

امانت کا وسیع مفہوم

لیکن امانت کا مطلب عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی آدمی ہمارے پاس پیسے یا کوئی چیز لاکر رکھوادے، ہم اس کو صندوقچی میں بند کر کے رکھ دیں، اور جب وہ طلب کرے تو اس کو واپس کر دیں، اور خیانت یہ ہے کہ اس کو کھا جائیں۔ چونکہ جان بوجھ کر اس قسم کی خیانت الحمدللہ سرزد نہیں ہوتی، اس لئے ہم مطمئن ہیں کہ ہم امانت دار ہیں، اور ہم امانت کی حفاظت کر رہے ہیں۔ لیکن امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے، بیشمار چیزیں اس کے اندر داخل ہیں، جس کی پوری تفصیل ایک بیان میں عرض کی تھی، وہ بیان چھپ چکا ہے۔

(۱) النساء: ۵۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''(مسلمانو!) یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ''

دوسری صفت: بات کی سچائی

دوسری صفت جو اس حدیث میں بیان فرمائی وہ ہے ''صدقِ حدیث'' بات کی سچائی، یعنی آدمی جھوٹ نہ بولے، غلط بیانی نہ کرے۔ دیکھئے! ایک تو کھلا جھوٹ ہوتا ہے، جس کو ہر ایک جھوٹ سمجھتا ہے، اور دوسرا ہوتا ہے پوشیدہ قسم کا جھوٹ، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جس شخص کو دین کا اور جھوٹ سے بچنے کا تھوڑا بہت دھیان ہے، وہ عام طور پر کھلے جھوٹ سے تو پرہیز کرتا ہے، اور اگر اس کا کسی دینی حلقے سے تعلق ہے تو وہ کھلا جھوٹ بولتے ہوئے ڈرے گا، لیکن جھوٹ کی کچھ شکلیں ایسی ہیں جو ہمارے معاشرے میں سرایت کرگئی ہیں، اور ان کے جھوٹ ہونے اور گناہ ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا، مثلاً یہ کہ ایک آدمی کی بات دوسرے کو نقل کرنے میں بے احتیاطی اور لاپرواہی برتی جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل بات تو کچھ تھی، لیکن آگے نقل ہوتے ہوتے اس کا حلیہ ایسا بگڑا کہ اصل بات سے کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہی، اور غلط بات پھیل گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ نقل کرتے وقت یہ احتیاط نہیں کی کہ جو بات جس طرح کہی جارہی ہے، وہ بات اسی طرح یاد رکھوں، اور اسی طرح آگے نقل کردوں، بلکہ سنا کچھ، اور سمجھا کچھ، اور پھر اس میں اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر آگے چلتا کردیا، اب اس کو جھوٹ بھی نہیں سمجھا جاتا۔

بات کیا سے کیا بن جاتی ہے

میرے پاس تقریباً پانچ دس جگہوں سے خطوط آئے، اور یہ لکھا کہ ایک صاحب اپنی تقریروں میں آپ کی طرف منسوب کرکے یہ مسئلہ بیان کررہے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ٹیپ ریکارڈر پر قرآن کریم سننا گانے سننے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اب میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ میں نے کبھی یہ مسئلہ بیان کیا ہو، جب میں نے اس میں غور کیا کہ یہ بات کہاں سے چلی ہے تو اندازہ ہوا کہ ایک مرتبہ ایک مجلس کے اندر میں نے وعظ کیا۔ اس مجلس میں سے ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ اگر ٹیپ ریکارڈر پر قرآن کریم کی تلاوت سن رہے ہوں، سجدہ تلاوت آجائے تو سجدہ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ میں نے یہ جواب دیا تھا کہ وہ تلاوت جو ٹیپ ریکارڈر میں ہوتی ہے، وہ حقیقی تلاوت کے حکم میں نہیں ہوتی، لہٰذا اس کے سننے سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔ اب چونکہ میں نے یہ کہہ دیا کہ ٹیپ ریکارڈر کی تلاوت حقیقی تلاوت کے برابر نہیں، تو یہاں سے انہوں نے یہ سمجھا کہ پھر وہ تلاوت حرام اور ناجائز ہے، اور اس کو اپنی طرف سے آگے بڑھادیا کہ وہ تلاوت گانے سننے سے بدتر ہے، اور یہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولا، بلکہ بے احتیاطی اور لاپرواہی سے اپنے خیالات کو اس میں داخل کردیا۔

میری طرف منسوب ایک خواب

ابھی چند روز پہلے جناب بھائی کلیم صاحب مجھے یہ بتا رہے تھے کہ جن علاقوں میں زلزلہ آیا ہوا ہے، وہاں میری طرف منسوب ہو کر یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ اس نے ایک خواب دیکھا ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ رمضان المبارک کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے زلزلے کو ہلکا کر دیا، اور عید کے بعد اس سے بڑا زلزلہ آئے گا۔ اب میرے پاس ٹیلیفون آرہے ہیں کہ کیا آپ نے یہ خواب دیکھا ہے؟ خدا جانے یہ بات کہاں سے نکلی، اور کس طرح چلتی کر دی۔ پہلی بات کا تو کچھ سراغ لگ گیا تھا، اس کا تو کوئی سراغ بھی نہیں ملا کہ کہاں سے نکلی ہو گی۔

نقل کرنے میں احتیاط کریں

غرض یہ کہ بات کو آگے نقل کرنے میں احتیاط ختم ہو چکی ہے، شریعت اور دین نے جتنا اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ آدمی کے منہ سے کوئی بات غلط نہ نکلے، آج اتنی ہی بے احتیاطی ہو رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں فتنے اور فساد پھیل رہے ہیں۔ افواہیں پھیل رہی ہیں۔ یا تو بات آگے نقل ہی مت کرو، اور اگر بات آگے نقل کرنی ہے تو خدا کے لئے اپنی جانوں پر رحم کھاؤ، اور جو بات دوسروں تک پہنچانی ہے اس کو صحیح صحیح یاد کرو کہ کیا کہا گیا، پھر آگے پہنچاؤ۔

ایک محدث کی احتیاط

علامہ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الکفایہ" میں ایک محدث کا واقعہ لکھا ہے کہ جب وہ ایک حدیث سنایا کرتے تھے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ حدیث روایت کرنے والے حدیث روایت کرتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں، حَدَّثَنَا فُلَانٌ قال: حَدَّثَنَا فُلَانٌ قال: حَدَّثَنَا فُلَانٌ

حَدَّثَنَا کے معنی ہیں مجھے فلاں نے یہ حدیث سنائی۔ بہر حال! وہ محدث ایک حدیث کو اپنے استاد کی طرف منسوب کر کے سناتے تو یوں کہتے:

"حَدَّثَنَا فُلَانٌ قال: ثنا فلان"

پورا لفظ "حَدَّثَنَا" کے بجائے "ثنا" کہتے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ لفظ پورا "حَدَّثَنَا" کیوں نہیں پڑھتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب میں استاد کے درس میں پہنچا تو استاد نے درس شروع کر دیا تھا، اور میرے آنے سے پہلے "حد" کا لفظ کہہ چکے تھے، اور میں نے "حد" کا لفظ ان کی زبان سے نہیں سنا، بلکہ صرف "ثنا" سنا، لہٰذا اب اگر میں آگے روایت کرتے ہوئے پورا لفظ

"حَدَّثَنَا" کہوں گا تو جھوٹ ہو جائے گا، اس لئے میں صرف "ثنا" کہتا ہوں۔ اس احتیاط کے ساتھ یہ احادیث ہم تک پہنچی ہیں، ان حضرات نے آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو محفوظ کرنے میں اتنی احتیاط کی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور احتیاط

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں نے حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، آپ نے خود رائی کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"جب تک تمہارے "ضابطے" کے بڑے موجود ہوں تو ان سے مشورہ کرو، جب وہ نہ رہیں تو برابر کے لوگوں سے مشورہ کرو، اور جب وہ بھی نہ رہیں تو چھوٹوں سے مشورہ کرو، بغیر مشورہ کے کوئی کام مت کرو"

پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"ضابطے کے بڑے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں کون بڑا ہے؟ اور کون چھوٹا ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے، اس لئے کہ حقیقت میں بڑائی اور چھوٹائی تقویٰ کی وجہ سے ہے اور اللہ کی اطاعت کی بنیاد پر ہے، لیکن "ضابطے" میں ہم دیکھتے ہیں کہ "باپ" بیٹے سے بڑا ہے، استاد شاگرد سے بڑا ہے، شیخ مرید سے بڑا ہے، یہ سب "ضابطے" کے بڑے ہیں۔ لیکن حقیقت میں کون بڑا ہے، اللہ ہی جانتا ہے"

حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ حضرت والا یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ جب تک "بڑے" موجود ہوں، بڑوں سے مشورہ کرو، لیکن چونکہ دماغ میں وہ ترازو لگا ہوا ہے کہ کوئی بات خلاف واقعہ نہ نکلے، اس ترازو نے صرف "بڑا" نہیں کہنے دیا، بلکہ یہ کہلوایا کہ "ضابطے کے بڑے" تاکہ بات نفس الامر کے خلاف نہ ہو۔

غفلت اور لاپرواہی بڑی بلا ہے

جب دل میں فکر پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ صحیح لفظ دل میں ڈال دیتے ہیں کہ انسان اس وقت یہ لفظ استعمال کرے، سب سے بڑی "بلا" غفلت ہے، بے پرواہی ہے، اس بات سے غفلت کہ میرے منہ سے کیا لفظ نکل رہا ہے، بس جو چاہے الم غلم نکل جائے، کوئی پرواہ نہیں، اس "بلا" نے ہمیں "صدقِ حدیث" سے دور کر دیا ہے، "بات کی سچائی" یہ ہے کہ جو لفظ منہ سے نکلے وہ تُلا ہوا نکلے، وہ سو فیصد صحیح ہو، اس میں اتنا مبالغہ نہ ہو کہ وہ جھوٹ کی حد تک پہنچ جائے، تھوڑا بہت مبالغہ تو محاورۃً آدمی

بول دیتا ہے، لیکن ایسا مبالغہ جو جھوٹ کی حد تک پہنچ جائے، یہ "صدقِ حدیث" کے خلاف ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جب زبان سے کوئی لفظ نکال رہے ہو تو ذرا دھیان سے نکالو۔

اگر آپ کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہو تو

اور اس کا بہترین معیار میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا تھا، اور الحمدللہ دل میں اُتر گیا، وہ یہ کہ جب کوئی کلمہ زبان سے کہو، یا قلم سے لکھو تو سوچ لو کہ یہ بات مجھے کسی عدالت میں ثابت کرنی ہے، آپ ذرا اس کا تجربہ کریں کہ اگر آپ کو یہ بتا دیا جائے کہ آج آپ ان دو گھنٹوں کے درمیان جو بات کریں گے وہ ریکارڈ ہو کر تھانے میں پیش ہوگی، اور اس کی بنیاد پر آپ کو گرفتار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا، پھر بتاؤ کہ ان دو گھنٹوں میں کس طرح گفتگو کرو گے؟ کیا اس وقت بھی بے سوچے بولتے چلے جاؤ گے، یا زبان پر کوئی قدغن لگے گی؟ اس وقت اگر تم سے کوئی بات کرنا چاہے گا تو تم کہو گے کہ ارے بھائی اس وقت تو میری ہر بات ریکارڈ ہو رہی ہے، اور اسی پر میری گرفتاری اور رہائی کا فیصلہ ہونا ہے، لہٰذا اس وقت مجھ سے ایسی فضول باتیں نہ کرو، نہ کرواؤ، اس وقت تمہارے منہ سے کیسے موتی کی طرح تُلے ہوئے الفاظ نکلیں گے۔

ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ارے بھائی! یہ ٹیپ ریکارڈر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان کے لئے لگا ہوا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾(۱)

اور اسی ٹیپ ریکارڈر کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا کہ تم سچ بول رہے تھے، یا جھوٹ بول رہے تھے، لہٰذا جب اس وقت بولنے میں احتیاط کرتے تو اب یہ سوچ کر احتیاط کرلو کہ ایک ایک لفظ جو منہ سے نکل رہا ہے آخرت میں اس کی جواب دہی ہونی ہے، لہٰذا سوچ سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے منہ سے بات نکالو، جن لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ہوتی ہے وہ بولنے میں بہت احتیاط کرتے ہیں، صرف ضروری بات ہی زبان سے نکالتے ہیں، ورنہ وہ خاموش رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں "امانت داری" بھی عطا فرمائیں، اور "صدقِ حدیث" بھی عطا فرمائیں کہ جو بات منہ سے نکلے، وہ سو فیصد درست ہو۔

---

(۱) ق: ۱۸

تیسری صفت: خوش اخلاقی

تیسری صفت جو اس حدیث میں بیان فرمائی وہ ہے:

((حُسْنُ خَلِیْقَةٍ))

''خوش اخلاقی''

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ''مؤمن خوش اخلاق ہوتا ہے''[1] بد اخلاق، کینہ پرور، لوگوں کے ساتھ درشت کھردرا معاملہ کرنے والا نہیں ہوتا، یہ ایک مسلمان کی شان نہیں، مسلمان تو دوسرے لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرتا ہے، سختی کا برتاؤ نہیں کرتا۔

خوش اخلاقی کیا چیز ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ''خوش اخلاقی'' کیا چیز ہے؟ اور کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ یہ طویل الذیل موضوع ہے، مختصر وقت میں بیان کرنا مشکل ہے، مختصر بات یہ ہے کہ خوش اخلاقی صرف اس کا نام نہیں کہ آپ نے ظاہری طور پر دوسرے سے مسکرا کر بات کر لی، یہ بھی بیشک خوش اخلاقی کا ایک حصہ ہے، لیکن اگر ظاہری طور پر تو آپ مسکرا کر بات کر رہے ہیں، اور دل میں بغض بھرا ہوا ہے، یہ تو خوش اخلاقی کا مصنوعی مظاہرہ ہوا، جس میں اخلاص نہ ہوا، بلکہ ایک بناوٹی کاروائی ہوئی، جو ایک مؤمن کے لئے زیبا نہیں۔

مغربی ممالک اور خوش اخلاقی

آج کل مغربی ممالک میں اس موضوع پر بہت کتابیں لکھی جا رہی ہیں کہ لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں؟ اور لوگوں کو کس طرح اپنی طرف مائل کریں؟ لوگ ایسی کتابوں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں، ان کتابوں میں یہ لکھتے ہیں کہ جب لوگوں سے ملو تو اس طرح ملو، جب باتیں کرو تو اس طرح باتیں کرو، اس طرح لوگوں کے ساتھ پیش آؤ، یہ خوش اخلاقی کا طریقہ ہے۔ لیکن اس خوش اخلاقی کا مطلب صرف یہ ہے کہ دوسرے کے دل کو اپنے حق میں کیسے مسخر کریں؟ دوسرے کے دل میں اپنی عظمت کیسے پیدا کریں؟ بس اس کے لئے خوش اخلاقی کے سارے طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں، وہ خوش اخلاقی جو ''دین اسلام'' کے اندر مطلوب ہے، اور جس کا نبی کریم ﷺ نے ذکر فرمایا، اس

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ماجاء في البخيل، رقم: ۱۸۸۷، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في حسن العشرة، رقم: ٤١٥٨، مسند أحمد، رقم: ٨٧٥٥

خوش اخلاقی کا مقصد دوسرے کو مسخر کرنا نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بحیثیت ایک مسلمان کے میرا فرض ہے کہ میں دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤں، لہٰذا دونوں مقصد میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اس لئے کہ وہاں جو خوش اخلاقی ہو رہی ہے، وہ لوگوں کو اپنا بنانے کے لئے ہو رہی ہے، اپنا گاہک بنانے کے لئے ہو رہی ہے، مارکیٹنگ کے لئے ہو رہی ہے، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو جو خوش اخلاقی مطلوب ہے، وہ خوش اخلاقی دوسروں کو مسخر کرنے کے لئے نہیں، بلکہ خود اپنے فائدے کے لئے ہے کہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملوں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ بھی ایک صدقہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو، تاکہ میرا اللہ راضی ہو جائے۔

تجارتی خوش اخلاقی

آج کل لوگ مغربی قوم کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ یہ بڑے خوش اخلاق ہیں، اور ان کی خوش اخلاقی کی تعریف کر کے بسا اوقات مسلمانوں اور اسلام کے مقابلے میں ان کی برتری دل میں آنے لگتی ہے۔ ٹھیک ہے، بعض لوگ حقیقی معنوں میں خوش اخلاق ہوتے ہوں گے، لیکن عام طور پر ان کی خوش اخلاقی تجارتی ہے، وہ مارکیٹنگ کی خوش اخلاقی ہے، ایک سیلز مین جو ایک دکان پر کھڑا ہوا ہے، وہ اگر اپنے گاہکوں سے مسکرا کر بات نہ کرے، اور خوش اخلاقی سے پیش نہ آئے تو کون اس کا سامان خریدنے آئے گا، وہ تو اپنی تجارت کی خاطر اور اپنے نفع کی خاطر لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے پر مجبور ہے، لیکن اگر آپ اس سے یہ کہہ دیں کہ تم میرے ساتھ بڑے خوش اخلاقی سے پیش آ رہے ہو، تو میرے لئے دس روپے کم کر دو، تو پھر وہ ساری خوش اخلاقی رخصت ہو جائے گی، اس لئے کہ وہ ساری خوش اخلاقی تو اس لئے ہو رہی ہے کہ میں اس سے زیادہ سے زیادہ پیسے کھینچ لوں، اور اپنا سامان اس کو فروخت کروں، یہ کیا خوش اخلاقی ہوئی؟ خوش اخلاقی وہ ہے جو انسان کے دل سے اُمڈے اور جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے ہو، جس کا مقصد آخرت کی فلاح ہو، دنیا کے اندر اس کا صلہ مطلوب نہ ہو، یہ ہے ''خوش اخلاقی''

خوش اخلاقی کیسے پیدا ہو گی؟

یہ خوش اخلاقی کیسے پیدا ہو گی؟ یہ سارا ''تصوف اور سلوک'' درحقیقت اسی خوش اخلاقی کو پیدا کرنے کا علم ہے، لوگ بزرگوں کی صحبت میں جو جاتے ہیں، وہ درحقیقت اسی خوش اخلاقی کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے جاتے ہیں، اس کا ایک پورا نظام ہے، جس کو اس وقت پوری تفصیل سے بیان کرنا

تو ممکن نہیں، لیکن میرے نزدیک خوش اخلاقی کی جو کلید ہے، وہ اس وقت عرض کر دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

خوش اخلاقی کی بنیادی کنجی اگر حاصل ہوگئی تو خوش اخلاقی حاصل ہوگئی، وہ ہے ''تواضع'' یہ ساری خوش اخلاقی کی بنیاد ہے، اگر تواضع پیدا ہوگئی تو اب ''متواضع'' آدمی بد اخلاق نہیں ہوسکتا، اس لئے بد اخلاقی جب بھی ہوگی اس میں تکبر شامل ہوگا، اور تواضع کا مطلب ہے ''اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنا'' اور دوسروں کو اپنے سے بڑا سمجھنا، اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا، اگر آدمی کے دل میں یہ بات آجائے کہ میں چھوٹا ہوں، باقی سب بڑے ہیں، اور بڑے ہونے سے مراد ''عمر'' اور ''علم'' میں بڑا ہونا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت میں اور تقویٰ میں نیکی میں سب مجھ سے بڑے ہیں، یا فی الحال بڑے ہیں، یا فی المآل ان کے بڑے ہونے کا احتمال ہے۔

تواضع پیدا کریں

لہٰذا دل میں اپنی کوئی بڑائی نہ ہو، بلکہ یہ سوچے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی عطا ہے، جب چاہیں واپس لے لیں، نہ میں اپنی ذات میں کوئی کمال رکھتا ہوں، نہ میرے پاس اپنی ذات میں کوئی خوبی ہے، اور دوسری مخلوق سب کو اللہ تعالیٰ نے بڑا نوازا ہوا ہے۔ یہ اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنا تواضع ہے، جب ایک شخص کے دل میں تواضع ہوگی، اور وہ یہ کہے گا کہ میں چھوٹا ہوں، یہ بڑا ہے، تو کیا ایسا شخص کسی بڑے کے ساتھ بد اخلاقی کرے گا؟ نہیں کرے گا، اس لئے کہ بد اخلاقی اس وقت ہوتی ہے جب دل میں اپنی بڑائی ہو، اور دوسروں کی تحقیر ہو کہ میں تو بڑا آدمی ہوں، میرے حقوق لوگوں پر ہیں، اور لوگوں پر واجب ہے کہ وہ میرا فلاں حق ادا کریں، اگر وہ میرا حق ادا نہیں کر رہے ہیں تو وہ غلطی کر رہے ہیں، لہٰذا میں ان کے ساتھ اچھے انداز میں پیش نہیں آؤں گا، ساری بد اخلاقی کی بنیاد اور جڑ یہ ہے۔

تواضع سے بلندی عطا ہوتی ہے

اگر تواضع پیدا ہو جائے تو پھر کوئی ''بد اخلاقی'' سرزد نہیں ہوگی، اس لئے میں کہتا ہوں کہ خوش اخلاقی کی کلید اور بنیاد تواضع ہے، اور بد اخلاقی کی بنیاد تکبر اور عجب ہے، اگر انسان اس تکبر اور عجب کا علاج کروا لے، اور تواضع پیدا کرنے کی تدبیر اختیار کر لے، اور کسی اللہ والے کی صحبت کے نتیجے میں یہ تواضع پیدا ہو جائے تو پھر انشاء اللہ بد اخلاقی قریب نہیں آئے گی۔ حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ))(۱)
یعنی جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

اپنی حقیقت پر غور کریں

لہٰذا تواضع اختیار کرنے کے لئے انسان کو پہلے تو اپنی حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ میں کیا ہوں، قرآن کریم نے دو لفظوں میں انسان کی حقیقت بیان کردی، فرمایا:
﴿مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ؕ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾(۲)
اگر انسان اس میں غور کرے تو سارا تکبر ختم ہو جائے گا، وہ یہ کہ کس چیز سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا؟ تمہاری اصل بنیاد کیا؟ وہ ایک نطفہ ہے، دوسری جگہ فرمایا:
﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ﴾(۳)
کیا ہم نے تمہیں ایک ذلیل اور گندے پانی سے پیدا نہیں کیا؟ یہ تمہاری اصل ہے، اگر انسان اپنی اس اصل میں غور کرے تو کبھی دماغ میں تکبر نہ آئے، اور پھر تو جب مرے گا تو اپنے پیارے اور اپنے محبت کرنے والے بھی تجھے گھر میں رکھنا گوارہ نہیں کریں گے، اس لئے کہ بدبو پیدا ہو جائے گی، اور سڑ جائے گا، لہٰذا تجھ کو لے جا کر قبر میں دفن کریں گے، وہ تیری ابتداء ہے، یہ تیری انتہاء ہے۔

"بیت الخلاء" دکانِ معرفت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی اگر تمہارے دل میں اپنی بڑائی آئے تو اس وقت یہ تصور کرلیا کرو کہ بیت الخلاء میں میری کیا پوزیشن ہوتی ہے، میری اس حالت کو کوئی دیکھ لے تو مجھ سے گھن کرے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے جسم پر کھال کا پردہ ڈال رکھا ہے، ورنہ ذرا سی کھال کہیں سے الگ کرو تو یہ نظر آئے گا کہ اندر نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے، کہیں خون ہے، کہیں پیپ ہے، کہیں پیشاب ہے، کہیں پاخانہ ہے، بس اس کھال کے پردے نے ان تمام نجاستوں کو چھپا رکھا ہے۔ یہ ہے تمہاری حقیقت۔ ویسے تو بڑا غرور ہے کہ میں ایسا ہوں، ویسا ہوں، یہ کردوں گا، وہ کردوں گا، ذرا سا دماغ کا اسکرو ڈھیلا ہو جائے تو سب ختم ہو جائے گا، پھر بھی کہتے ہو کہ میں بڑا ہوں، تو یہ شیطان تمہیں دھوکے میں ڈال رہا ہے، لہٰذا اپنی اصل پر غور کرو۔

---

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱۱۲۹۹ (۲) عبس: ۱۸، ۱۹ (۳) المرسلت: ۲۰

اپنے آپ کو خادم سمجھو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے کہ یہ سارا فساد اس بنیاد پر ہے کہ تم نے اپنے آپ کو مخدوم بنایا ہوا ہے، ارے اپنے آپ کو خادم سمجھو کہ میں خادم ہوں، میں چھوٹوں کا بھی خادم ہوں، بڑوں کا بھی خادم ہوں، البتہ خدمت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، اگر استاد اپنے شاگرد کو پڑھا رہا ہے، یہ بھی خدمت کرر ہا ہے، اس لئے استاذ کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو طالب علموں کا خادم سمجھے، کبھی تعلیم اور تلقین کے ذریعے خدمت ہوتی ہے، لہٰذا یہ سمجھو کہ میں اپنی بیوی بچوں کا بھی خادم ہوں، اپنے بہن بھائیوں کا بھی خادم ہوں، اپنے عزیز و اقارب کا بھی خادم ہوں، خادمیت اختیار کرو، پھر جب بھی کسی سے واسطہ پیش آئے تو یہ سمجھو کہ میں جس سے بات کرر ہا ہوں، میں اس کا خادم ہوں۔

منصب کے تقاضے پر عمل کرنا دوسری بات ہے

اگر کوئی بڑا ہو، صاحبِ اقتدار ہو، اس کے سامنے تو ہی کو سر جھکانا پڑتا ہے، اس کا حکم ماننا پڑتا ہے، اس کے سامنے سب تواضع کرنے لگتے ہیں، اور اس کے سامنے بولتی بند ہو جائے گی۔ لیکن وہ تواضع جو قابلِ تعریف اور قابلِ تحسین ہے، وہ یہ کہ اپنے برابر والوں کے ساتھ اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ تواضع سے پیش آئے، البتہ بعض اوقات کسی منصب کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے پر غصہ کرے، مثلاً ایک ملازم کام ٹھیک نہیں کرر ہا ہے، اب اس کی اصلاح کے لئے بعض اوقات غصہ بھی کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات سزا بھی دینی پڑ جاتی ہے، بعض اوقات استاد شاگرد کو سزا دیتا ہے، بعض اوقات باپ بیٹے کو سزا دیتا ہے۔ یہ سزا دینا بھی خدمت ہے۔ لیکن اس وقت آدمی یہ سوچے کہ میں اپنے فریضۂ منصبی کو ادا کرتے ہوئے یہ کام کرر ہا ہوں، اس وجہ سے یہ کام نہیں کرر ہا ہوں کہ میں بڑا ہوں، اور یہ مجھ سے چھوٹا ہے، اس لئے کہ کچھ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا مقام مجھ سے بہت اونچا ہو۔

خوبصورت مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک مثال دیا کرتے ہیں کہ اگر بادشاہ اپنے کسی غلام کو چوکیدار بنا کر کھڑا کر دے کہ تم دروازے پر کھڑے ہو جاؤ، اور صرف ان لوگوں کو اندر آنے دو جن کو اجازت ہو، اور دوسروں کو اندر مت آنے دینا، اب اگر کوئی شہزادہ بھی آئے گا تو چوکیدار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ شہزادے سے کہے کہ پہلے اپنی شناخت پیش کرو کہ تم کون ہو؟ پھر اندر آنے کی اجازت ہوگی۔ اگر وہ

زبردستی اندر داخل ہونا چاہے گا تو چوکیدار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اس کو روک دے۔ اب دیکھئے کہ چوکیدار شہزادے کو روک رہا ہے، اور بظاہر اس پر حکم چلا رہا ہے، لیکن بتاؤ ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟ جس وقت وہ چوکیدار شہزادے کو روک رہا ہوتا ہے، اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں یہ بات نہیں ہوتی کہ میں شہزادے سے افضل ہوں، یا میں بڑا ہوں، اور یہ چھوٹا ہے، بلکہ اس کے دل میں اس وقت بھی یہ بات ہوتی ہے کہ بڑا تو شہزادہ ہی ہے، لیکن میں فرضِ منصبی کی ادائیگی کی خاطر اس کو روکنے پر مجبور ہوں۔

استاذ، شیخ اور باپ کا ڈانٹنا

اسی طرح اگر کوئی استاذ کسی شاگرد کو ڈانٹ رہا ہے، یا کوئی شیخ مرید کو ڈانٹ رہا ہے، یا کوئی باپ بیٹے کو ڈانٹ رہا ہے، یا اس کو کسی کام سے روک رہا ہے، تو اس کو یہ تصور کرنا چاہئے کہ میں اپنا فرض منصبی ادا کر رہا ہوں، حقیقت میں شاید یہ اللہ کا بندہ مجھ سے درجات کے اعتبار سے آگے بڑھا ہوا ہو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ میں آنے والوں کے لئے بڑے بڑے اصول مقرر فرمائے تھے، جب کوئی شخص ان اصولوں کی خلاف ورزی کرتا تو اس کی ڈانٹ ڈپٹ ہوتی۔ ان سب کے باوجود حضرت والا فرماتے ہیں کہ الحمد للہ میں جب کبھی کسی کو ڈانٹتا ہوں تو دل میں یہ تصور کر لیتا ہوں کہ میں چوکیدار ہوں، اور یہ شہزادہ ہے، میرا چونکہ فرضِ منصبی ہے، اس لئے ڈانٹ رہا ہوں، ورنہ حقیقت میں یہ مجھ سے افضل ہے۔ دوسرا یہ کہ جس وقت ڈانٹ رہا ہوتا ہوں، اس وقت دل میں یہ بھی کہہ رہا ہوتا ہوں کہ یا اللہ! جس طرح میں اس سے مؤاخذہ کر رہا ہوں، میرا آخرت میں اس طرح مؤاخذہ نہ فرمایئے گا۔ بتایئے! جو شخص اپنے سے چھوٹے کے بارے میں دل میں یہ تصور بٹھا رہا ہو کہ یہ شہزادہ ہے، میں چوکیدار ہوں، اس کے دل میں تکبر کہاں سے آئے گا، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں بھی ایسی تواضع پیدا فرما دے۔

تواضع بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے

یہ تواضع صحبت سے حاصل ہوتی ہے، متواضعین کی صحبت اختیار کرے گا، تو اضع آئے گی، متکبروں کی صحبت اختیار کرے گا تو تکبر آئے گا۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے صفتِ تواضع سے نوازا ہے، ان کی صحبت اختیار کرے، اور اپنی حقیقت پر غور کرتا رہے، اور یہ سمجھے کہ آخرت میں جو کچھ ملنے والا ہے

وہ تنی ہوئی گردنوں کو نہیں ملے گا، بلکہ جھکی ہوئی گردنوں کو ملنے والا ہے، شکستگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو، فنائیت کا مظاہرہ کرنے والوں کو، اپنی بڑائی دل میں نہ لانے والوں کو ملنے والا ہے۔

جنت مسکینوں کا گھر ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ جنت اور جہنم کے درمیان مناظرہ ہوا کہ کون افضل ہے؟ جہنم اس بات پر فخر کرنے لگی کہ میں متکبروں کا گھر ہوں، جابروں کا گھر ہوں، یعنی میرے اندر والے بڑے بڑے متکبرین ہیں، کوئی بادشاہ ہے، کوئی جابر ہے، کوئی وزیر ہے، کوئی فرعون ہے، میں ان کا گھر ہوں، اور جنت کہتی ہے کہ میں مسکینوں کا گھر ہوں، ''مسکین'' اس کو کہتے ہیں جس کی طبیعت میں عاجزی ہو، مسکنت ہو، اسی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ))(۱)

اے اللہ! مسکینی کی حالت میں مجھے زندہ رکھیے، اور مسکینی کی حالت میں مجھے موت دیجیے، اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرمائیے۔ تو جنت یہ کہہ رہی ہے کہ مسکینوں کا گھر ہوں، بہر حال! مسکنت اور عاجزی اور فروتنی انسان کو جنت میں لے جاتی ہیں۔ تکبر اور گھمنڈ اور بڑائی انسان کو جہنم میں لے جانے والی ہیں۔ لہٰذا اپنے اندر تواضع پیدا کرنے کی فکر کرلو، اور اگر یہ پیدا ہوگئی تو پھر خوش خلقی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔

چوتھی صفت: لقمہ کا پاک ہونا

چوتھی صفت حضور اقدس ﷺ نے یہ بیان فرمائی:

((عِفَّةٌ فِيْ طُعْمَةٍ))

''تمہارا لقمہ پاک اور حلال ہونا چاہیے''

''عفت'' کے لفظ سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ جو چیز صریح گناہ اور حرام ہے، اس سے بچنا ہی ہے، لیکن جہاں حرام کا شبہ ہو، اس شبہ والی چیز سے بھی بچنا ضروری ہے، اور مشتبہ چیز بھی اپنے پیٹ میں نہ لے جاؤ، حتی الامکان اس کی کوشش کرو۔ بعض اوقات ایک چیز ''فتویٰ'' کی رو سے حلال تو ہوتی ہے، لیکن مشکوک ہوتی ہے، اور مشکوک ہونے کی صورت میں اگر وہ چیز حقیقت میں بھی حرام ہوئی تو چاہے اس کے کھانے کا گناہ آپ کو نہ ہو، اس لئے کہ فتویٰ کے رو سے وہ حلال تھی، لیکن چونکہ وہ چیز

(۱) سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء أن فقراء المهاجرين يدخلون الجنة، رقم: ۲۲۷۵، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب مجالسة الفقراء، رقم: ٤١١٦

نفس الامر میں حرام تھی، اس لئے اس چیز کے برے اثرات اخلاق پر ضرور پڑتے ہیں۔

حرام کی ظلمت اور نحوست

ہم لوگوں کی تو حس خراب ہوگئی ہے، اس لئے حرام کھالیں، یا مشکوک کھالیں، کچھ پتہ نہیں چلتا، سب چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن جن کو اللہ تعالیٰ حس عطا فرماتے ہیں، ان کو پتہ چلتا ہے کہ حلال اور حرام میں کیا فرق ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایک دعوت میں چلا گیا، اور پہلے سے پتہ نہیں تھا کہ اس شخص کی آمدنی حرام ہے، ناواقفیت میں چلا گیا کہ وہ مسلمان ہے، آمدنی حلال ہوگی، اس لئے کچھ کھالیا، اور جب پتہ چلا تو فوراً کھانا چھوڑ کر کھڑا ہوگیا، لیکن وہ ایک دو لقمے جو نادانی میں کھالیے اس کی ظلمت قلب میں ایک مہینے تک محسوس ہوتی رہی، وہ ظلمت یہ تھی کہ بار بار دل میں گناہوں کے خیالات آتے رہے کہ یہ گناہ کرلوں، فلاں گناہ کرلوں، حالانکہ فتویٰ کی رو سے وہ حلال تھا، اس لئے کہ پتہ نہیں تھا۔

حلال کھانے کی نورانیت

ذرا غور کریں کہ ہم لوگ کس شمار و قطار میں ہیں، ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس میں نور ہے، اور کس میں ظلمت ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ دیوبند میں ایک گھسیارے تھے، جو گھاس کاٹ کر اس کو فروخت کر کے زندگی بسر کرتے تھے، اس میں سے دو پیسے بچا کر دارالعلوم دیوبند کے بڑے بڑے اساتذہ کی دعوت کیا کرتے تھے، اور اس دعوت میں خشکہ اور دال پکاتے تھے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مجھے مہینوں سے اس اللہ کے بندے کی دعوت کا انتظار رہتا تھا کہ کب یہ دعوت کریں گے، اس لئے کہ جس دن ان کی دعوت کھالیتا ہوں، مہینوں تک اس کا نور اپنے قلب میں محسوس کرتا ہوں۔

بہر حال! اگر کھانے میں پاکدامنی حاصل کرنی ہے، اس کیلئے مشکوک غذاؤں سے بھی حتی الامکان پرہیز کرنا ہوگا، اللہ تعالیٰ مجھے بھی آپ سب کو بھی ان چاروں صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ”اسلام اور ہماری زندگی“ انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطباتِ وتحریرات

جلد ۷

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲-۳ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
فون ۰۱ ۳۲۷۲۲

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعۂ خطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاقِ سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعۂ خطبات وتحریرات

جلد ۱۰

روزمرہ کی سُنتیں اور اعمال

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

★ [illegible] دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی

فون [illegible] فیکس [illegible] فون [illegible] فون [illegible]